جون 2021 قیمت 15 ₹

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

ماہنامہ اُردو دُنیا

نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قلمکاروں سے چند معروضات

ماہنامہ 'اردو دنیا' علمی اور ادبی مجلہ ہے جس میں ادبیات، سماجیات، اقتصادیات، تہذیب و ثقافت، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس و ٹکنالوجی، طب و فلسفہ، فنون لطیفہ، نفسیات، زبان کی زمینی صورت حال، عالمی ادبیات اور دیگر موضوعات پر مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ یہ خالص علمی اور ادبی نوعیت کا رسالہ ہے۔ اس میں مذہبی مباحث اور متنازعہ فیہ مسائل پر مضامین کی اشاعت کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ رسالہ صرف 100 صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس رسالے میں پوری اردو دنیا کے دانشوروں، ادیبوں اور قلمکاروں کی تحریریں اشاعت کے لیے موصول ہوتی ہیں۔ بہت سے مضامین اشاعت کے لیے منظور کر لیے جاتے ہیں لیکن بہت سی تحریریں اشاعت سے محروم رہ جاتی ہیں۔ بہ کثرت مضامین موصول ہونے کی وجہ سے ادارے کو بہت سی دقتوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے قلمکاروں سے گذارش ہے کہ اپنی تحریریں بھیجتے وقت مندرجہ ذیل امور کا بطور خاص لحاظ رکھیں۔

- مضمون غیر مطبوعہ ہو۔ کسی اخبار/ مجلے میں ارسال نہ کیا گیا ہو اور نہ ہی اپنی یا کسی مرتب کردہ کتاب میں شامل ہو۔
- مضمون ادارے کے مزاج، معیار اور پالیسی کے منافی نہ ہو۔
- مضمون ان پیج پروگرام میں ہو اور 2500 (پچیس سو) الفاظ سے کم اور 4000 الفاظ سے زیادہ نہ ہو۔
- مضمون میں اعداد و شمار رومن میں لکھیں اور مضمون کے آخر میں حوالے/حواشی (کتب اور مضامین) کا اندراج ضرور کریں۔
- اچھوتے، نئے اور اہم موضوعات پر بھیجے ہوئے مضامین ترجیحی طور پر شائع کیے جائیں گے اور عمومی نوعیت کے مضامین کی اشاعت موصول ہونے کی ترتیب کے لحاظ سے کی جائے گی۔
- ایسے موضوعات یا شخصیات پر مضامین کی اشاعت ممکن نہیں جن پر بہ کثرت کتابیں یا مقالے شائع ہو چکے ہوں۔ ایسے موضوعات/شخصیات پر مضامین بھیجتے وقت چند سطروں میں نئے نکات اور نئے زاویے کی نشاندہی لازمی ہوگی۔
- جن مضامین میں زبان و بیان کی خامیاں اور حقائق، حوالے املا جملہ کی غلطیاں ہوں گی انھیں کسی بھی صورت میں اشاعت کے لیے منظور نہیں کیا جائے گا۔
- مضمون میں اشعار اور اقتباس کی صحت کا التزام اور ضرورت سے زیادہ اشعار اور اقتباسات سے پرہیز لازمی ہے۔
- شخصیات پر مضمون بھیجتے وقت متعلقہ فنکار کی تصویریں، کتابوں کا عکس اور دیگر ضروری معلومات ضرور ارسال کریں۔
- شہر یا ادارے پر لکھتے ہوئے اس سے متعلق تصاویر اور دیگر اہم معلومات لازمی بھیجیں۔
- درج ذیل تصدیق نامہ موصول ہوئے بغیر مضمون کی اشاعت پر غور نہیں کیا جائے گا:

''میرا مضمون غیر مطبوعہ ہے۔ کسی اخبار/ مجلہ/ اپنی یا مرتب کردہ کتاب میں شامل نہیں ہے۔ یہ کسی کتاب/مضمون کا سرقہ یا چربہ نہیں ہے۔ اگر کچھ نقص پایا گیا تو اس کے لیے میں خود ذمہ دار ہوں گا/ ہوں گی۔''

- کسی دوسری زبان کا ترجمہ اصل متن کے ساتھ ارسال کریں اور مصنف کا اجازت نامہ بھی منسلک کریں۔
- مضمون میں پہلے یا آخری صفحے پر مضمون نگار کا نام، مکمل پتہ مع پن کوڈ (انگلش میں) اور موبائل نمبر ضروری ہے۔

مضمون کی حتمی منظوری ایڈیٹوریل ریویو کے بعد ہی دی جائے گی۔

قلمکار حضرات اخلاقی ضوابط Ethical guidelines کا پورا خیال رکھیں۔

—ادارہ

ماہنامہ
اُردو دُنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:23، شمارہ:06، جون 2021

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد
مشیر : حقانی القاسمی
معاونین: عبدالرشید اعظمی، یوسف رامپوری، نایاب حسن

ناشر اور طابع
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارتِ تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

مطبع:
ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت-/15روپے سالانہ -/150روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002
فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ
ہماری بات 4

خطوط
ربط و التفات قارئین کے خطوط 5

زبان و تعلیم
اسکولی تعلیم کی تشکیل نو ریاض احمد 9

تدریسی واکتسابی عمل میں
روحانی ذہانت کا کردار محمد اکبر القادری 12

نقد و نگاہ
دردو غم کا شاعر: وکیل اختر سید احمد قادری 15
مراثی انیس میں ڈرامائی عناصر جاوید حسن 17
مفتی صدرالدین خاں آزردہ سید عینین علی حق 19
علم ماحولیات اور اردو کا
ثانوی نصاب تعلیم آصف مبین 21
تلوک چند محروم اور ادب اطفال محمد محسن رضا 24
اردو غزل میں فوبیا ای۔ آر۔ محمد عادل 27
کرتار سنگھ دگل کی اردو ڈراما نگاری اقبال احمد 31

اکیسویں صدی اور اردو
اکیسویں صدی میں
ہندوستان کا اردو افسانہ شہاب ظفر اعظمی 34
اکیسویں صدی میں
اردو غزل کے امکانات مشتاق احمد گنائی 38

صدی شخصیت
ایک قدم کا فاصلہ وسیم فرحت 42

شمس و قمر
حسان الہند: مولانا احمد رضا خان محمد یٰسین 46

یاد رفتگاں
بلند پایہ ہستی: اختر بستوی غلام حسین 48
قمر اقبال عظیم راہی 52
اردو ادب و صحافت کے امام:
افتخار امام صدیقی شمع اختر کاظمی 56

سلسلہ صحافت
ماسٹر رام چندر اور فوائد الناظرین رئیس فاطمہ 59

خصوصی گفتگو
پروفیسر عبدالمنان طرزی سے انٹرویو منصور خوشتر 62

سماجیات
ہندوستان میں روزگار کے مواقع محمد پرویز عالم 66

نیا آسماں نئے ستارے
محی الدین قادری زور بہ حیثیت شاعر زنیرہ 69

دیگر زبانوں سے
پردیسی عبیر السید
مترجم: محمد قطب الدین 71

کتابوں کی دنیا
تعارف وتبصرہ ادارہ 75

خبر نامہ
اردو دنیا کی خبریں ادارہ 81

ہماری بات

کہتے ہیں کہ ادب زندگی کے ہر رخ کا آئینہ دار ہوتا ہے اور زندگی کے ہر ایک شعبے کی اصلاح کا فریضہ بھی انجام دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اچھے قلمکار و تخلیق کار انسانی زندگی اور سماج کے مختلف پہلوؤں کو اپنی تخلیقات و نگارشات کا موضوع بناتے ہیں اور ان گوشوں کی جستجو کرتے ہیں جن کے ذریعے زندگی اور سماج کی موثر طور پر خدمت یا اصلاح کا فریضہ انجام دیا جاسکے۔ یہ ایک فطری امر ہے کہ وقت کے ساتھ مسائل بھی بڑھتے ہیں اور ان کی نوعیتیں بھی بدلتی رہتی ہیں، جن کی کوکھ سے نئے نئے موضوعات جنم لیتے ہیں۔ بہترین ادیب و تخلیق کار وہ ہوتے ہیں جو بدلتے مسائل اور تغیرات زمانہ کی آہٹوں کو محسوس کرتے ہیں اور ان کے نتائج کو پہلے سے ہی بھانپ کر ان سے عوام الناس کو آگاہ کر دیتے ہیں۔ چند قدیم یا گھسے پٹے موضوعات تک اپنے آپ کو محدود کرنے سے نہ سماج کے مطالبات پورے ہوتے ہیں اور نہ ہی ادب کے تقاضوں کی کماحقہ تکمیل ہو پاتی ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ حالات ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے، تبدیلیوں کا وقوع دنیا کی ریت و روایت کا حصہ ہے۔ لیکن یہ بھی ایک امر مصدقہ ہے کہ نہ تو ہر تبدیلی ضرر رساں ہوتی ہے اور نہ ہی ہر تبدیلی مفید ثابت ہوتی ہے۔ بعض تبدیلیاں انسان کے حق میں خوشیاں لے کر آتی ہیں اور بعض تبدیلیاں بڑے خطرات کا پیش خیمہ بن کر آتی ہیں۔ ہمارا عہد مادیت اور صارفیت کا عہد ہے جس میں زندگی کی ہر سطح پر تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں لیکن موجودہ عہد میں رونما ہونے والی جن تبدیلیوں نے انسانیت کو خطرات سے دو چار کیا ہے، ان میں ایک کا تعلق ماحولیات ہے۔ تحقیقات اس بات کو ثابت کر چکی ہیں کہ ہمارے زمانے میں ماحولیات میں بڑے پیمانہ پر چھیڑ چھاڑ ہوئی ہے۔ مختلف النوع آلودگیوں و کثافتوں نے پورے ماحول کو اپنی آغوش میں لے لیا ہے۔ فضائی آلودگی، آبی آلودگی، صوتی آلودگی، ضیائی آلودگی کے علاوہ دیگر قسم کی پراگندگیاں بھی انسانی زندگی کے لیے خطرناک ثابت ہو رہی ہیں۔ فیکٹریاں بڑھتی جا رہی ہیں، جن سے گرین ہاؤس گیسوں کے اخراج کا دائرہ پھیل رہا ہے اور گلوبل وارمنگ کا خطرہ بڑھتا جا رہا ہے۔ درجۂ حرارت کے اضافے کے باعث نہ صرف انسان بلکہ تمام حیوانات اور نباتات کا وجود بھی خطرے میں پڑ گیا ہے۔ ان مضر گیسوں کی وجہ سے آکسیجن کی کمی واقع ہوتی جا رہی ہے اور انسان صاف ہوا اور پانی سے محروم ہوتا جا رہا ہے۔ رپورٹوں کے مطابق ہر سال صاف ہوا اور پانی کی کمی کے سبب ان گنت جانوں کا ضیاع ہو جاتا ہے۔ قدرتی ماحول میں بے جا مداخلت کے سبب نئے نئے امراض معرض وجود میں آرہے ہیں جس سے کہ پوری انسانی زندگی داؤ پر لگ گئی ہے۔

تشویش کی بات یہ بھی ہے کہ مادیت اور صارفیت کے اس دور میں بڑھتے آلات و وسائل نے احساسات و مروت جیسے جذبات کو کچل کر رکھ دیا ہے اور انسان کو ایسی مشینوں میں تبدیل کر دیا ہے جو احساسات و جذبات سے عاری ہیں۔ وقت کا تقاضہ ہے کہ ادیب و قلمکار اور تخلیق کار حضرات اپنے عہد کے اس مسئلے کی سنگینی کو محسوس کریں، اس دور کے انسانوں کے حسّی اور جذباتی عناصر میں تحریک پیدا کریں اور ماحولیات کے حوالے سے بہترین ادب خلق کریں۔ فی الوقت یہ ادب کی بھی خدمت ہوگی اور انسانیت کی بھی۔ یہ نہایت حیرت کی بات ہے کہ ہمارے ادیبوں و قلمکاروں کی آج بھی بڑی تعداد وہ ہے جو پرانے موضوعات کے خول سے باہر آنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اسی لیے ماحولیات پر ہنوز بہت کم لکھا جا رہا ہے۔ ہمارے افسانوی و شعری ذخیرے میں جو کچھ بھی اس موضوع کے حوالے سے موجود ہے، وہ موضوع کی اہمیت کے پیش نظر قطعاً کافی نہیں ہے۔ ماحولیات سے جڑے ہوئے بہت سے پہلوؤں پر آج زیادہ سے زیادہ لکھنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ ماحولیات کا بھی تحفظ کیا جاسکے اور زندگی کو بھی بڑے خطرات سے بچایا جاسکے۔

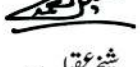

شیخ عقیل احمد

ماھنامہ 'اردو دنیا' میں 'آپ کی بات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا قطعی مقصد نہیں ہوتا کہ محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکہ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے کہ ان میں مشمولہ مضامین کے تعلق سے نئے نکات، مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گذارش ہے کہ ماھنامہ 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقو ں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان سے ہمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

اپریل 2021 اردو دنیا کی ظاہری صورت دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کی اندرونی ساخت کیا ہو گی۔ جس کا اتنا اچھا سرورق ہو تو اندرونی صفحات کس طرح کا لبادہ لیے ہوں گے۔ ماہ اپریل کا سرورق خوبصورت، دلکش اور دیدہ زیب ہے اور اس پر خمسۂ کیفی پنڈت برجموہن دتا تریہ کیفی کے اردو زبان پر شعر نے اسے ایسی رونق بخشی کہ سرورق کو چار چاند لگ گئے۔ اللہ اسے نظر بد سے بچائے ہندوستان کا یہ واحد رسالہ ہے جو جہازی سائز اور مکمل ملٹی کلر آرٹ پیپر پر شائع ہوتا ہے۔

سرورق کا یہ شعر ملاحظہ کریں۔

اردو ہے جس کا نام ہماری زبان ہے — دنیا کی ہر زبان سے پیاری زبان ہے
وہ وصف کون سا ہے جو اس میں ملا نہیں — سائنس اس میں یا ادب و فلسفہ نہیں
ایسی زباں میں وجہ شرف کی یہی ہے بات — اردو کو ہر زبان سے ہے ربط والتفات

کیفی کے ان اشعار کو پڑھ کر اور فہرست (مشمولات) کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے یہ شعر ان پر صادق آتے ہیں۔ اداریہ، ہماری بات، خطوط (ربط والتفات، نقد و نگاہ، زبان اور زمینی صورت حال، تعلیم، ترسیل، تحقیق، گنج ہائے گرانمایہ، ہندی ادبیات، نفسیات، خصوصی گفتگو، نگر نگر اردو، نیا آسمان نئے ستارے، سیاحت، کمپیوٹر، کتابوں کی دنیا، خبر نامہ۔

ان عناوین کے تحت بڑے ہی دلچسپ معلومات آفریں، تحقیقی و تنقیدی مضامین ہیں۔ جس کے ذریعے ہر قاری کو اپنی پسند کا مواد مل جاتا ہے۔

ہماری بات میں مدیر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے اردو کے حوالے سے جو بات کہی ہے وہ صد فی صد صحیح ہے ملاحظہ کیجیے ''اردو کے حوالے سے موجودہ صورت حال جہاں اردو والوں کو خوشی کا موقع فراہم کرتی ہے۔ وہیں ان کے اوپر کچھ ذمے داریوں کو بھی عائد کر تی ہے۔ مثلاً یہ کہ اب جبکہ اردو سارے عالم میں پڑھی بولی اور لکھی جا رہی ہے تو زبان کے معیار کے تئیں سنجیدہ ہونے کی ضرورت ہے اگر اردو والے اچھی زبان لکھیں گے، بولیں گے تو وہی زبان ہر جگہ رواج پائے گی۔''

عقیل صاحب نے وقت کے ساتھ یہ بات کہی اور آج اس کی شدید ضرورت ہے اردو والے ہی اردو کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ جاں نثار اختر نے کہا تھا۔

یہ علم کا سودا یہ رسالے یہ کتابیں — اک شخص کی یادوں کو بھلانے کے لیے ہیں

یہ کتابیں یہ رسالے ہی ہمیں یاد دلاتے رہیں گے اور یادوں کو بھلائیں نہیں تازہ کریں گے اور کہیں گے کہ۔

بارود کے بدلے ہاتھوں میں آجائے کتاب تو اچھا ہو
اے کاش ہماری آنکھوں کا اکیسواں خواب تو اچھا ہو

بہر حال اکیسویں صدی میں اردو دنیا اور روشن ہوگی۔ ایک جلی حروف میں صفحہ 8 پر ہے ''صرف شخصیات نہیں صنفیات پر بھی مضامین ارسال کریں'' یہ ایک جملہ اپنے اندر بے پناہ معنی رکھتا ہے صنف قسم قسم کی ہوتی ہے اور اس پر قلم چل جائے تو ہر صنف ہمارے سامنے ہوگی اور اردو کا حلقہ شخصیت تک نہیں بلکہ صنفیات کا وسیع حلقہ ہوگا۔

نقد و نگاہ کے 5 مضامین میں ہمیں وہ سب کچھ مل جاتا ہے جو ایک ادب نواز قاری کو چاہیے۔ علامہ اقبال کے دو ممدوح، تاجور نجیب آبادی کی اقبال شناسی، حسرت موہانی

کی تذکرہ نگاری، اسلوب احمد انصاری بہ حیثیت غالب اور اقبال شناس، تقریباً تمام مضامین میں غالب اور اقبال ہی ملیں گے اس سے مدیر کی مدبرانہ صلاحیتوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ زبان اور زمینی صورتحال کے تحت، سوال وجواب کی شکل میں صالحہ صدیقی نے ہر سوال کا تکنیکی اور فنی جواب لکھا اور بڑے ہی سلجھے ہوئے انداز میں اس کو پیش کیا۔ ڈاکٹر امام اعظم پی جی شعبہ اردو ایل این ایم یونیورسٹی کی پیش رفت پر اسی شعبے کی کا رکردگی کے ساتھ 1980 سے 2019 کے پی ایچ ڈی/ ڈی لٹ اسکالر کی فہرست دی۔ اگر وہ ڈی لٹ کو علحدہ کر دیتے تو عام آدمی کو سمجھنے میں سہولت ہوتی۔

ہندی ادبیات کے تحت تین مضامین ہیں۔ جو ہمیں ہندی ادب کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں اور اس سے ہندی ادب کا معیار بھی معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح ہندی والے بھی اگر اردو ادب کو پیش کریں تو سونے پر سہاگہ ہوگا۔ نفسیات پر غلام نبی مومن کا مضمون اردو میں نفسیات کی ترویج واشاعت میں سید اقبال امروہی کی خدمات خوب ہیں۔

نیا آسماں نئے ستارے کے عنوان سے اردو میں خواتین کے اولین سفر نامے عدیلہ جسیم کا معلوماتی مضمون ہے۔ مگر انھوں نے صغرا ہمایوں مرزا سے انصاف نہیں کیا۔ انھوں نے نثر میں بہت زیادہ کام کیا۔ اس سفر نامہ میں سیر بہار و بنگال، سیاحت جنوبی ہند کا ذکر نہیں۔ یہ حیدرآباد کی پہلی مسلم خاتون تھیں جنھیں بیرون ملک بھی شہرت حاصل رہی۔ انھوں نے اپنے والد کے نام پر صغدریہ گرلز ہائی اسکول قائم کیا، انہی کے نام سے ہمایوں نگر محلہ مہدی پٹنم کے قریب واقع ہے۔ یہ اسکول آج بھی چل رہا ہے اور گرلز اسکولوں میں معیاری اسکول کہلاتا ہے۔

مشاعروں کے فروغ میں الیکٹرانک میڈیا کا کردار، فرحان چودھری نے مختصر مگر اچھا تجزیہ کیا ہے۔ سیاحت میں رفعت مشتاق کا مضمون ٹھیک ہے۔ 2020 اور 2021 میں بین الاقوامی سیاحت پر کورونا کووڈ 19 لاک ڈاؤن کا اثر پڑا ہے۔ مضمون موجودہ حالات کی روشنی میں نہیں ہے۔

گلوبل دنیا الکٹرانک میڈیا اور کمپیوٹر میں ایم ایس، ایکسل میں فنکشن خوب ہے۔ اس کی معلومات والے کو کافی فائدہ ہوگا۔ تبصرہ وتعارف میں 5 کتابوں آثار الصنادید (جلد اول، دوم، سوم) تحقیق وتنقید کے تحت مضامین پر پروفیسر افضل الدین اقبال ایک جائزہ، آئینہ تنقید، عالم خیال میں (اردو کے مرحوم شعراء کے انٹرویوز، (انٹرویو) چلڈرنس فارم (ناولٹ) فکشن میں اور رسائل وجرائد میں ارمغان عالمی یوم اردو یادگار مجلے پر تبصرے شامل ہیں۔ اس کے بعد قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں، قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے ہونے والے پروگراموں کی روداد، اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں اور وفیات شامل ہیں۔

سو صفحات کا یہ رسالہ تقریباً 28 موضوعات کے ساتھ اردو دنیا کی خبروں کو سمیٹا ہوا ہے یہ رسالہ 23 سال سے پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ جس کے لیے مدیر اور ان کا اسٹاف قابل مبارکباد ہیں۔

ڈاکٹر م ق سلیم: شعبۂ اردو شاداں کالج، تلنگانہ

ماہنامہ اردو دنیا شمارہ مارچ 2021 مختلف ادبی شخصیات کی خوبصورت تصاویر کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ یہ شمارہ حسن انتخاب، حسن طباعت و کتابت کے ساتھ ساتھ معلومات سے بھرپور بصیرت افروز مضامین کا ایک نایاب تحفہ ہے۔ چمکتے ہوئے سورج کی طرح یہ بات عیاں ہے کہ قومی اردو کونسل کی جانب سے جو کام کیا جا رہا ہے اس کا فائدہ براہ راست قوم وملت کو ہو رہا ہے۔ ہر بار کی طرح اس بار کا اداریہ بھی ذہنی بیداری عطا کرتا

ہے۔ اداریہ انتہائی سلیس اور سنجیدگی سے بھرا ہے۔ محترم شیخ عقیل احمد نے اردو زبان اور سائنسی علوم پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اردو میں تدریس کے لیے سائنسی علوم کو اردو میں منتقل کرنا اس دور کی اہم ضرورت ہے۔ یہ بات واقعی قابل غور ہے اور اس کے متعلق اردو داں حضرات کو سنجیدہ ہونے کی ضرورت ہے۔ کور اسٹوری میں شامل سبھی مضامین بڑے ہی دلچسپ انداز میں قلمبند کیے گئے ہیں۔ ذکیہ مشہدی کا مضمون 'بچوں کا ادب سطح اول کے حوالے سے' کیا ہی دلچسپ اور معلومات سے بھرپور ہے۔ بچوں کا ادب تخلیق کرنے والے مصنفین کو بچوں کی نفسیات سے واقف ہونا وقت کا اہم تقاضا ہے۔ جب ہی ایک بہترین ادب پارہ وجود میں آسکتا ہے جو نہ صرف بچوں کی معلومات میں اضافہ کریں بلکہ بچوں کی دلچسپی کا بھی اس میں بھرپور خیال رکھا گیا ہو۔ یہ بات حقیقت پر مبنی ہے کہ آج کل بازار میں طرح طرح کی بچوں کے لیے کتابیں مہیا کی جاتی ہیں، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کتابوں میں فرقہ وارانہ فسادات کی بھیانک تصویریں پیش کی جا رہی ہے۔ مصنفہ نے بجا طور پر یہ تجویز پیش کی ہے کہ بچوں کے ادب میں ایسے الفاظ، ایسی کہانیاں اور ایسے قصے بیان نہ کیے جائیں جو کسی ذات، فرقے یا پیشہ ورانہ جماعت کی تضحیک کرتی ہوں۔ محمد یاسین گنائی کا مضمون 'جموں وکشمیر کی پہلی غزل گو شاعرہ' بہت ہی متفکرانہ اور محققانہ انداز میں لکھا گیا مضمون ہے۔ موصوف نے نہایت عرق ریزی سے جموں وکشمیر کی چھ سو سال کی تاریخ کا بھرپور جائزہ لیتے ہوئے یہاں کی آٹھ شاعرات کے حوالے سے مفصل بحث کی ہے۔ محمد یاسین نے للل دید حبہ خاتون، شہزادہ کلثوم، پران کشوری، برج کشوری اور زینب بی بی مجوب کے بارے میں محققانہ بحث کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جموں وکشمیر میں اردو کی پہلی غزل گو شاعرہ، نعت گو شاعرہ زینب بی بی مجوب ہی ہیں۔ اس مقالے نے تحقیق کی راہ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ یہ مضمون نہ صرف اردو کے علم دوست حضرات بلکہ تحقیق میں سرگرداں ریسرچ اسکالرز کے لیے بیش قیمتی معلومات کا خزانہ ہے۔ مصنف کی سب سے بڑی اہم خصوصیت یہ ہے کہ مضمون کے آخر میں حوالہ جات کی کتابوں اور دیگر ماخذات کی فہرست دی ہے۔ ذکر حنیف کیفی کے تحت لکھے گئے تینوں مضامین ایک سے بڑھ کر ایک ہیں جو نہ صرف ان کی شخصیات بلکہ ان کی علمی خدمات کے بارے میں کافی جانکاری فراہم کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس شمارے میں کوثر چاند پوری کی افسانہ نگاری، خواجہ حسن نظامی کی انفرادیت، ہرچرن چاولہ اور روف خیر صاحب کا مختار شمیم صاحب کو خراج عقیدت جیسے مضامین قابل تحسین ہے۔ کمپیوٹر کورس کے تحت بھی اردو زبان کو کمپیوٹر کی تعلیم سے مالا مال کر رہے ہیں یہ اردو کی بڑی خدمت ہے۔ آخری صفحات پر بولتی ہوئی تصویریں، خبرنامہ اور قومی کونسل کی سرگرمیوں سے روشناس کراتی ہیں۔

رئیس احمد شاہ: راہموپلوامہ، کشمیر

﷼ سرورق پر تصویروں کے ساتھ مختلف موزوں و مناسب موضوعات عنوانات دیے گئے ہیں۔ 'ہماری بات' میں مدیر نے اردو زبان اور سائنسی ادب اور سائنس پر مدیرانہ گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان سائنسی اور علمی مضامین ادا کرنے کی قدرت سے محروم ہے۔ لہٰذا دورِ حاضر میں اردو داں طبقے میں سائنسی شعور اور مسلمانوں میں سائنس کا جذبہ پیدا کرنا ہوگا۔

عبدالحق نے امیر خسرو کی مثنوی 'مطلع الانوار' کے ایک اہم مخطوطے کا تعارف و تعریف پیش کی ہے اور امیر خسرو کی تمام تخلیقات پر روشنی ڈالی ہے۔ ذکیہ مشہدی نے بچوں کا ادب سطح اوّل کے حوالے سے میں بچوں کے ادب کی افادیت، اہمیت و عظمت کو ظاہر کیا ہے تاکہ ادب اطفال سے دل لگائیں۔ علیم اشرف کا مضمون 'ڈاکٹر معین الحق بہ حیثیت مترجم تاریخ فیروز شاہی' تاریخ اردو ترجمہ کے حوالے سے عمدہ مضمون ہے۔ ضیاء الدین برنی کے نسخہ اور تدوین و تالیف سے بھی بحث کی گئی ہے۔ محمد مستمر نے 'اسماعیل میرٹھی کی مثنوی پن چکی کا جائزہ' تفصیل سے لیا ہے۔ امین احسن نے 'مجروح سلطانپوری کا ابتدائی ادبی سفر' میں مجروح کی زندگی اور ادبی خدمات کا احاطہ کیا ہے۔ کہتے ہیں مجروح کو موسیقی، آرٹ اور شاعری سے دیوانگی کی حد تک لگاؤ تھا۔ محمد یاسین گنائی کا 'جموں و کشمیر کی پہلی غزل گو شاعرہ' مضمون بھی اچھا ہے۔ قیوم بدر نے ساحر کی ساحرانہ شاعری پر فلمی نغموں کے حوالے سے اچھی گفتگو کی ہے۔ کوثر مظہری نے 'حنیف کیفی'، اظہر ابرار نے 'حنیف کیفی کی شاعری میں دردِ انسانیت' اور محمد اکرام نے 'حنیف کیفی کوائف و کیفیات' کے عنوان سے مضامین لکھے ہیں۔ ان تینوں مضامین میں تنقیدی، تحقیقی انداز سے حنیف کیفی کی ادبی خدمات اور فنی نکات فکری رموز پر بحث ملتی ہے۔ یہ مضامین حنیف کیفی شناسی میں مددگار ثابت ہوں گے۔ اسلم جمشید پوری نے 2020 کا فکشن اور فکشن تنقید میں افسانہ اور ناول اور 2020 کی فکشن تنقید، رسائل کے نمبر، سوشل میڈیا پر اردو فکشن پر تفصیل سے تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ آفاق ندیم خاں کا 'بچوں میں تحصیل زبان سے متعلق نفسیاتی نظریات' عمدہ ہے۔ رؤف خیر نے 'چراغ جاں کی مدھم لو کے شاعر مختار شمیم' میں ان کی زندگی، حیات اور ادبی و تنقیدی تخلیقی کارناموں کو اجاگر کیا ہے۔ عبدالغنی 'طنز و مزاح کا معتبر حوالہ زبیر الحسن غافل'، شاداب تبسم نے 'کوثر چاندی پوری کی افسانہ نگاری' میں افسانوں کا تعارف اور تجزیہ پیش کیا ہے۔ 'ہرچرن چاولہ بہ حیثیت افسانہ نگار' تسنیم فاطمہ نے لکھا ہے۔ ذیلی عنوانات متاثر کن ہیں، اداریہ، خطوط، نقد و نگاہ، صدی شخصیت، ذکر حنیف کیفی، جائزہ، زبان و تعلیم، خراج عقیدت، ماہ و انجم، نگر نگر اردو، خصوصی گفتگو، کتاب دریچہ، نیا آسماں نئے ستارے، یادیں باتیں، طب اور ادب، قلم، کمپیوٹر، کتابوں کی دنیا، خبرنامہ شامل ہیں۔ اردو دنیا کا ایک ایک شمارہ ایک نئی تازہ کتاب کی مانند ہے جس میں بھرپور تنقیدی و تحقیقی مشمولات مل جاتے ہیں۔ اردو طلبہ کے لیے مذکورہ شمارہ نعمت سے کم نہیں ہے۔

فروری کے شمارے میں شمس الرحمٰن فاروقی پر عظیم اقبال نے ان کی زندگی، تعلیم و تربیت اور ادبی خدمات پر بھرپور روشنی ڈالی ہے اور جدیدیت اور ترقی پسند تحریک کا تقابل پیش کیا ہے۔ محمد اقبال لون نے 'شمس الرحمٰن فاروقی کا نظریہ ناول کی شعریات کے تناظر میں' ناول کے تعلق سے فاروقی کے نظریے سے بحث کی ہے۔ توصیف بریلوی نے ناول 'قبض زماں: ایک ماحولیاتی قرأت' کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ ان کے علاوہ صغیر افراہیم 'سید اکبر علی ترمذی کی غالب پسندی'، فرحت نادری رضوی 'اجتبیٰ رضوی بہ حیثیت نظم نگار'، محمد محسن 'ناول میری یادوں کے چنار' غلام حسین 'پروفیسر احمر لاری'، محمد اختر 'آہ ظفر احمد صدیقی'، محمد اسلام خاں 'حنیف ترین'، محمد سمیع الدین 'بیجاپور کا شعر و ادب آزادی کے بعد'، بلال احمد وار 'ماحولیاتی سیاحت'، شاذیہ کمال 'کمال الدین کمال عظیم آبادی شخصیت اور شاعری'، جاوید احمد 'نذیر بنارسی کی شاعری میں عصری حسیت' وغیرہ مضامین بھی پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

جنوری کے شمارے کا ٹائٹل دیدہ زیب ہے، اس شمارے میں روبینہ، شکیل، محمد عرفان ملک، محمد نذیر احمد، نذیر فتح پوری، عبدالحفیظ، رئیسہ پروین، محبوب حسن، محبوب ثاقب، قمر جہاں، محمد شارب، صہیب عالم، جسیم الدین، محمد قاسم، آفتاب میں عالم اعظمی، عرفان رشید، شکیلہ، سید وجاہت مظہر، عبداللہ اسلم، ارشاد قمر، محمد اسرار عالم وغیرہ کے مضامین شامل ہیں۔ سارے مضامین لائق مطالعہ ہیں۔

﷼ **ڈاکٹر محمد ناظم علی**: مکان نمبر 17-7-335، برہمن واڑی، یاقوت پورہ، حیدرآباد

﷼ 'اردو دنیا' دسمبر 2020 نظر نواز ہوا۔ آپ کا 'اداریہ' ایک بار پھر ایک نئے زاویے سے اہم مسئلے کو بڑی خوبصورتی سے پیش کرتا ہے۔ اس بار آپ نے 'ہماری بات' میں اس اہم نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ''اب جامعات میں ان ہی موضوعات پر تحقیقی و تنقیدی مقالے لکھے جاتے ہیں جن پر بیشتر کام ہو چکا ہوتا ہے اور یہاں بھی صورت حال یہ ہے کہ بات 'حیات اور کارنامے' سے آگے نہیں بڑھتی۔'' یعنی اکثر مکھی پر مکھی مارنے کا کام ہوتا ہے اور اسی لیے اسے شخصیت اور فن کی حد تک محدود کر دیا گیا ہے اور خاص بات یہ ہے کہ ان ہی شخصیات پر کام ہوتا ہے جن پر کئی بار کام ہو چکا ہے۔ یعنی چبے چبائے نوالے دوبارہ چبائے جاتے ہیں۔ جامعات میں اردو تحقیق کی اس صورت حال کا آپ نے بالکل صحیح تجزیہ کیا ہے اور وقت کی نبض پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔ اس سلسلے میں بڑے پتے کی بات کہی ہے اور بہت صحیح مشورہ دیا ہے کہ ''خاص طور پر قصبات اور قریات میں بہت سی مقتدر ادبی ہستیاں ہیں جن پر ہماری نگاہ نہیں جاتی۔'' اس امر پر واقعی غور و فکر کرنے اور عملی طور پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

'نقد و نگاہ' کے تحت 'ادب میں اخلاقی اقدار کا تقاضا' اپنی نوعیت کا ایک اہم مضمون ہے جو ادب میں اخلاقی قدروں کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔ دراصل اخلاق تو ادب کی اساس ہے۔ اردو غزل کے حوالے سے ادب میں اخلاقی اقدار کی مختلف شعرا کے اشعار سے محمد کلیم ضیا نے اس اہم بات کو اجاگر کیا ہے۔ 'جہانِ غالب' کے تحت، 'غالب کی عظمت'، 'اس شکل سے گزری غالب'، اور 'غالب تاریخ کے دوراہے پر' ان عناوین کے تحت غالب کے موضوع کو آپ نے ایک الگ انداز میں پیش کیا ہے۔ پہلا مضمون مختصر مگر جامع انداز میں غالب کی حیات کو ان کے فن کی انفرادیت کے ساتھ نسرین بیگم نے پیش کیا ہے تو دوسرے مضمون میں ڈاکٹر صادق کے اس عنوان سے غالب کی پنشن کے مسئلے پر تحریر کردہ ڈرامہ 'جو دہلی میں بڑی کامیابی سے اسٹیج کیا تھا اس کا مکمل تجزیہ پرویز شہریار نے پیش کیا ہے۔ ثاقب عمران نے نثار احمد فاروقی کی کتاب 'تلاش غالب' میں اس عنوان سے شامل ایک اہم مضمون کا سیر حاصل جائزہ لیا ہے۔

'یادِ مظفر' کے تحت مناظر عاشق ہرگانوی نے ان سے ملاقاتوں کے حوالے سے اپنے تاثرات کے اظہار اور ان سے لیے گئے پرانے انٹرویو کے چند اہم اقتباسات کے ساتھ مضمون مکمل کیا ہے تو وہیں پی پی سریواستو رند نے مظفر حنفی سے کبھی شخصی ملاقات نہیں ہونے کے باوجود ان کی شاعری کے آئینہ میں اپنا گہرا تاثر پیش کیا ہے اور محسن جلگانوی نے مظفر حنفی کی جدید حسیت سے معمور شاعری اور ان کے منفرد لب و لہجے کا بھرپور تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ مرحوم مظفر حنفی سے میری ایک بار ان کی اورنگ آباد آمد پر خصوصی ملاقات ہوئی تھی۔ ان کی یاد کے ساتھ اس یادگار ملاقات کی یادیں تازہ ہو گئیں۔ 'اردو دنیا' نے مظفر حنفی پر غالباً سب سے پہلے خصوصی گوشہ شائع کر کے بھرپور خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

اس بار شاعری پر بڑی تعداد میں مضامین شامل ہیں۔ 'شخصیات' کے تحت جگر اور اُن کی عشقیہ شاعری اور راحت اندوری منفرد لہجے کا شاعر 'نئے آسمان نئے ستارے' کے تحت عابد پشاوری کی غزل گوئی اور 'نقد و نگاہ' کے طور پر مظہر امام کی نظم نگاری کا جائزہ سیر حاصل مضامین ہیں۔ عالمی مشاعرے کے ایک مقبول اور کامیاب شاعر مرحوم راحت اندوری کی مشاعروں کی شاعری سے ذرا ہٹ کر ان کے منفرد لہجے کی شاعری کو محمد نوشاد عالم نے بڑی عمدگی سے ان کے شعروں کے حوالے سے روشنی ڈالی ہے۔ ان کا یہ شعر۔

"میرے احباب کو جس وقت بھی فرصت ہوگی اور تو کچھ نہیں ہوگا مری غیبت ہوگی"

بہت پسند آیا جو ہمارے آج کے ماحول پر صادق آتا ہے۔ اس کے علاوہ فکشن کے موضوع پر رشید اختر ندوی کی ناول نگاری اور ممتاز و معروف ادیب اور ڈرامہ نگار محمد حسن کے ڈراموں کے مجموعے 'پیسہ اور پرچھائیں' پر اچھے مضامین ہیں۔ اربندو گھوش پر شیخ عقیل احمد کا ایک قابل ذکر مضمون ہے جو متاثر کرتا ہے۔ محترمہ سیدہ نسیم سلطانہ نے اردو زبان و ادب سے جڑے سوالات پر مشتمل مستقل انٹرویو کے کالم میں دوٹوک انداز میں بڑی جرأت کے ساتھ اپنے علاقے کے حوالے سے علمی، ادبی و تعلیمی صورت حال کا آئینہ دکھایا ہے لیکن آج کل ہر جگہ اسی صورت حال کا سامنا ہے جس کے لیے بقول محترمہ 'مقامی اور علاقائی زبانوں کا فروغ بے حد ضروری ہے'۔ 'ادبیات فارسی' کا گوشہ بھی قابل مطالعہ ہے۔ اس کے علاوہ مستقل کالم 'تبصرہ و تعارف'، 'خبر نامہ' اور 'اردو اور تعلیم' سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں' حسب سابق متوجہ کرتے ہیں۔ غرض 'اردو دنیا' کا یہ شمارہ اپنے قابل قدر مشمولات کے سبب پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

❖ **عظیم راہی**: کریم کالونی، روشن گیٹ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

پہلی تخلیق پہلا تاثر

نہ جانے کب کوئی آکر مری تکمیل کر جائے اسی امید پہ خود کو ادھورا چھوڑ جانا ہے

ایک قلمکار کی تکمیل اسی وقت ممکن ہے جب اس کی تخلیق کو علم و ادب کی محفل میں سراہا جائے اور آج کل نوجوان قلمکاروں کی پذیرائی خال خال ہی نظر آتی ہے۔ تاہم اس کام کی ذمے داری قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تحت شائع ہونے والا اردو زبان و ادب کا پاسبان اور عالمی شہرت یافتہ رسالہ 'اردو دنیا' بحسن خوبی انجام دے رہا ہے جس کے لیے ادارہ ہذا کے جملہ اراکین قابل تحسین اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔

میری تخلیقات اس سے قبل دیگر رسالوں اور کتابوں کا حصہ بنتی رہی ہیں، بایں ہمہ روز اول سے میری خواہش یہی رہی کہ میری تخلیق 'اردو دنیا' کی زینت بنے، ہمیشہ سے یہ اندیشہ رہا کہ ابھی میرا قلم شاید پختہ نہیں ہو پایا، لیکن باوجود اس کے جب کبھی اپنے اساتذہ کو کسی رسالے میں شائع شدہ اپنی کسی تحریر کی اطلاع دیا کرتا تو ہمیشہ وہ میری حوصلہ افزائی کرتے، جس سے مجھے ایک نیا حوصلہ ملتا اور اپنی تحریر کو مزید بہتر کرنے میں جی جان سے لگ جاتا اور یہ ان کی حوصلہ افزائی ہی کا نتیجہ ہے کہ میں نے ایک تخلیق کو اس امید کے ساتھ کہ اگر اردو دنیا نے اسے شائع کر دیا تو مجھے آئندہ کے لیے نہ صرف ایک نئی تحریک ملے گی بلکہ میری تحریر کو ایک سند مل جائے گی بذریعہ میل 'اردو دنیا' روانہ کر دیا۔ اب مضمون کی اشاعت کا بے صبری سے انتظار کرنے لگا اور پھر وہ دن بھی آ گیا جب میرا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔ پہلی اپریل کا دن تھا اور میرے فون کی گھنٹی بجی دیکھتا ہوں میرے ایک استاد کا فون ہے بصد احترام انھوں نے اطلاع دی کہ میرا مضمون 'دوارکا پرشاد افق لکھنوی کی شاعری' 'اردو دنیا' کے اپریل 2021 کے شمارے میں شائع ہوا ہے تو میری مسرت کی انتہا نہ رہی۔ میں نے اس خوشی میں دو کاپیاں خرید لیں۔ بیشک اردو دنیا اور اس جیسے معیاری رسالوں کا مطالعہ نہ صرف ہماری معلومات میں اضافے کا باعث ہے بلکہ ایک کامیاب اور معیاری تخلیق کے لیے ان رسالوں کا مطالعہ از حد ضروری ہے۔ یہ رسالے ہماری ادبی میراث ہیں جن سے نہ جانے کتنے ہی لوگوں کی پہچان بنی ہے اور آئندہ بنے گی اور اگر یہ رسالے نہ ہوں تو ہم جیسے کتنے ہی قلم کار گمنامی اور تاریکی میں رہ جائیں گویا یہ رسالے ہمیں اس تاریکی سے باہر نکال کر علم و ادب کی روشن اور عظیم شاہراہ پر گامزن کرنے میں معاون و مددگار ہیں۔

❖ **آصف پرویز**: ریسرچ اسکالر، عالیہ یونیورسٹی، کولکاتا، مغربی بنگال

قلم کاروں سے گزارش

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے لیے موصول ہونے والے مضامین کی تعداد اتنی زیادہ ہوگئی ہے کہ ہر مضمون کی اشاعت نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی ہر مضمون نگار سے رابطہ آسان ہے۔ اسی لیے دسمبر 2018 تک موصول ہونے والے مضامین کی اشاعت پر غور نہیں کیا جائے گا۔ اب مضامین کی اشاعت یا عدم اشاعت کی اطلاع مضمون موصول ہونے کے ایک ماہ کے اندر ہی دے دی جائے گی۔ اگر اطلاع نہ ملے تو آپ مندرجہ ذیل نمبر 011-49539009 پر اپنے مضمون کے بارے میں استفسار کر سکتے ہیں۔

ایک اور گذارش یہ ہے کہ میر، غالب، اقبال یا ان ادبا پر جن کے حوالے سے کافی کتابیں اور مقالے لکھے جا چکے ہیں، مضامین بھیجنے سے اولاً تو گریز کریں اور اگر ان شخصیات پر مضامین بھیجیں بھی تو مضمون میں نئے زاویے یا نئی جہت کی نشان دہی ضرور فرمائیں، اس کے بغیر اس نوع کے مضامین شائع نہیں کیے جائیں گے۔ اردو زبان کی زمینی صورت حال، تاریخ، آثار قدیمہ، سماجیات، اقتصادیات، تہذیب و ثقافت، علاقائی ادبی صورت حال، ہندوستان کی علاقائی زبانوں کا ادب، عالمی ادبیات، تکنیکی اور سائنسی ترقیات اور گمنام، فراموش کردہ قلم کاروں، رسائل کے خصوصی شماروں اور نئے موضوعات کے حوالے سے لکھے گئے مضامین ترجیحی طور پر شائع کیے جائیں گے۔

اسکولی تعلیم کی تشکیل نو

ریاض احمد

اسکولی تعلیم ہی ایک شہری کے مستقبل کی راہیں طے کرتی ہے کہ وہ آگے چل کر پیشہ ورانہ تعلیم وتربیت حاصل کرے گا، اعلی تعلیم حاصل کرے گا یا زندگی کے کسی اور شعبے میں مہارت حاصل کرے گا۔ ظاہر ہے سبھی طرح کی تعلیم وتربیت کی بنیاد اسکولی تعلیم ہی فراہم کرتی ہے۔ اس لیے آزادی سے قبل بھی ہمارے ملک میں اسکولی تعلیم ہی سب سے بڑا تعلیمی مدعا ومسئلہ رہا اور آزادی کے بعد بھی اس شعبے پر خصوصی توجہ دی گئی۔ خواہ وہ سیکنڈری ایجوکیشن کمیشن ہو یا پھر کوٹھاری کمیشن اور بعد کی کمیٹیوں، پالیسیوں میں بھی اسکولی تعلیم ہی سب سے بڑا حل طلب مسئلہ رہا ہے۔ چنانچہ پہلی بار کوٹھاری کمیشن نے اسکولی تعلیم کے ڈھانچے کو تبدیل کرنے کی سفارش کی تھی اور بعد میں اس میں چھوٹی بڑی تبدیلیاں اور سدھار ہوتے رہے۔ اکیسویں صدی کی تعلیمی ضرورتوں کے تحت ایک بار پھر اسکولی تعلیم میں یکسر تبدیلی کی پالیسی اپنائی گئی ہے۔ 2020 کی قومی تعلیمی پالیسی میں بچپن کی تعلیم سے بارہویں درجے تک کی تعلیم کی تشکیل نو کی پالیسی تیار کی گئی ہے۔ اس پالیسی کے تحت ابتدائی بچپن کی نگہداشت اور تعلیم بھی اب حکومت کے فرائض میں شامل ہوگئی ہے۔

اسکولی تعلیم میں بچپن کی نگہداشت اور تعلیم ECCE کے تحت بنیادی خواندگی اور عدد شماری کے مدعے اور مسائل کے بعد ابتدائی و ثانوی تعلیم کی سطح پر داخلہ طلبا کا اسکول میں قائم رہنا اور ترک تعلیم کے مدعے اور مسائل بہت ہی اہم ہیں۔ اسکولی تعلیم کے ان گمبھیر مسائل کی طرف پہلے بھی خصوصی توجہ دی گئی تھی اور قومی تعلیمی پالیسی 2020 نے بھی ان کے حل کے لیے معین مدتی (Time Bound) ہدف مقرر کیا ہے۔ National Sample Survey Office کے 2017-18 کے اعداد وشمار بتاتے ہیں کہ 6-17 سال کی عمر گروپ کے تقریبا 3.22 کروڑ بچے اب بھی اسکول سے باہر ہیں (NEP2020)۔ حالانکہ پچھلی دہائی کے مقابلے ترک تعلیم Dropouts کی شرح کم ہوئی ہے اور Gross Enrolment Ratio(GER) میں اضافہ ہوا ہے۔ پالیسی کی رپورٹ بتاتی ہے کہ ہمارے یہاں اسکولی سطح پر GER کا تناسب بالترتیب درجہ 8-6 کا 90.9 فیصد، درجہ 10-9 کا 79.3 فیصد اور درجہ 12-11 کا 56.5 فیصد تھا۔ ظاہر ہے کہ ان ہی اعداد وشمار پر NSSO نے اپنی رپورٹ دی ہوگی۔ واضح رہے کہ سروشکشا ابھیان (جو اب Samagra Shiksha کے نام سے جانا جاتا ہے) اور 2009 Right to Education Act کے نفاذ کی وجہ سے حالیہ برسوں میں ابتدائی تعلیم میں داخلہ اور قیام دونوں کی شرح میں امید افزا اضافہ ہوا ہے۔ تاہم دیہی علاقوں میں اور شہری غریب علاقوں میں اب بھی یہ مسئلہ برقرار ہے۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 ان سبھی 3.22 کروڑ بچوں کو اور آنے والے وقت میں اس عمر تک پہنچنے والے تمام بچوں کو جلد سے جلد اسکولوں سے جوڑنا چاہتی ہے۔ چنانچہ پالیسی 2020 نے صد فیصد GER کے لیے 2030 تک کا ہدف مقرر کیا ہے۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 نے ہمہ گیر اسکولی تعلیم کو یقینی بنانے کے لیے قومی سطح پر ٹھوس اقدامات کا اعلان کیا ہے تاکہ سبھی بچے درجہ اول سے بارہویں جماعت تک ہمہ جہت معیاری اسکولی تعلیم بشمول ووکیشنل ایجوکیشن کے حاصل کرسکیں۔

ترک تعلیم کا مسئلہ ہو یا اسکول میں قائم رہنے کا یا پھر GER میں اضافے کا پہلے بھی ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاہم پری پرائمری سے بارہویں جماعت تک کی ہمہ گیر تعلیم مہیا کرانے کے لیے 2020 کی تعلیمی پالیسی میں نہایت اہم قدم اٹھائے گئے ہیں۔ اس کے مطابق اسکولوں کے انفراسٹرکچر میں خاطر خواہ اضافہ، اسکولوں کو Upgrade کرنا، نئے اسکولوں کی تعمیر، موجودہ اسکولوں کی تعمیر نو، کتب خانے، لیبارٹری (تجربہ گاہ) باسٹل بالخصوص طالبات کے لیے اور تعلیم و تدریس کے دیگر وسائل کو بہتر بنانا اور بروقت مہیا کرانا شامل ہے۔ ہمہ گیر اسکولی تعلیم کے حصول میں ایک بہت بڑا مسئلہ مہاجر مزدوروں اور محروم طبقات کے ان بچوں کا ہے جو 2020 میں Covid-19 اور دیگر مسائل کی وجہ سے ترک تعلیم کا شکار ہوئے۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 نے ان سبھی طلبا کو پھر سے اسکولوں سے جوڑنے اور انھیں قائم رکھنے کی کے لیے وسائل تلاش کرنے اور موقع فراہم کرنے کی ہدایات دی ہے۔

قومی تعلیمی پالیسی 2020 اپنے ان اہداف کی حصولیابی کے لیے جن ہدایات پر کاربند ہوگی ان میں بچوں کا داخلہ اور قیام، ترک تعلیم کیے ہوئے بچوں کی اسکولوں میں دوبارہ داخلہ اور پری پرائمری سے بارہویں جماعت تک کے تمام طلبا کو ایسی سہولیتیں مہیا کرانا شامل ہے تاکہ وہ اپنی ثانوی تعلیم بآسانی مکمل کرسکیں۔ ان امور کی حوصلہ افزائی کے لیے تربیت یافتہ اساتذہ کے علاوہ سماجی کونسلر، سوشل ورکر، والدین اور سرپرستوں کو بھی اس نیک کام میں ہاتھ بٹانا ہوگا۔ تربیت یافتہ اور سند یافتہ سوشل ورکر، دیگر تنظیموں، محکموں، سماجی انصاف اور Empowerment کے اداروں سے جڑے ہوئے افراد اور دوسرے سرکاری محکمے اس عمر گروپ کے معذور بچوں کو مذکورہ سطح کی تعلیم مہیا کرانے میں مدد کریں گے۔ اس کے لیے اسکولوں، ریاستی حکومتوں اور دیگر اداروں کو ایک Innovative Mechanism بنا کر اس مقررہ ہدف کے حصول میں مدد کرنا ہوگا۔ سماجی معاشی پسماندہ ومحروم طبقات (SEDG's) کے بچوں اور قبائلی و دیہی اور اقلیتی زبانوں سے تعلق رکھنے والے بچوں کے لیے ان کی ضرورت کے مطابق اساتذہ کو مقرر

کیا جائے گا۔ SEDG's کے سبھی بچوں کو تعلیمی سہولیات مہیا کرانے کے لیے رسمی و غیر رسمی دونوں طرح کی طرز تعلیم کا سہارا لیا جائے گا بالخصوص NIOS کے ذریعے چلائے جارہے فاصلاتی طرز تعلیم پروگراموں کی مدد لے کر۔ قومی تعلیمی پالیسی اپنے مذکورہ اہداف کی تکمیل کے لیے رضا کار تنظیموں، رضا کاروں، اسکول کے سابق طلبا، صحت مند معمر افراد و شہری اور کمیونٹی کے دیگر باوقار سرکاری، نیم سرکاری اور غیر سرکاری ملازمین کی بھی مدد لے گی۔

آزادی کے بعد ضرورت کے مطابق کئی بار اسکولی تعلیم کے ڈھانچے میں تبدیلی کی گئی۔ ایجوکیشن کمیشن کی سفارشات کو مستقبل کی ضرورتوں کے مطابق کوٹھاری کمیشن نے تجدید کرتے ہوئے کئی نئی سفارشات پیش کیں۔ بالخصوص ملک کی سبھی ریاستوں میں اسکولی تعلیم کو ایک ڈھانچے میں منظم کرنے کے لیے 3+2+10 کے نظام تعلیم کی سفارش کی گئی۔ آگے آنے والی پالیسیوں نے بھی ملک کی ضرورت کے پیش نظر اسے جاری رکھا اور اب بھی یہ نظام نافذ العمل ہے۔ تاہم اکیسویں صدی کی تعلیمی ضرورتوں کے مدنظر قومی تعلیمی پالیسی 2020 نے آئندہ کے اسکولی تعلیم کے ڈھانچے کو تبدیل کردیا ہے۔ اب پالیسی کے مطابق پری اسکول ایجوکیشن کو بھی لازمی قرار دیتے ہوئے 4+3+3+5 کا چار مراحل پر مبنی اسکولی تعلیم کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اس نئے ڈھانچے کے مطابق اسکولی تعلیم کی تکمیل چار مرحلوں میں اس طرح ہوگی۔ اسکولی تعلیم کا پہلا مرحلہ 3 سے 8 سال کے بچوں کے لیے ہوگا جو دو ذیلی سطحوں، بنیادی سطح یعنی آنگن باڑی/ پری اسکول پر مبنی تین سالہ اسکولی تعلیمی تیاری کے لیے ہوگا جبکہ اس مرحلے کی دوسری سطح جماعت اول اور دوم پر مبنی ہے۔ اسکولی تعلیم کا دوسرا مرحلہ تیسری جماعت سے پانچویں جماعت پر مبنی 8 سے 11 سال کے بچوں کے لیے مختص ہوگا۔ اسکولی تعلیم کا تیسرا مرحلہ ثانوی یا مڈل سطح کہلائے گا جو درجہ 8,7,6 پر مبنی گیارہ سے چودہ سال کے عمر گروپ کے بچوں کے لیے مخصوص ہوگا۔ اسکولی تعلیم کا آخری مرحلہ چار سالوں پر مشتمل ہوگا جو 14 سے 18 سال کے نوبالغان کے لیے مختص ہوگا اور اسے دو زمروں، نویں و دسویں (9-10) کلاس اور گیارہویں و بارہویں (11-12) کلاس میں تقسیم کیا جائے گا۔ یہ مرحلہ درجہ 9 سے 12 تک کے لیے موجودہ ثانوی اور اعلیٰ ثانوی تعلیم کی جگہ لے گا۔

اسکولی تعلیم کا آغاز بنیادی سطح پر ابتدائی بچپن کی نگہداشت و تعلیم ECCE سے ہوگا جبکہ Preparatory سطح کی شروعات چند نصابی و ہم نصابی سرگرمیوں مثلاً کھیل، تلاش و جستجو وغیرہ کی تدریسی سرگرمیوں پر مبنی نصابی کتابوں کے ذریعے کیا جائے گا تاکہ بچوں میں کمرہ جماعت کی اکتساب Classroom learning مثلاً پڑھنا، لکھنا، بولنا، جسمانی تعلیم، ڈرائنگ، ابتدائی زبان، ابتدائی سائنس اور ریاضی کی آموزشی عادتوں کا فروغ ہو سکے۔ تین سالہ مڈل سطح کی تعلیم بھی Preparatory سطح کی ہی توسیعی شکل ہوگی۔ لہٰذا اس سطح پر جن اکتسابی سرگرمیوں کو شامل کیا جائے گا ان میں زبان، ریاضی، سائنس، آرٹس، سوشل سائنس اور ہیومنٹیز کے مضامین شامل ہوں گے۔ ساری اکتسابی سرگرمیاں تجرباتی و ہم نصابی سرگرمیوں سے جڑی ہوں گی۔ اس سطح پر مختلف مضامین کے خصوصی اساتذہ کا انتظام بھی ہوگا۔ ثانوی سطح کی تعلیم چار سالہ کثیر رخی مطالعات کی اساس پر Subject Oriented تدریسی سرگرمیوں پر مبنی ہوگی۔ اس سطح پر طلبا کو خصوصی مضامین/ اختیاری مضامین کے انتخاب کا حق حاصل ہوگا۔ بالخصوص درجہ 11 اور 12 میں طلبا کو ضرورت اور خواہش کے مطابق مضامین منتخب کرنے کی چھوٹ ہوگی۔

> **قومی تعلیمی پالیسی اپنے مذکورہ اہداف کی تکمیل کے لیے رضاکار تنظیموں، رضاکاروں، اسکول کے سابق طلبا، صحت مند معمر افراد و شہری اور کمیونٹی کے دیگر باوقار سرکاری، نیم سرکاری اور غیر سرکاری ملازمین کی بھی مدد لے گی۔**

قومی تعلیمی پالیسی 2020 طلبا کی ہمہ جہت ترقی پر زور دیتی ہے۔ اس کے مطابق سبھی اسکولی سطح پر نہ صرف ذہنی نشوونما پر زور دیا جائے بلکہ طلبا کی اقداری اور اخلاقی نشوونما کا بھی خیال رکھا جائے تاکہ ان کی ہمہ جہت ترقی اس طرح ہو کہ اکیسویں صدی کی انفرادی ضروریات کے ساتھ اجتماعی ضروریات کو بھی پورا کرسکیں۔ نصابی اور تدریسی سرگرمیوں کو غور و فکر، تلاش و جستجو اور تنقیدی تفہیم کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ طلبا کی تمام سطحی نشوونما اس طرح کی جائے تاکہ وہ تعلیم اور مہارت کے ہدف کو حاصل کرسکیں۔ تعلیمی پالیسی نے مذکورہ سبھی سطحوں کے لیے NCERT کے ذریعے نصابی خاکہ تیار کرنے اور طریقہ کار وضع کرنے کی ہدایت دی ہے جو تکمیل کے مرحلے میں ہے۔ تعلیمی پالیسی نصابی بوجھ کو کم کرکے لازمی اکتساب اور تحقیقی، تنقیدی اور تخلیقی تفہیم کو بڑھاوا دینا چاہتی ہے۔ چنانچہ اسکولی تعلیم کا آئندہ نصاب تخلیقی سوچ، تلاش و جستجو، مباحثے اور تجزیے کی بنیاد پر ہمہ جہت ترقی پر مبنی ہوگا۔ نصابی مواد اس طرح پیش کیے جائیں گے کہ طلبا کو گفت و شنید، سوالات، ہمت افزائی، تخلیقیت اور امداد باہمی اور تجدیدی و تجرباتی سرگرمیوں کا زیادہ سے زیادہ موقع فراہم ہو۔

قومی تعلیمی پالیسی اسکولی سطح کی تعلیم کے لیے تجرباتی اکتساب پر زور دیتی ہے۔ اس لیے اسکولی تعلیم کی سبھی سطحوں کو تدریس میں تجرباتی اکتساب کی طرز رسائی کے استعمال کی ہدایت کے ساتھ ساتھ کرکے سیکھنے، آرٹ مربوط اور کھیل مربوط طریقہ تدریس پر بھی زور دیتی ہے۔ پالیسی آرٹ مربوط تدریسی طرز رسائی کو سبھی سطحوں اور مضامین کے درمیان ایک مضبوط کڑی مانتی ہے۔ کمرہ جماعت کی تدریس میں تجرباتی اکتساب کو آرٹ مربوط تعلیم کے ذریعے انبساطی کمرہ جماعت Joyful Class Learning میں تبدیل کرنا چاہتی ہے۔ اس لیے آرٹ اور کلچر کو تعلیم کے لیے ایک ربط اور پل تصور کرتی ہے۔ کھیل مربوط نصاب کی ترویج کے لیے Cross Curricular pedagogical Approach کے ذریعے طلبا میں ان مہارتوں کو فروغ دینا چاہتی ہے جن کے ذریعے امداد باہمی، Self Initiative، خود رہنمائی، Self Descipline، ٹیم ورک، ذمے دارانہ صلاحیت اور شہری اقدار کو فروغ ہو تاکہ طلبا ہر سطح پر تندرست و توانا رہیں اور 'Fit India Movement' کا خواب شرمندہ تعبیر ہو سکے۔

رواں نصابی ڈھانچے میں مضامین کے انتخاب کی پابندیوں کے برخلاف قومی تعلیمی پالیسی 2020 مختلف مضامین اور Stream کے درمیان کھائی کو پاٹنا چاہتی ہے۔ بالخصوص ثانوی تعلیم میں دیگر اختیاری مضامین کے ساتھ Physical Education آرٹ، کرافٹ اور ووکیشنل مہارتوں کو جوڑ کر طلبا کی ہمہ جہت ترقی کے لیے ایک ایسا نصابی خاکہ اپنانے پر زور دیتی ہے جس میں نصابی، ہم نصابی اور زائد نصابی سرگرمیوں کو اپنانے اور الگ سے دیکھنے کا سخت گیر نظریہ نہ ہو۔ جہاں تک ممکن ہو سکے آرٹس، ہیومنٹیز اور سائنس Stream کے مضامین کے درمیان ووکیشنل تربیت کو بھی اہمیت دی جائے۔ چنانچہ یہ تعلیمی پالیسی Physical Education، آرٹ کرافٹ، Vocational Skills کو سائنس، ہیومنٹیز اور ریاضی کے ساتھ شامل کرکے اسکولی تعلیم کے پورے نصاب کو ہر عمر کے بچوں کے لیے دلچسپ اور مستحسن قرار دیتی ہے۔ پالیسی میں مختلف Stream کے درمیان مضامین کے انتخاب میں لچکداریت کا رویہ اپنانے پر زور دیا گیا ہے تاکہ اسکولی طلبا کی ہمہ جہت ترقی ممکن ہو سکے اور طلبا میں مشکل مضامین سے الجھن اور بیزاری کا رویہ ختم ہو۔ وہ

تعلیم کو اپنے لیے انبساطی طور پر قبول کریں۔ اس طرح سے سبھی گروپ کے طلبا کو ان کی دلچسپی کے سبھی مضامین کا علم بھی ہوگا جو ان کی عملی زندگی میں کارآمد بھی ثابت ہوگا۔

اسکولی تعلیم کی تشکیل نو اور اسے نئی سمت و جہت دینے کے لیے قومی سطح پر نصابی خاکہ National Curriculum Framework for School Education (NCFSE-2020-21) تیار کرنے کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔ NCSFSE-2020-21 این سی ای آر ٹی کی رہنمائی میں تیار کیا جائے گا۔ اس خاکے پر مفکرانہ بحث و تمحیص کے لیے تعلیم و تعلم کے شعبے سے جڑے سبھی اساتذہ، ادارے، وزارت اور محکموں سے گفت وشنید ہوگی۔ مرکزی و ریاستی سطحوں کے ماہرین تعلیم کی رائے لی جائے گی اور یہ کوشش بھی کی جائے گی کہ یہ نصابی خاکہ سبھی علاقائی زبانوں میں تیار ہو۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے مطابق ہر پانچ سال سے دس سال کے درمیان اسے Update بھی کیا جائے گا۔ پالیسی مذکورہ خاکے کی بنیاد پر نصابی کتابیں اور درسی مواد بھی تیار کرنے کا ارادہ رکھتی ہے جو بحث ومباحثہ Discussion، تجزیہ Analysis، مثال وتمثیل Example اور اطلاق Aplication کے اساسی عناصر پر مبنی ہوگا۔ ان نصابی کتابوں اور درسی مواد میں علاقائی ضرورتوں کا خاص خیال رکھا جائے گا۔ درسی کتابیں اعلی معیار کی ہوتے ہوئے بھی کم قیمت ہوں گی۔ NCESE-2020-21 کی ہی ہدایات پر ریاستوں کی SCERT's بھی درسی کتابیں و درسی مواد تیار کریں گی۔ NCERT کا یہ نصابی خاکہ قومی سطح کے تعلیمی معیار کے مطابق ہوگا۔ درسی کتابیں تیار کرتے وقت یہ خیال رکھا جائے گا کہ اس کی Hardcopy کے ساتھ ساتھ Softcopy بھی بروقت مہیا ہو اور ملک کی سبھی ریاستوں / خطوں میں با آسانی پہنچائی جاسکے۔ پالیسی کی ہدایت کے مطابق SCERT's , NCERT اور ماہرین تعلیم کے ذریعے نصاب اور طریقہ تدریس میں ایسی نمایاں تبدیلیاں اور تخفیف کی سفارش کی جائے گی جس سے نصابی کتب اور بستے کے بوجھ کو کم کیا جاسکے۔

اسکولی سطح پر تعین قدر اور جانچ کے طریقہ کار کو بہت ہی اہمیت حاصل ہے۔ لہٰذا اس سطح کی جانچ اور تعین قدر کے لیے جدید تر اور منفرد اندازۂ قدر کے طریقوں کی طرف توجہ کی گئی ہے تاکہ طلبا کی ہمہ جہت ترقی کی جانچ ممکن ہو اور ان کی ذہنی نشوونما، تاثراتی نشوونما اور حسی حرکی نشوونما کی جانچ کثیر جہتی انداز سے کی جاسکے۔ نئی تعلیمی پالیسی نے ثانوی سطح کے امتحانات بالخصوص بورڈ کے امتحانات کے طریقہ کار میں بھی واضح تبدیلی کا اشارہ دیا ہے تاکہ Coaching Culture کی وبا پر قابو پایا جاسکے۔ موجودہ دسویں اور بارہویں بورڈ کے امتحانی نظام کو باقی رکھتے ہوئے داخلہ جاتی امتحانات میں کئی اصلاحات (Reforms) کی ہدایات دی گئی ہیں۔ بورڈ کے امتحانات، Entrance Test اور مسابقتی امتحانات کے تناؤ کو ختم کرنے کی ہدایات بھی اس پالیسی میں شامل ہیں۔ پالیسی کے مطابق:

To further eliminate the 'high stakes' aspects of Board Exams, all students will be allow to take board Exams on up to two occasions during any given school year, one main examination and one for improvement, if desired.(NEP-2020,4.37)

اسکولی سطح پر امتحانی نظام میں تبدیلی کرتے ہوئے سالانہ امتحانات کے علاوہ سمسٹر اور Moduler Board Exams کے طریقہ کار کو فروغ دینے پر غور کیا جارہا ہے۔ مضامین کے انتخاب کی سطح پر بھی لچیلا رویہ اختیار کرنے کی طرف دھیان دیا گیا ہے اور ریاضی کے مضمون کو دو سطحی بنایا گیا ہے۔ مذکورہ تجدید اور اصلاح کے لیے NCERT ماہرین تعلیم، اساتذہ اور امتحانی نظام سے منسلک ماہرین سے صلاح ومشورے کے بعد گائڈ لائن تیار کرے گا۔ 2020-21 تک کچھ دیگر اصلاحات بھی نافذ ہوں گی مثلاً National Board of Assesment (BoAs), Assesment Centre وغیرہ کا قیام عمل میں آئے گا۔ NCFSE-2020-21 اس ضمن میں بھی ان ذیلی اداروں کی رہنمائی کرے گا۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 تعین قدر کے ضمن میں مزید اصلاح کرتے ہوئے Performence, Assesment, Review and Analysis of Knowledge for Holistic Development (PARAKH) جیسے تعین قدر کے نظام کی تشکیل کا ارادہ رکھتی ہے۔ یونیورسٹی سطح کی انٹرنس اگزام کی طرز پر National Testing Agency (NTA) اسکولی سطح پر بھی Common Subject Entrance Exams سال میں دو بار منعقد کرائے گی جو سائنس، ہیومنیٹیز، زبان، آرٹس، اور دیگر Vocational Subjects پر مشتمل ہوگا۔

بچوں میں خداداد صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے لیے جاری سرگرمیوں کو اس پالیسی میں مزید وسعت دی جائے گی اور بچوں کی خداداد صلاحیتوں، خوبیوں اور امنگوں کی پرورش و پرداخت کی جائے گی۔ اس کے لیے اسکولی نصاب اور تعلیمی سرگرمیوں میں خصوصی مہارت و دلچسپی کے طلبا کے لیے الگ سے مطالعے کا منصوبہ بنایا گیا ہے تاکہ ان کی خوبیوں اور صلاحیتوں کو پہچان کر انھیں آگے بڑھایا جاسکے۔ ان منفرد صلاحیتوں کے طلبا کو بہتر مواقع کے حصول کے لیے NCERT اور NCTE لائحہ عمل تیار کریں گی۔ مزید یہ کہ بی ایڈ کے کورسز میں بھی ان منفرد صلاحیتوں کے بچوں کے لیے خصوصی انتظام کیا جائے گا۔ قومی تعلیمی پالیسی خصوصی دلچسپی رکھنے والے طلبا کے لیے مختلف نصابی و ہم نصابی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کے لیے مختلف سبجیکٹ سرکل اور سبجیکٹ کلب تشکیل دینے پر زور دیتی ہے۔ یہی نہیں طلبا کے عمدہ اور منفرد کارناموں کو بڑھاوا دینے کے لیے گرمی کی تعطیل میں ان کے لیے الگ سے تعلیمی وتربیتی پروگرام کا انعقاد کیا جائے گا۔ اس میں پورے ملک کے طلبا کے ساتھ سماجی، معاشی طور پر پسماندہ طبقات کے بچوں کے لیے حوصلہ افزائی کا خصوصی انتظام کیا جائے گا۔ موجودہ اوپیاڈ اور مسابقتی امتحانات کو مزید فعال بنایا جائے گا اور ان امتحانات کے سوالنامے علاقائی اور چھوٹی زبانوں میں بھی فراہم کیے جائیں گے۔ یہی نہیں مختلف سرکاری و پرائیویٹ اعلی تعلیمی ادارے انھیں مزید تقویت پہنچائیں گے۔ ان کے نتائج کو حوصلہ افزا اور وقار بخشنے کے لیے IIT اور NIT اپنے انڈر گریجویٹ داخلوں میں ان کی حوصلہ افزائی کریں گی۔ پوری اسکول ایجوکیشن کو انٹرنیٹ اور اسمارٹ فون اور دیگر ترسیلی ذرائع سے جوڑ کر آن لائن تعلیمی سلسلے کو مزید فروغ دینے کا پلان تیار کیا گیا ہے۔ سبھی اسکولوں کو بتدریج اسمارٹ کلاسز کی سہولیات فراہم کرنے کا پختہ ارادہ ہے تاکہ آن لائن طریقہ تدریس کے ذریعے تعلیم کے مختلف وسائل سے خاطر خواہ فائدہ حاصل کیا جاسکے۔

غرض کہ اسکولی تعلیم کی تشکیل نو کے لیے قومی تعلیمی پالیسی 2020 نے وہ سبھی اقدامات اور طریقہ کار وضع کرلیے ہیں جن کے ذریعے اکیسویں صدی کے ہندوستان میں ابتدائی، ثانوی اور اعلی ثانوی یعنی پوری اسکولی تعلیم کا از سر نو جائزہ لے کر ان کی خامیوں کو دور کرکے اور اصلاحات کو نافذ کرکے 2030 تک ایک نئے نظام کو آخری شکل دی جاسکے۔ تاکہ 18 سال تک کی عمر کے سبھی بچوں کے لیے ہمہ گیر، معیاری، مفت اور لازمی تعلیم کا خواب شرمندہ تعبیر ہوسکے۔

■

Dr.Reyaz Ahmad
Associate Professor & Principal I/C
MANUU College of Teacher Education
Nuh, (Mewat) Haryana- 122107
Email: reyazahmed045@gmail.com
Mob:9052112740

محمد اکبر القادری

تدریسی و اکتسابی عمل میں روحانی ذہانت کا کردار

انسانی دماغ کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنا خود انسان۔ اس طرح وہ مختلف ارتقائی مراحل سے گزرتا رہا۔ اس سفر میں اسے مختلف ادوار اور ذہانتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کبھی جسمانی طاقت ہی اصل محور تھی۔ پھر ایک دور آیا کہ اعداد و شمار ذہانت کا معیار سمجھے جانے لگے لیکن اس کا مکمل اور واضح تصور 20 ویں صدی کے اوائل میں اس وقت آیا جب ولیم اسٹرن نامی ایک ماہر نفسیات نے مقیاس ذہانت یا آئی کیو کی اصطلاح ایجاد کی اور پھر 1904 میں الفریڈ بنے نے پہلے انسانی ذہانت کی پیمائش والا ٹیسٹ ایجاد کیا۔ یہ ابتدائی دور تھا، جب ذہانت کو ناپا اور پرکھا جا رہا تھا کہ یہ کیا ہوتی ہے؟ اور کہاں سے آتی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس مقیاس کے ذریعے کسی فرد کی ذہنی قابلیت کا اس کی طبعی عمر اور ماحول کے مطابق اندازہ لگایا جاتا ہے فی الوقت یہ مقیاس بہت ہی کارآمد اور مقبول ہے۔

ذہانت کے نظریات

عمومی ذہانت: اسپیرمین نے اپنے تجربات کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ انٹیلی جنس ایک عمومی علمی قابلیت ہے جسے پیمائش اور عددی طور پر ظاہر کیا جاسکتا ہے نیز یہ کہ ذہانت کی ساری اقسام باہمی طور پر ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں۔ گویا اگر کوئی شخص کسی آئی کیو ٹیسٹ کے ایک شعبے کو اچھی طرح سے عبور کر جاتا ہے تو وہ باقی شعبوں میں بھی خاصا اچھا ہوگا۔

متعدد ذہانتیں: ہاورڈ گارڈنر جو اس نظریے کے بانی ہیں انھوں نے آٹھ مختلف اقسام کی ذہانتوں کا ذکر کیا اور دعویٰ کیا کہ ان ذہانتوں کے درمیان کسی باہمی تعلق کی ضرورت نہیں۔ یعنی ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ ایک آدمی اچھی طرح سے کئی زبانیں سیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو لیکن تجزیاتی صلاحیت سے محروم ہو۔

ذہانت کا سہ رخی نظریہ: سٹرن برگ نے نیا نظریہ پیش کیا جس میں اس نے ذہانت کو بنیادی طور پر تین ذیلی اقسام میں بانٹا ہے، یعنی: تجزیاتی ذہانت، تخلیقی ذہانت اور عملی ذہانت۔

یہاں مرکوز نظر ڈاکٹر گارڈنر کا نظریہ ملٹی پل انٹیلی جنسز ہے، اسی نظریے کی بنا پر روحانی ذہانت تک رسائی ممکن ہوسکی، حالاں کہ ہاورڈ گارڈنر نے سائنس کے مقداری معیار کو مجاز بناتے ہوئے روحانی ذہانت کو ملٹی پل انٹیلی جنسز میں شامل نہ کرنے کا انتخاب کیا۔ اس کے بجائے، انھوں نے 'وجودی ذہانت' کا مشورہ دیا۔

روحانی ذہانت کی اساس

اگرچہ روحانی ذہانت کا تصور نسبتاً نیا ہے، لیکن اس کا تصور مذہبی کتابوں، نفسیات، نیورولوجی اور فلسفہ کے شعبوں میں موجود ہے، خاص طور پر مشرقی تصوف اور مقامی عقائد میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اسلامی ثقافت میں روحانی ذہانت پر واضح طور پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ روحانی ذہانت قرآن کی آیات، پیغمبرؐ کے الفاظ کی وسعت کو سمجھنے میں معاون سمجھا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں روحانی ذہانت سے لطف اٹھانے والوں کو اشرافیہ کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ حقیقت کے جوہر کو سمجھ سکتے ہیں اور تخیلاتی سرحدوں کو عبور کر سکتے ہیں۔ اسلامی کتابوں کے مطابق، تقویٰ اور پرہیزگاری روحانی ذہانت کے موثر عوامل ہیں۔ مزید کارل ینگ کا کام، عصر حاضر کے اسکالرز کے لیے روحانیت کے موضوع پر مشعل راہ ہے۔

روحانی ذہانت سے وابستہ دیگر نفسیاتی نظریات میں ڈابروسکی (1967) شامل ہیں، انھوں نے اپنے نظریے میں فرد کے سوچنے کے عادی طریقوں کو ترک کرنے اور ہمدردی، سالمیت اور جذبہ ایثار کو اپنانے کی

صلاحیت کے متعلق بیان کیا۔ ماسلو (1968) کا نظریہ خودشناسی، جس میں انصاف، خوبصورتی، سچائی، سخاوت، اور انفرادیت جیسی اقدار پر زور دیا گیا ہے۔ لیکن سب سے پہلے واضح طور پر ڈانا زہر نے اپنی کتاب Rewriting the 1967Corporate Brain میں متعارف کرایا۔

محققین کا ماننا ہے کہ جو افراد روحانی ذہانت کے مالک ہوتے ہیں وہ مسائل کی پیچیدگیوں کو سلجھانے کے لیے روحانی ذرائع استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ باشعور بھی ہوتے ہیں اور اپنی روزمرہ کی سرگرمیوں کو مقدس تصورات سے مربوط کرنے پر قادر بھی ہوتے ہیں۔

روحانی ذہانت کیا ہے؟

روحانی ذہانت: ذہانت کا ایک اعلیٰ عنصر ہے جو انسانی شخصیت میں حقیقی ذات (یا روح) کی خصوصیات اور صلاحیتوں (دانشمندی، ہمدردی، سلامتی، خوشی، محبت، تخلیقی صلاحیتوں اور امن) کو متحرک کرتی ہے۔ روحانی ذہانت اپنے وسیع تر معانی و مقاصد میں زندگی کی اہم صلاحیتوں اور کام کی مہارتوں کو بروئے کار لاتا ہے (رچرڈ گریفتھس) امونس (2000) حسب منشا روحانی معلومات کا استعمال کر کے روزمرہ کے مسائل کو حل کر کے مقصد اصلی کی حصولیابی روحانی ذہانت ہے۔

وگلس ورتھ (2002) روحانی ذہانت: افراد کے اندرونی اور بیرونی امن کو برقرار رکھتے ہوئے دانشمندی اور ہمدردی کے ساتھ برتاؤ کرنے کی اہلیت ہے، چاہے وہ صورتحال سے قطع نظر ہو۔

کنگ (2008) روحانی ذہانت: ان غیر مادی ذہنی صلاحیتوں کا مجموعہ ہے جن کی حقیقت عقل سے ماورا ہے، خصوصاً وہ جن کے وجود کی نوعیت ذاتی اور شعور کی بلند و بالا مقام سے متعلق ہیں۔

تھورن (2001) کے مطابق: کائنات کی تفہیم کے لیے روحانی ذہانت فطری طور پر انسان کی ذاتی ذہانت (علم، تعریف اور خود آگہی، سماجی ذہانت، مردم شناسی) سے نشو ونما پاتی ہے۔

نسیل (2004) کے مطابق: روحانی ذہانت کسی کی اس صلاحیت کا نام ہے جو اسے خودی کی معرفت تک پہنچاتی ہے اور روحانی و عملی مسائل کے حل کرنے کی طرف رہنمائی فراہم کرتی ہے۔

زہر اور مارشل کے مطابق روحانی ذہانت زندگی کے پیچیدہ مسائل کو بآسانی حل کرنے نیز زندگی اور اس کے تمام پیچ وخم کی گتھیوں کو سلجھانے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

محققین کا ماننا ہے کہ جو افراد روحانی ذہانت کے مالک ہوتے ہیں وہ مسائل کی پیچیدگیوں کو سلجھانے کے لیے روحانی ذرائع استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ باشعور بھی ہوتے ہیں اور اپنی روزمرہ کی سرگرمیوں کو مقدس تصورات سے مربوط کرنے پر قادر بھی ہوتے ہیں۔

حالیہ برسوں میں متعدد عالمی تحقیقات کے ماہرین نے اس خیال کی تائید کی ہے کہ بعض روحانی عقائد جسمانی عمل اور دماغی صحت کے ساتھ مثبت طور پر وابستہ ہیں۔ جن میں سے سولاتی و نجفی کی تحقیق یہ آشکار کرتی ہے کہ 65 طلبا تناؤ اور پریشانی سے نجات کے لیے مذہبی امور سے استفادہ کرتے ہیں۔ اسٹیورڈ اور جوائے نے یہ بتایا کہ احساس روحانیت دماغی صحت اور ہم آہنگیت کے ساتھ مثبت طور پر وابستہ ہیں اور مذہبی طلبا دیگر طلبا کے مقابلے میں زیادہ ہم آہنگیت کے حامل اور اعلیٰ ترین تعلیمی نتائج سے لطف انداز ہونے والے ہوتے ہیں۔

روحانی ذہانت کے اصول

خود آگہی، بیساختگی، بامقصدیت، احساسِ ہمدردی، تمدنی فرق کا احترام، غلطیوں سے سیکھنا، تشکیل نو کی قابلیت اور پیشہ ورانہ احساس وغیرہ۔

روحانی ذہانت کی خصوصیات

مارشل اور زہر (2000) کا یہ خیال ہے کہ روحانی ذہانت ایک فطری قابلیت ہے جسے ہم عقلی مسائل کو حل کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں جس کے سبب زندگی کو لازوال تو نہیں مگر خوبصورت بنایا جاسکتا ہے۔ انھوں نے ترقی یافتہ روحانی ذہانت کی خصوصیات کو اس طرح بیان کیا:

اعلیٰ سطحی خود آگہی
صلح پسندانہ رویہ
تکالیف ومصائب کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت
مشکل سوالات کا پرسکون انداز میں جواب دینے کی استطاعت
تخیلات اور اقدار سے تاثر پزیری
مختلف چیزوں کے مابین روابط دیکھنے کا رجحان
غیر روایتی سرگرمیوں سے کنارہ کشی

روحانی ذہانت کے عوامل

طرز زندگی: محنت، وقت کی پابندی، ذہانت، جسمانی عمل جیسے کہ ورزش (نماز، یوگا) اور باقاعدگی سے مراقبہ کرنا۔

روشن خیالی: روحانی مسائل، مقدس نصوص کو پڑھنے اور ان کا تجزیہ کرنے میں طبیعت کا میلان۔

الٰہیات: خدا کے ساتھ روابط، روحانی قوت، اور خدائی طاقت کا احساس، بچپن میں دانشورانہ سرگرمیوں میں دلچسپی جیسے مذہبی تقریبات میں شرکت اور والدین کے ذریعے مقدس متون کو پڑھنا۔

حسی ادراک کی کثرت: وہ تجربات جن کو مافوق الفطرت یا چھٹے احساس کا حوالہ دیا جاتا ہے۔

نفسیاتی الجھن: روحانی آگاہی جو تکلیف دہ تجربات سے دوچار ہوتی ہے۔

خدمت خلق: روحانی سرگرمیاں کرنا جو معاشرے کے لیے فائدہ مند ہوں۔

روحانی ذہانت کے اجزا

امونس (2000) نے پانچ عناصر کی تجویز پیش کی ہے:

(الف) مسائل کے حل کے لیے روحانی وسائل استعمال کرنے کی اہلیت

(ب) شعور کی بلند و بالا منازل میں داخل ہونے کی صلاحیت

(ج) پاکیزہ احساس کے ساتھ روزمرہ کی سرگرمیوں کو انجام دینے کی اہلیت

(د) جسمانیت اور مادیت پر برتری کی استطاعت

(ز) زندگی کو عفت و پاکدامنی کا نمونہ بنانے کی قابلیت

مایر (2000) نے امونس کے تجویز کیے گئے پانچویں روحانی جز پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ:

ذہانت تعلیم میں کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ جب کہ تعلیم جسم اور ذہانت کے فروغ کے لیے ذرائع مہیا کرتی ہے اور اس عمل کو کارآمد بنانے میں مرکزی رہنمائی اساتذہ کی ہوتی ہے۔ اس لیے اساتذہ کو جذباتی اور روحانی طور پر پختہ ہونا چاہیے تاکہ وہ طلبہ کی روحانی ضروریات کو فروغ دے سکیں۔

''عفت و پاکدامنی کا تعلق ذہانت سے زیادہ شخصیت سے ہے۔'' اس کے بعد اموئس نے بنا کوئی جواب دیے اس پانچویں شق کو حذف کر دیا۔

تعلیم میں روحانی ذہانت کا کردار

ذہانت تعلیم میں کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ جب کہ تعلیم جسم اور ذہانت کے فروغ کے لیے ذرائع مہیا کرتی ہے اور اس عمل کو کارآمد بنانے میں مرکزی رہنمائی اساتذہ کی ہوتی ہے۔ اس لیے اساتذہ کو جذباتی اور روحانی طور پر پختہ ہونا چاہیے تاکہ وہ طلبہ کی روحانی ضروریات کو فروغ دے سکیں۔

تعلیمی خدمات انجام دینے سے قبل زیر تربیت اساتذہ کے کورس میں ان کی جذباتی و روحانی نشوونما کے لیے مواد کی شمولیت عصر حاضر میں نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ اساتذہ طلبا کے کردار کو متاثر کرتے ہیں۔ ان کے جذباتی، منطقی، معاشرتی اور روحانی دائرے کی نشوونما پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ اسی لیے صرف روحانی ذہانت والے اساتذہ کا طلبا کی ترقی کو فروغ دینے میں اہم رول ہوتا ہے۔

روحانی ذہانت کے فروغ کے ذرائع

ذہانت کی دیگر اقسام کی طرح، کچھ لوگ پیدائشی طور پر ہی دوسروں کے مقابل یا اعلیٰ روحانی ذہانت رکھتے ہیں۔ تمام مذہبی روایات یہ دعویٰ کرتی ہیں کہ ہم میں سے ہر ایک مخصوص طریقوں کے ذریعے اپنے ایس کیو کو ترقی یافتہ بنا سکتا ہے۔ جس سے کسی کو راہب یا راہبہ بننے کی ضرورت نہیں ہے۔

ایسے اوہام اور غلط فہمیاں جو کسی بھی شخص کو اپنی حقیقی شخصیت کی شناخت سے روکتی ہیں ان کو دور کرنے کے لیے کچھ طریقے ہیں۔ جتنا زیادہ ان طریقوں پر عمل کیا جائے گا اتنی تیزی سے روحانی ذہانت کی نشوونما ہوگی۔ روحانی ذہانت کے نشوونما کے کچھ ذرائع مندرجہ ذیل ہیں:

مراقبہ: مراقبہ خود آگہی یا بیداری کا بہترین ذریعہ ہے۔ مراقبے کے عمل سے لوگ اپنے آپ کا احتساب بخوبی کر سکتے ہیں اور اپنی شخصیت کے تمام پہلوؤں سے واقف بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ عمل کسی شخص کو اپنے خیالات اور احساسات پر قابو پانے، خوبی وخامی میں امتیاز کی صلاحیت کو بڑھانے وغیرہ کے ساتھ ساتھ بہترین انتخاب کرنے میں بھی معاون ہوگا۔ مزید اس سے خوابیدہ حالتیں بیدار ہونے، روحانی طور پر علوم منتقل ہونے اور اللہ تعالیٰ کی توجہ اور قرب خیالی سے نجات حاصل ہوتی ہے۔ ذہنی سکون کے ساتھ اخلاقی برائیوں کا مادہ ختم ہو جاتا ہے۔

عکاسیت: ماضی میں دوسروں کے ساتھ تعامل و برتاؤ کے تجربات کا جائزہ لینے کے لیے روزانہ کی بنیاد پر وقت نکالنا، اس سے خود کو خیالات اور احساسات کی اندرونی دنیا اور عمل کی بیرونی دنیا کا تعلق اور ان اعمال کے نتائج کے بارے میں شعور اجاگر کرنے کی سہولت ملتی ہے۔

مربوط ہونا: یہ روحانی طاقت کا اہم ترین وسیلہ ہے۔ اس وسیلے کے جڑنے سے خود کو بااختیار بنانا ممکن ہو جاتا ہے۔ اس کے ذریعے سے انسان روحانی ذہانت کی گہرائی اور وسعت دونوں میں اضافہ کرتا ہے۔ کیوں کہ اندرونی افراتفری کو صاف کرنے اور اپنے شعور کو مرکوز کرنے کے لیے اعلیٰ ماخذ سے حاصل شدہ توانائی ضروری ہے۔

مشق: نئی تعلیم، نئی بصیرت، نئے احساسات صرف نظریات ہیں۔ یہ انسان کی زندگی کو تبدیل کرنے کی طاقت نہیں رکھتے جب تک کہ وہ عمل میں نہ لائے جائیں اور وہ نئے طرز عمل کی تشکیل کے سانچے میں ڈھل کر اظہار خیال کے عمل میں کاملاور وہ نئے طرز عمل کی تشکیل کی اجازت دیکر کے پھر اظہار خیال کے عمل میں کامل ہو جائیں۔ روحانی ذہانت کی نشوونما کو برقرار رکھنے کے لیے عملی اقدامات ضروری ہیں۔

ادب کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ، روحانی ذہانت تربیت سے بہتر ہو سکتی ہے۔ جوانی کا دور روحانی ذہانت کی تربیت کے لیے ایک اہم دور ہے کیونکہ اس دور میں ایس کیو میں ایک ذیلی ذخیرہ اس میں اضافہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

تدریسی واکتسابی عمل میں روحانی ذہانت

تعلیمی مقاصد کے حصول کے لیے صرف علمی ذہانت اور آئی کیو واحد عوامل نہیں ہیں بلکہ دیگر مختلف علمی ذہانتیں بھی ہیں جیسے کرسٹلائزڈ انٹلیجنس، جذباتی ذہانت، سماجی ذہانت اور روحانی ذہانت جو علمی، عملی اور زندگی کی کامیابیوں کا پیش گو ہوتی ہیں۔ رہی بات روحانی ذہانت کی تو طلبا اسکولوں میں مذہبی تعلیم، اخلاقی تعلیم اور روحانی سرگرمیوں (جیسے نماز اور اخلاقیات کی مشق) کے ذریعے روحانی ذہانت کے عناصر پر آگہی حاصل کرتے ہیں۔ ہندوستان کی چند ریاستوں نے ہی اپنے اسکولوں میں اخلاقیات کو بحیثیتِ ایک مضمون منتخب کیا ہے، حالاں کہ اخلاقی تعلیم کی اہمیت عصر حاضر میں نہایت ہی ضروری ہے۔ اس اقدام سے یقیناً یہ کہا جا سکتا ہے کہ طلبا کو نہ صرف اکیڈمک معلومات فراہم کی جائے گی بلکہ مثبت اقدار (مذہبی تعلیم، اخلاقی تعلیم اور روحانی سرگرمیاں) بھی فراہم کی جائیں گی جو طلبا کے روشن مستقبل پر زور دیتی ہیں۔ روحانیت کے پُرکشش تصورات کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ روحانیت طلبہ کے لیے زندگی کے مقاصد کے حصول جیسے مستقبل میں بہتر زندگی کے لیے تعلیمی اہداف تک رسائی کے لیے رہنما اصول ثابت ہو سکتے ہیں۔

طلبا کی تعلیمی کامیابی میں کمی والدین اور اساتذۂ کرام کے مابین ایک اہم تشویش بنی ہوئی ہے۔ والدین کی معاونت، اساتذہ کی مدد، ہم جولیوں کا تعاون، اسکول کی سہولیات اور ماحولیات کچھ ایسے عوامل ہیں جن پر کافی تحقیقات کی گئی ہیں اور سبھی نے اس بات کا خلاصہ کیا ہے کہ یہ عوامل طلبا کی تعلیمی کامیابی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ عوامل اور بھی ہیں جن کا طلبا کی تعلیمی کامیابی پر گہرا اثر پڑتا ہے جیسے اقدار، محرکات، محنت اور کام کی اخلاقیات (اورنسٹین، 2010)۔ ان اقدار کا اظہار روحانی ذہانت کے ان عناصر کے ذریعے کیا جا سکتا ہے جو اخلاقیات کے اکتساب اور اقدار پر مرکوز ہے۔ ان مثبت اقدار کی مدد سے، اساتذہ طلبا کو تعلیمی میدان میں درپیش مسائل کی گتھی سلجھانے کے قابل بنا سکتے ہیں۔

تعلیمی مقاصد کے حصول کے لیے صرف علمی ذہانت اور آئی کیو واحد عوامل نہیں ہیں بلکہ دیگر مختلف علمی ذہانتیں بھی ہیں جیسے کرسٹلائزڈ انٹلیجنس، جذباتی ذہانت، سماجی ذہانت اور روحانی ذہانت جو علمی، عملی اور زندگی کی کامیابیوں کا پیش گو ہوتی ہیں۔ رہی بات روحانی ذہانت کی تو طلبا اسکولوں میں مذہبی تعلیم، اخلاقی تعلیم اور روحانی سرگرمیوں (جیسے نماز اور اخلاقیات کی مشق) کے ذریعے روحانی ذہانت کے عناصر پر آگہی حاصل کرتے ہیں۔ ہندوستان کی چند ریاستوں نے ہی اپنے اسکولوں میں اخلاقیات کو بحیثیت ایک مضمون منتخب کیا ہے، حالاں کہ اخلاقی تعلیم کی اہمیت عصر حاضر میں نہایت ہی ضروری ہے۔

Mohammad Akbarul Qadri
Ph. D. Scholar, Dept. of Education
University of Madras -600005 (Tamil Nadu)
Mob:8885485920

درد و غم کا شاعر
وکیل اختر

سید احمد قادری

ہم آپ ایسے بہت سارے اردو کے شعرا سے بخوبی واقف ہیں، جن کے کئی کئی دیوان انھیں وہ شہرت اور مقبولیت نہیں دے سکے، جو بعض شعرا کا صرف ایک شعر انھیں شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیتا ہے۔ ایسے ہی ایک شاعر وکیل اختر ہیں، جن کا ایک شعر زبان زد خاص و عام ہے۔

آپ سے جھک کے جو ملتا ہوگا
اس کا قد، آپ سے اونچا ہوگا

یہ شعر ہی وکیل اختر کے تعارف اور ان کی شاعرانہ عظمت کے اعتراف کے لیے کافی ہے۔ یہ شعر سنتے ہی لوگ چونک پڑتے ہیں۔ اس شعر میں جو انکساری ہے، ثقافتی روایت ہے، وہ فکری و معنوی لحاظ سے بلاشبہ آفاقیت بخشتا ہے۔ ویسے اس شعر کے علاوہ بھی وکیل اختر نے ایسے بہت سارے کلام چھوڑے ہیں جو اردو شاعری میں قابل قدر اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

وکیل اختر کی شاعری کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان کی زندگی کے اوراق کو پلٹا جائے۔ اس لیے کہ ہر شاعر اپنی زندگی اور اپنے عہد کے جن حادثات، سانحات اور واقعات سے گزرتا ہے، انھیں وہ عام ڈگر سے الگ ہٹ کر دیکھتا، سمجھتا اور محسوس کرتا ہے اور اپنے ان ہی محسوسات کو وہ اپنے رنگ و آہنگ، فکر و فن اور اسلوب کے ساتھ شعری پیکر عطا کرتا ہے۔

وکیل اختر کی زندگی کے گوناگوں مسائل، ازدواجی زندگی کی ناآسودگی، بدلتے وقت اور حالات کی سفاکی نے انھیں اس قدر محرومی، یاس، بے بسی، اذیت، درد و کرب اور اضطراب سے دوچار کیا کہ وہ چاہ کر ان مسائل سے نجات نہیں پا سکے اور بے رحم وقت کے ہاتھوں گرداب میں ڈوبتے چلے گئے۔ جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ زندگی کے ان مسائل کے اسیر ہو گئے اور ان المناکیوں کی ترجمانی وہ اپنے منفرد انداز اور اسلوب کے ساتھ کرتے رہے۔

ان حالات کے اسباب جاننے کے لیے بے اختیار ان کی زندگی کے اوراق ہم پلٹنے پر خود کو مجبور پاتے ہیں۔ ان اوراق پر ان کی ولادت کی تاریخ 30 مئی 1936 ملتی ہے۔ جائے پیدائش بہار کا گیا ضلع (موجودہ نوادہ ضلع) کا پتھوری گاؤں ہے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد وہ کلکتہ چلے گئے اور 1952 میں امتیازی نمبروں سے میٹرک پاس کیا۔ 1964 میں اسلامک ہسٹری اور کلچر میں کلکتہ یونیورسٹی سے ماسٹر کی ڈگری حاصل کی اور 1967 میں پبلک سروس کمیشن کی جانب سے ان کی تقرری مدرسہ عالیہ میں بحیثیت معلم ہوگئی۔ ان کی وفات کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا رہنے کے باعث 9 فروری 1971 کو کلکتہ میں ہوئی اور اپنے آبائی گاؤں پتھوری میں مدفون ہوئے۔ وکیل اختر کی شادی ان کے والد عبدالسبحان خاں کے حکم کی تعمیل میں ریاست بہار کے ہی ضلع گیا کے گاؤں مخدوم پور کی ایک ایسی خاتون سے ہوئی جس کا دماغی توازن صحیح نہیں تھا۔ جو دھیرے دھیرے بڑھتا ہی گیا اور جیسے جیسے پاگل پن میں اضافہ ہوا، ویسے ویسے وکیل اختر کا ذہنی سکون چھنتا چلا گیا، ان کی پریشانیاں بڑھتی گئیں۔ چین، سکون، بے قراری اور بے پناہی کا سلسلہ دراز ہوتا گیا، شب بیداری کی عادت سی ہوگئی۔ ان بے رحم حالات کا اظہار وہ یوں کرتے ہیں۔

اس شخص کے غم کا کوئی اندازہ لگائے
جس کو کبھی روتے ہوئے دیکھا، نہ کسی نے

ایک دوسرا شعر بھی دیکھیے، کہتے ہیں۔

وہ کیا دیتا اختر کسی کو پناہ
جو خود عمر بھر بے پناہوں میں تھا

ایسی بے پناہی، بے قراری، بے چینی، بے بسی اور بے کیفی بھرے حالات کے نتیجے میں وکیل اختر نے وہاں پناہ لینے کی کوشش کی، جہاں ہر غم غلط ہو جاتا ہے۔ دوسری پناہ انھیں اس عورت نے دی، جو ان کے عشق میں اپنا سب کچھ تیاگ دینے کے درپے تھی۔ اسی دوران وکیل اختر کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اس عورت کو جب اس مرض میں مبتلا ہونے کا علم ہوتا ہے، تب بھی وہ وکیل اختر سے دوری بنانے کو رضامند نہیں ہوتی ہے اور وہ اپنے محبوب کی زندگی بچانے کے لیے اپنی ناک کی سونے کی کیل تک فروخت کر دیتی ہے۔ اس خاتون کی دیرینہ خواہش تھی کہ اسے وکیل اختر کی ایک دن کے لیے ہی سہی بیوی کا درجہ مل جائے۔ موت کی آغوش میں جانے سے قبل وکیل اختر اسی خاتون کی آغوش میں رہے اور اسی کے زانو پر سر رکھ کر رخت سفر باندھا۔

وکیل اختر کو اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ وہ زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہنے والے ہیں، زندگی سے بڑھتی دوری اور زندگی کے لیے بے بسی اور چھٹپٹاہٹ کا المناک اظہار اکثر وہ اپنے اشعار میں کرتے نظر آتے ہیں۔ المیہ سے بھرا ان کا ایک شعر اس طرح بھی ملتا ہے۔

کسی صورت کوئی صورت نکالو
مجھے بے موت مرنے سے بچالو

وکیل اختر کی زندگی کی ان تلخ اور بے قرار سچائیوں کے بعد اب ان کی شاعری پر نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوگا کہ ان کے اندر درد و غم، کرب و الم کا ٹھاٹیں مارتا سمندر موجزن تھا۔ ان کی شاعری کو بدنام نظر کے مرتب کردہ شعری مجموعہ 'دائروں کی شکست' میں دو حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ 1966 سے پہلے کی غزلیں اور 1966 کے بعد کی غزلیں۔ 1966 کو Turning Point اس لیے بنایا گیا ہے کہ اس وقت تک اردو ادب میں جدیدیت تقریباً حاوی ہو چکی تھی اور ترقی پسند تحریک کا دور خاتمے پر تھا۔ 1966 سے وکیل اختر کی شاعری میں کلاسیکیت اور ترقی پسندی کا احساس نمایاں ہے۔ وکیل اختر کی اس دور کی شاعری کو جدیدیت کے علمبردار ناقد شمس الرحمٰن فاروقی نے تقریباً رد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ...

''وکیل اختر نے 1966 میں اپنی گزشتہ شاعری پر نظر ڈالی تو محسوس کیا ہوگا کہ اب تک ان کے یہاں زندگی کا تجربہ سکنڈ ہینڈ نوعیت کا تھا، یعنی براہ راست عملی یا تخلیقی سطح پر زندگی کو انگیز کرنے کے بجائے انھوں نے اسے دوسروں کے توسط سے دیکھا۔ جس کا پہلا اور اہم ترین نتیجہ رسمی شاعرانہ اظہار کی شکل میں رونما ہوتا ہے۔ جب دوسروں نے دل کو داغ، جگر کو پارہ پارہ، آنسوؤں کو خون اور عشق لالہ غزالاں کو لہو پانی ایک کرنے والا ستم شعار کہہ دیا تو مجھے کیا پڑی ہے کہ میں اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ سے بناؤں...'' (محیط، دائروں کی شکست، ص 12)

اس اظہار خیال کے بعد شمس الرحمٰن فاروقی، وکیل اختر کی 1966 کے بعد کی شاعری کے تعلق سے کہتے نظر آتے ہیں کہ:

''1966 کے بعد وکیل اختر نے زندگی کو اپنے طور پر برتا اور پرکھا، یہی وجہ ہے کہ اس دور کا کلام پچھلے کلام کے مقابلے میں زیادہ حقیقی ہے.....''

(دائروں کی شکست، ص 12)

میں یہاں پر بہت احترام کے ساتھ شمس الرحمن فاروقی کی اس رائے سے کہ... ''وکیل اختر نے 1966 میں اپنی گزشتہ شاعری پر نظر ڈالی ہوگی تو محسوس کیا ہوگا کہ اب تک ان کے یہاں زندگی کا تجربہ سکنڈ ہینڈ نوعیت کا تھا'' اختلاف کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ فاروقی صاحب نے دراصل وکیل اختر کی شاعری کو جدیدیت کا چشمہ لگا کر دیکھنے کی سعی کی ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جب وکیل اختر درد و غم، کرب اور گھٹن کو موضوع سخن بناتے ہیں تو دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں اور ایسا اثر آ گیں احساس پیدا ہوتا ہے کہ قاری ان المناکیوں اور کربناکیوں کے احساسات وجذبات میں ڈوبتا چلا جاتا ہے اور بے اختیار وکیل اختر سے ہمدردی کا جذبہ ابھرتا ہے اور ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ وکیل اختر کے جذبے کی صداقت، احساس کی شعلگی، مشاہدے کی گہرائی اور مطالعے کی گیرائی کے ساتھ ساتھ نادر تشبیہات، استعارے، علامتیں اور اشارے و کنائے میں بڑی سادگی، لیکن پرکاری کے ساتھ بغیر کسی تکلف اور تصنع کے ساتھ سامنے آتی ہیں، جو سیدھے دل میں اترتی چلی جاتی ہیں۔

ویسے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ وکیل اختر کے ابتدائی دور کی شاعری میں تجربات، مشاہدات اور احساسات وجذبات میں وہ بالیدگی نظر نہیں آتی، جو کہنہ مشق شعرا کے یہاں ہوتی ہے۔ لیکن جیسے جیسے حیات وکائنات کے اسرار و رموز سے آشنائی ہوئی، ان کی شاعری خارجیت سے داخلیت تک کا سفر کرتی نظر آتی ہے۔ ان کی زندگی میں رچی بسی تلخیاں، محرومیاں، مایوسی اور کربناکی نئے نئے آہنگ واسلوب کے ساتھ ان کی شاعری میں ڈھلتی چلی گئیں۔

میر تقی میر کا ایک مشہور شعر ہے۔

ہم کو شاعر نہ کہو میر، کہ صاحب ہم نے
درد و غم کتنے جمع کیے، تو دیوان کیا

اگر وکیل اختر کی شاعری کی روح میں اترنے کی کوشش کی جائے، تو وکیل اختر میر کے اس شعر کی مجسم تصویر نظر آتے ہیں۔ وکیل اختر کی زندگی میں جس طرح افسردگی، بے زاری، بے بسی، بے کیفی، گھٹن، شکستگی اور احساس تنہائی در آئی تھیں، ان تمام ٹوٹتے بکھرتے احساسات وجذبات کے شعری اظہار میں وکیل اختر پوری کہتے ہیں۔

ڈوبنا اختر تھا قسمت میں لکھا
ویسے ہم طوفاں سے ٹکرائے بہت

یوم ماتم کی طرح میرا ہر اک دن گزرا
میری ہر رات کٹی ہے شب ہجراں کی طرح

یہ تمام اشعار اس امر کے غماز ہیں کہ درد و کرب کے لامتناہی سلسلے نے وکیل اختر کو اندر سے بالکل توڑ دیا تھا۔ ان کی زندگی میں کوئی رعنائی، کوئی شگفتگی باقی نہیں بچی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اپنی کسمپرسی بھری زندگی کا اظہار تمام تر فکری وفنی لوازمات کے ساتھ اپنی شاعری میں کرتے رہے لیکن اپنے عہد کے اس جینوئن شاعر کو نہ جانے کیوں ان کے ہم عصر شعرا و تذکرہ نگاروں نے دانستہ طور پر فراموش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یوں تو اس کی کئی مثالیں ہیں لیکن میں صرف دو مثالیں پیش کر رہا ہوں۔

1980 میں 144 صفحات پر مشتمل بنگال کے مشہور شاعر اور تذکرہ نگار سالک لکھنوی کی ایک کتاب 'پس شعر' کے نام سے منظر عام پر آئی تھی۔ جس میں سالک لکھنوی نے سودا اور میر سے لے کر علامہ شبلی، اعزاز افضل اور شاہین بدر تک کا ذاتی و شعری تعارف پیش کیا ہے لیکن اپنے ہم عصر شاعر وکیل اختر پر انھوں نے توجہ نہیں دی۔ معاصرانہ چشمک ممکن ہے ہو، لیکن جب کوئی تذکرہ نگار اس میدان میں قدم رکھتا ہے تو وہ اُسے ایسی وقتی معاصرانہ چشمک اور اپنے اختلافات کو ختم کر کے منصفانہ عمل سے گزرنا چاہیے، جو سالک لکھنوی نے نہیں کیا۔ گرچہ بعد میں جب شہود عالم آفاقی نے وکیل اختر کے انتقال کے بعد ایک سو دینیر مرتب کیا، تو اس میں سالک لکھنوی نے وکیل اختر کے سلسلے میں چند جملے ضرور تحریر کیے ہیں۔

اسی طرح مقبول شاعر مظہر امام، مغربی بنگال اردو اکادمی کے سہ ماہی رسالہ 'روح ادب' کے 'بنگال میں اردو شاعری نمبر' میں جو کہ وکیل اختر کے انتقال کے تقریباً 14 سال بعد شائع ہوا تھا، اس میں مظہر امام نے اپنے مضمون بہ عنوان 'مغربی بنگال میں اردو شاعری آزادی کے بعد' وکیل اختر کے سلسلے میں لکھا ہے.....

''مغربی بنگال کی اردو شاعری کا ذکر کرتے ہوئے جس شاعر کا نام بار بار ذہن کے دروازے پر دستک دیتا ہے، وہ وکیل اختر ہیں۔ ان کی شاعری کا آغاز انتہائی روایت پرستانہ سطحی جذبات واحساسات کے اظہار سے ہوا تھا۔ انگریزی ادب سے دلچسپی رکھنے کے باوجود ان کی غزلیں آنچل اور زلف کے سائے سے کبھی باہر نہ نکلتی تھیں لیکن نئے حالات اور زندگی کے نئے مطالبات نے ان کے احساس اور طرز احساس کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔ کہا جاتا ہے کہ وکیل اختر کی ذاتی زندگی نہایت غیر مطمئن تھی۔ زندگی کی آگ میں تپنے کے بعد ہی وہ عصری آگہی کی منزل سے گزرے اور انھوں نے ایسے اشعار کہے، جو کسی شاعر کے لیے سرمایہ امتیاز بن سکتے ہیں۔

ہنس رہا تھا ابھی وہ، ابھی مر گیا
موت اور زیست کا فاصلہ دیکھیے

عجب خامشی اس کے ہونٹوں پہ تھی
عجب شور اس کی نگاہوں میں تھا

وہ آ بھی جائے تو اس کو کہاں بٹھاؤں گا
میں اپنے گھر میں تو رہتا ہوں بے گھروں کی طرح

شاعری کا رخت سفر لے کر وکیل اختر اس راہ پر چل پڑے تھے، جو صحیح سمت کو جاتی ہے۔ ان کی آخری عمر کی غزلوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جدید غزل گو شاعروں میں اپنا مستقل انفرادی مقام حاصل کر لیں گے، لیکن 36 سال کی عمر میں موت ان کی راہ میں حائل ہوگئی۔ وکیل اختر کا قابل توجہ شعری سرمایہ بہت مختصر ہے۔ لیکن شعرا کی بھیڑ میں شور و شغف میں بھی ان کی آواز دبی نہیں رہ سکتی۔''

(روح ادب، اپریل تا جون 1985، ص 195-194)

اس اعتراف کے باوجود مظہر امام نے 1993 میں منظر عام پر آنے والی کتاب 'اکثر یاد آتے ہیں' میں وہ پرویز شاہدی کو تو یاد رکھتے ہیں، لیکن وکیل اختر کو فراموش کر دیتے ہیں۔

ویسے میں مظفر حنفی کی اس رائے سے متفق ہوں کہ:

''وکیل اختر..... جو چھٹی دہائی کے آخری برسوں میں جدید حسیت سے روشناس ہوئے۔ ان کی نظموں میں تبدیلی، ایک سوال، اور پھر وغیرہ لائق ذکر ہیں۔ نیز غزلوں میں بھی اس نوع کے اشعار میں جھلک ملتی ہیں۔

صاف کہتی ہے یہ تاریخ کہ منصوری سے
مضمحل سطوت اورنگ رہی ہے برسوں

بک چکے بہترین سب کپڑے
گرچہ نکلے نہیں ابھی مل سے

بیج کا پودا لگا کے دیکھ لیا
اس میں کوئی ثمر نہیں ہوتا

افسوس کہ وکیل اختر کی جواں مرگی نے نئی غزل کے بہت سے امکانات کو بروئے کار نہ آنے دیا۔ جس کی ان کی صلاحیتوں سے توقع تھی۔'' (ایضاً، ص 173-172)

وکیل اختر کی شعری پرواز بلا شبہ کافی بلند تھی۔ لیکن افسوس کہ ان کی بلند پروازی کو وقت اور حالات کے تھپیڑوں نے زیادہ مہلت نہیں دی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ وکیل اختر کی مختصر زندگی کے مختصر سرمایہ شاعری کو سامنے رکھ کر دیانتداری کے ساتھ انھیں وہ مقام دیا جائے، جس کے وہ مستحق ہیں۔

■

Dr. Sayed Ahmad Qadri
Gaya (Bihar) Road No-7
New Karim Ganj
Gaya-823001 (Bihar)

مراثی انیس
ڈرامائی عناصر

جاوید حسن

مرثیہ ایک زمانے تک مذہبی شاعری تک محدود رہا۔ اُنیسویں صدی تک آتے آتے اس کی ایک ادبی شکل بن گئی۔ اس سلسلے میں میر ضمیر اور میر خلیق کی خدمات سے ہر کوئی واقف ہے کہ کس طرح ان دونوں تخلیق کاروں نے اپنی ذہانت اور جودت طبع سے کئی اہم تبدیلیاں ایسی کیں جس سے مرثیے کا دامن وسیع ہوتا گیا۔ اس کے بعد میر ببر علی انیس اور مرزا سلامت علی دبیر کا نام آتا ہے جنھوں نے صنف مرثیہ کو عظمت بخشی۔ رثائی ادب، جس میں مرثیے کو بجا طور پر بنیادی مقام حاصل ہے، پر فی زمانہ بہت کچھ لکھا جاتا رہا ہے۔ صنف مرثیہ اور انیس و دبیر پر لکھے جانے کا سلسلہ ہنوز جاری بھی ہے۔ بقول پروفیسر شارب ردولوی:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر مرثیے کو انیس جیسا ماہر فنکار، ندرت فکر، وسعت نظر، گہرا مشاہدہ، تجربہ، انسانی نفسیات سے واقفیت، اپنے سامعین کی کیفیت اور جذبات کا نباض نہ مل جاتا تو شاید مرثیہ فن کی اس معراج تک نہ پہنچ پاتا جہاں آج وہ نظر آتا ہے۔''

ہم سب جانتے ہیں کہ ڈراما اور مرثیہ بنیادی طور پر دو مختلف اصناف ہیں، لیکن میر انیس کے مرثیے کا کینوس اتنا وسیع ہے کہ اس کی حدیں المیہ ڈرامے کی حدود سے جا ملتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مراثیِ انیس میں بھی وہ تمام خصوصیات اور عناصر ہمیں مل جاتے ہیں جو ڈرامے کے مخصوص عناصر شمار ہوتے ہیں۔ جیسے قصہ، کردار، مکالمہ، اور تصادم وغیرہ کے علاوہ سب سے اہم عنصر کتھارسس یا تزکیہ نفس یا طہارت نفس جو کہ مصنف کا اصل مقصد ہوتا ہے۔ اس روشنی میں اگر ڈرامے کے عناصر اور مرثیے کی ہیئت اور عناصر کو دیکھیں تو ظاہر ہے اِن میں کوئی تعلق نہیں ملتا لیکن واقعۂ کربلا ایسا المناک سانحہ ہے جس میں رزمیہ بننے کے امکانات پوشیدہ ہیں۔

میر انیس کسی ڈرامے کی تخلیق نہیں کر رہے تھے بلکہ وہ ایک حقیقی واقعے کو مختلف طریقوں سے اپنی شاعری میں بیان کر رہے تھے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ مرثیہ لکھتے وقت اگر چہ اُنیس کے سامنے ڈرامے کے عناصر نہیں تھے لیکن اُن کے مرثیوں کو پڑھتے ہوئے ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ تمام لوازمات جو کسی واقعے کو ایک کامیاب ڈرامے میں تبدیل کرتے ہیں، انیس کے مرثیوں میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر حسینؓ کی فوج مخالف سے گفتگو، خاص طور پر حُر اور ابن سعد کے درمیان مباحثے، حضرت زینب کی عباس اور عون و محمد سے بات چیت نیز آلِ رسولؐ کی رجز وغیرہ میں ایکشن یا حرکت کی بے شمار مثالیں ہم دیکھ سکتے ہیں، جس سے انیس کے مرثیوں میں ڈرامائی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ راقم نے اس مطالعے کو ڈرامے کے دو عناصر ترکیبی یعنی کردار نگاری اور مکالمے تک محدود رکھا ہے۔

کردار نگاری کے ضمن میں یوں تو بہت سے ایسے کردار ملتے ہیں مگر سر دست صرف ایک کردار کے بارے میں بات کرتے ہیں اور وہ ہے مثال کردار ہے حضرت حُر کا۔ اِس سلسلے میں معروف فکشن نگار ڈاکٹر خالد جاوید اپنے ایک مضمون بعنوان 'انیس کے منظر نامے کا ایک وجودی کردار' میں لکھتے ہیں:

''انیس کی کردار نگاری کے جوہر بھی دَراصل منظر نامے سے ہی کھلتے ہیں۔ اُن کے یہاں کردار کی تشکیل، اُس کا ارتقا اور اُس کے تمام تخلیقی امکانات بیانیہ میں نہیں بلکہ منظر نامے میں نظر آتے ہیں۔''

(رسالہ جامعہ، جلد نمبر 100، جولائی-دسمبر، 2003)

میرے خیال سے یہ منظر نامہ ایک ڈرامائی کیفیت میں سمایا ہوا ہے۔ ارسطو نے یونانی المیوں کے حوالے سے کتھارسس (تزکیہ نفس یا طہارت نفس) کا جو تصوّر پیش کیا تھا اُس کے مطابق المیے کا ہیرو شجاعت، بہادری، ذہانت اور حسن کا مرکز تو ہوتا ہی ہے اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک بڑے مقصد کے لیے اپنی قربانی بھی دیتا ہے۔ یوں اگر ہم دیکھیں تو تمام مرثیوں میں طہارتِ نفس کا یہ پہلو بدرجۂ اتم موجود ہے اور اُردو میں مثنوی کو چھوڑ کر دوسری ایسی کوئی صنف سخن نہیں جس میں ڈرامائی کیفیت یا ڈرامے کی حرکیات سے اتنا زیادہ کام لیا گیا ہے جتنا کہ مرثیے میں ہمیں نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر خالد جاوید اپنے مذکورہ بالا مضمون میں آگے لکھتے ہیں کہ:

''حُر کا کردار انیس کے مرثیے کا ایک وجودی کردار نظر آتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو اُس عہد میں نہ صرف دوسرے مرثیہ نگار کے یہاں بلکہ کسی دوسری صنف سخن میں بھی ایسے کردار کا تصور ممکن نہ تھا... انیس کا کارنامہ یہی ہے کہ یہ مرثیہ اس کردار کے حوالے سے بہت اہم قرار پاتا ہے بلکہ یہ مذہبی اور تاریخی کردار (حُر) اُردو کی کلاسیکی شاعری کا بھی ایک ناقابل فراموش کردار بن جاتا ہے۔'' (رسالہ جامعہ، جلد نمبر 100، جولائی-دسمبر، 2003)

جنگ کرتے ہوئے جب حُر زخمی ہو کر زمین پر گر پڑتے ہیں تو اس وقت کا منظر اور ان کے درمیان گفتگو ملاحظہ کیجیے۔

نیم وا چشم سے، حُر نے رُخِ مولا دیکھا
زیرِ سر، زانوئے شبیر کا تکیہ دیکھا
مُسکرا کر، طرفِ عالمِ بالا دیکھا
شہ نے فرمایا کہ اے حُرِ جری کیا دیکھا؟
عرض کی، حُسنِ رُخِ حور نظر آتا ہے
فرش سے عرش تلک نور نظر آتا ہے

باغِ فردوس دکھاتا ہے مجھے اپنی بہار
صاف نہریں ہیں رواں، جھوم رہے ہیں اشجار
شاخوں سے، میری طرف بڑھتے ہیں میوے ہر بار
حوریں لاتی ہیں جواہر کے طبق بہر نثار
ہے یہ رضواں کی صدا، دھیان کدھر تیرا ہے؟
دیکھ اَے شاہ کے مہمان! یہ گھر تیرا ہے

قبلہ رو کیجیے لاشہ میرا اے قبلۂ دیں!
پڑھیے یاسین کے اب دم باز پسیں
کوچ نزدیک ہے، اے بادشہ عرش نشیں!
لیجیے، تن سے نکلتی ہے مری جانِ حزیں!
بات بھی، اب تو زباں سے نہیں کی جاتی ہے
کچھ اُڑھا دیجیے مولا! مجھے نیند آتی ہے

حُر کو ایک وجودی کردار ثابت کرتے ہوئے ڈاکٹر خالد جاوید نے اپنے مضمون میں حُر کی شہادت کو ایک انفرادی موت سے تعبیر کیا ہے اور بقول ان کے دراصل یہ اپنے وجود کا عرفان ہونے کے بعد کی موت ہے جو ایک نیند کی طرح ہے، نیند جو ایک ساتھ نشاط انگیز اور اُداس ہے''جب چپ چاپ چادر اوڑھنے کو جی چاہے تو یہ ایک انفرادی موت ہے جس کا اجتماعی تصور مرگ سے کوئی علاقہ نہیں۔''

کردار نگاری پر مختصر اظہار خیال کے بعد آیئے بات کرتے ہیں مکالمے کی۔ ڈرامے میں کرداروں کو اپنی ذات کی نمائندگی کرتے ہوئے خود اپنے افعال و مکالمات سے اپنی شخصیت کو اجاگر کرنا پڑتا ہے۔ کرداروں کی نفسیات اور جذبات کو نمایاں کر کے ان کی شخصیت کو موثر بنانے میں درجہ ذیل تین صورتیں معاون ہوتی ہیں۔ (1) کسی کردار کی دوسرے کردار سے گفتگو (2) کسی کردار کے بارے میں دو کرداروں کا اظہار خیال اور (3) واقعات اور ڈرامے کی اندرونی فضا سے کرداروں کی شخصیت پر روشنی پڑنا۔ کردار نگاری کے سلسلے میں وقار عظیم کا ایک قول اہمیت کا حامل ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''کردار کی گفتگو اور اس کی حرکات و سکنات سے جہاں ایک طرف کردار کی شخصیت اور اس شخصیت کے انفرادی پہلو ابھرتے اور اجاگر ہوتے ہیں، دوسری طرف ان ہی دو چیزوں سے ڈراما نگار اور بہت سے کام لیتا ہے۔ کردار اپنی باتوں میں اور اپنی حرکتوں سے پلاٹ کے چھپے ہوئے حصوں کی تکمیل کرتے جاتے ہیں، وہ انھیں دونوں چیزوں سے کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ یہی دونوں چیزیں ناظر کے اس انہماک (جو ڈراما دیکھنے کی بڑی ضروری شرط ہے) اور اس کے اس اشتیاق کو جس پر اچھی کہانی کا انحصار اور دار و مدار ہے، قائم رکھنے کا سب سے موثر وسیلہ ہیں، یہی دونوں چیزیں ارتقا کی ساری منزلیں طے کرنے میں پلاٹ کی راہ نما بنتی ہیں۔ اور ان ہی کے سہارے سے اس کی ابتداء اور اس کے نقطۂ عروج اور اس کے خاتمے میں صحیح قسم کا ربط تسلسل اور ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور یہی دونوں چیزیں اس مجموعی تاثر کو برقرار رکھنے کی خدمت انجام دیتی ہیں جو اچھے ڈرامے کا طرۂ امتیاز ہے''۔

کسی بھی ڈرامے میں مکالمے کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ یہ ڈرامے کا سب سے اہم جزو ہے مگر بعض دفعہ فکشن میں بھی اس سے کام لیا جاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مرثیہ جو کئی اصناف کی خوبی اپنے اندر سموئے ہوتا ہے، متعدد جگہ اس کی وجہ سے ایک متاثر کن فضا نظر آتی ہے جس سے واقعات کے بیان میں بھی کافی مدد ملتی ہے۔ مکالمے حرکت و عمل کو قوت بخشنے اور قصے کو آگے بڑھانے کے لیے ہوتے ہیں، ڈرامے میں مکالمے مختصر اور برجستہ ہوتے ہیں لیکن ان کے اختصار میں گہری معنویت موجود ہوتی ہے۔ ایسے مکالمے ڈرامے کی کامیابی کے ضامن ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں پروفیسر محمد حسن اپنی کتاب 'ادبیات شناسی' میں لکھتے ہیں:

''مکالمے تین صورتوں سے خالی نہیں ہوتے اور اگر وہ ان تینوں میں سے کوئی شرط بھی پوری نہ کرتے ہوں تو ڈرامے میں ان کی گنجائش نہیں۔ یا تو مکالمہ کہانی کو آگے بڑھاتا ہو۔ یا کردار کے کسی پہلو کو واضح اور اس میں تبدیلی یا ارتقا ظاہر کرتا ہو یا فضا پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہو۔''

مکالمے ڈرامے کی جان ہوا کرتے ہیں۔ اس لیے مکالمے لکھتے وقت بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے، ورنہ مکالمہ نگاری بے جان اور بے اثر ہو جاتی ہے: مثلاً مشکل زبان اور اُلجھے ہوئے فقرے، بے موقع اور بے ربط اور ایسا اسلوب و ادا جو کردار اور ماحول کے لیے مناسب نہیں ہوتے مکالمے کے لیے معیوب سمجھے جاتے ہیں۔ اسی طرح طویل فقرے اور جا بجا واعظانہ پند و نصیحت کا انداز یا خود کلامی کی بہتات یا طویل خود کلامی وغیرہ بھی مکالمے میں عیب کا باعث ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس مناسب و موزوں نیز سلیس و فصیح زبان کا استعمال: برمحل، برجستہ، اور چست فقرے جو سلاست اور فصاحت کے آئینہ دار ہوں اور سادہ و مختصر گفتگو جو عام فہم ہونے کے ساتھ موقع و محل کے لحاظ سے مناسب ادائیگی کے قابل ہوں مکالمے میں حسن پیدا کرتی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مراثی انیس میں بے شمار ایسے موثر مکالمے موجود ہیں۔ مثال کے طور پر میر انیس کے مرثیوں کے چند بند ملاحظہ کیجیے۔

اُٹھے یہ شور سن کے امام فلک وقار
ڈیوڑھی تک آئے، ڈھالوں کو روکے رفیق و یار
فرمایا مُڑ کے، چلتے ہیں اَب بہرِ کارزار
کمریں کسو جہاد پہ، منگواؤ راہوار
دیکھیں فضا بہشت کی، دل باغ باغ ہو
اُمّت کے کام سے، کہیں جلدی فراغ ہو

بولے قریب جا کے، شہ آسماں جناب
مضطر نہ ہو، دعائیں ہیں تم سب کی مستجاب
مغرور ہیں، خطا پہ ہیں یہ خانماں خراب
خود جا کے دکھاتا ہوں ان سب کو رہِ صواب
موقع نہیں بہن، ابھی فریاد و آہ کا
لاؤ تبرکات، رسالت پناہ کا

بی بی زینب کی عون و محمد سے گفتگو کا ایک انوکھا انداز ملاحظہ کیجیے۔

کرتے تھے دونوں بھائی کبھی مشورے بہم
آہستہ پوچھتے کبھی ماں سے وہ ذی حشم
کیا قصد ہے علی ولی کے نشان کا؟
اماں! کسے ملے گا علَم نانا جان کا؟

زینب نے تب کہا، کہ تمھیں اِس سے کیا ہے کام؟
کیا دخل مجھ کو؟ مالک و مختار ہیں امام
دیکھو نہ کیجو بے اَدَبانہ کوئی کلام!
بگڑوں گی میں، جو لوگے زباں سے علم کا نام
لو جاؤ بس کھڑے ہو الگ، ہاتھ جوڑ کے
کیوں آئے تم یہاں علی اکبر کو چھوڑ کے

سر کو، ہٹو، بڑھو، نہ کھڑے ہو علَم کے پاس
ایسا نہ ہو کہ دیکھ لیں، شاہِ فلک اَساس
کھوتے ہو اور، آئے ہوئے تم مرے حواس
بس! قابلِ قبول نہیں ہے یہ التماس
روئے لگوگے پھر، جو برا یا بھلا کہوں
اس ضد کو بچپنے کے سوا اور کیا کہوں؟

مراثی انیس کے مذکورہ بالا مختلف بند میں جو مکالمے پیش کیے گئے اسے مکالمہ نگاری کی بہترین مثال قرار دی جا سکتی ہے۔ مکالمے کے ساتھ ساتھ انیس کے بیشتر مرثیوں میں منظر نگاری کی بھی بہت عمدہ مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً جنگ کے روز وہاں کے حالات کا نقشہ کس طرح کھینچا گیا ہے، اس بند میں ملاحظہ کیجیے۔

گرمی کا روز جنگ کی، کیوں کر کروں بیاں؟
ڈر ہے کہ مثلِ شمع نہ جلنے لگے زباں
وہ لُوں کہ الحذر، وہ حرارت کہ الاماں
رن کی زمیں تو سرخ تھی، اور زرد آسماں
آبِ خنک کو خلق، ترستی تھی خاک پر
گویا ہوا سے آگ برستی تھی خاک پر

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مراثی انیس میں ڈرامے کے بہت سے عناصر مشترک ہیں۔ اخیر میں پروفیسر شارب ردولوی صاحب کی بات پر میں اپنی گفتگو ختم کرتا ہوں کہ'' رثائی ادب بالخصوص منظوم رثائی ادب جو ہمارے ادب کا بڑا وقیع حصہ ہے وہ سمٹتا جا رہا ہے۔ رثائی ادب کی تخلیق ہو یا فروغ دونوں کا معاملہ زبان کی تعلیم اور اصناف میں اس کی تدریس سے وابستہ ہے جس کی طرف توجہ زبان اور رثائی ادب دونوں کے تحفظ کی ضمانت ہوگی۔''

■

Dr. Jawaid Hassan
Guest Teacher, Department of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025
Mob.: 9718483089

سید علیمین علی حق

مفتی صدرالدین خان آزردہ کی

مذہبی، ادبی اور قومی خدمات

ہندوستان مختلف مذاہب کی آماجگاہ رہا ہے، جہاں مذہبی عقائد کا عمل دخل دیکھا جاتا رہا ہے، مذہب وہ شے ہے جس کی بنیاد پر حکومتیں تشکیل پاتی ہیں اور منہدم کردی جاتی ہیں، جس بات کو انگریزوں نے نہیں سمجھا اور ہندوستانیوں کے مذہبی جذبات کو پارہ پارہ کرنا شروع کردیا۔ انگریزوں کے تئیں نفرت پیدا ہونے کا ایک اہم سبب یہ تھا کہ بنگال کے دمدم اور بارک پور میں سور اور گائے کی چربی سے آلودہ کارتوس سپاہیوں کو دیے جاتے تھے اور کارتوس کو بندوقوں میں ڈالنے کے لیے دانتوں سے کاٹنا پڑتا تھا، جس سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی جذبات مجروح ہوئے اور ہندو مسلم سپاہیوں نے متحدہ طور پر مخالفت کرتے ہوئے مذہب کے منافی قرار دیا۔ سپاہیوں نے کارتوس استعمال کرنے سے انکار کیا تو انگریزوں نے کسی وضاحت کی ضرورت نہیں سمجھی اور سپاہیوں کو بیڑیاں پہنا کر زندان میں ڈال دیا۔ سیدھے سادے ہندوستانیوں پر انگریزوں نے قطعی مروت نہیں کی اور لوگوں کو سزا دی گئی جب کہ ان لوگوں نے بے پناہ قربانیاں دی تھیں۔

غدر کے خوں چکاں واقعات ہندوستانیوں کے لیے بربادی کا پیغام لے کر آئے تھے لیکن ملک کا ہر ایک فرد متحد اور انگریزوں کے خلاف سینہ سپر تھا، کسی بھی مذہب وملت کی کوئی تفریق نہیں تھی، اس بغاوت نے پورے شہر کو اپنی زد میں لے لیا اور راتوں رات متعدد فرنگی موت کی آغوش میں جاچکے تھے، اس واقعے نے انگریزوں کی نیند حرام کر دی۔ دو مجاہدین منگل پانڈے اور ایشوری پانڈے نے انگریزوں پر حملہ کردیا جس کے بعد منگل پانڈے کو گرفتار کرکے سزائے موت دی گئی۔ یہ وہ واقعات تھے جس نے باغیوں کو ردعمل پر مجبور کردیا۔ باغیوں نے دریائے جمنا کو کشتیوں سے پار کیا اور کلکتہ دروازے سے فصیل بند شہر میں داخل ہوئے۔ دوپہر ہوتے ہوتے متعدد انگریز اور دیگر یورپی ان کی بندوقوں اور تلواروں کا نشانہ بن چکے تھے کئی ہندوستانیوں کو پھانسی کی سزا دے دی گئی۔

انہی دردناک ماحول کے پیش نظر علمائے کرام کے وفد نے بہادر شاہ ظفر سے ملاقات کی اور جنگ آزادی کا منصوبہ تیار کیا۔ 1857 میں انگریزوں کے خلاف ایسی جنگ لڑی گئی کہ ایوان فرنگ لرزہ براندام ہوگیا، جس کی گونج پورے برصغیر میں سنی گئی۔ ملک کی فلاح و بہبود اور ترقی میں علمائے کرام کا کردار کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا، ملک کے تئیں علما کے خلوص اور حب الوطنی کا عالم یہ تھا کہ انگریز قابض بھی نہیں ہوئے تھے کہ انھوں نے انگریزوں کے ناپاک ارادوں کی ناکامیوں کے لیے تیاریاں شروع کردی تھیں۔ آزادی کے لیے ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی اور خصوصاً علمائے کرام نے مل کر انگریزوں سے جنگ کی، اس بات سے انحراف نہیں کیا جاسکتا ہے کہ 60 فیصد سے زائد علمائے کرام کی قربانیاں ہندوستان کی آزادی میں شامل ہیں، جو تاریخ کے اوراق میں عیاں ہیں۔

انہی علما میں ہمہ جہت اوصاف اور فضل وکمال کے مالک مفتی صدرالدین آزردہ تھے۔ انھوں نے سیاست، مذہب، حکومت اور بہترین انتظامی صلاحیتوں کی اعلیٰ مثالیں پیش کی تھیں اور قوم کی تعمیر وترقی کے ساتھ ساتھ مذہبی مقامات کے محافظ بھی ثابت ہوئے تھے، اگر وہ نہ ہوتے تو غالباً جامع مسجد کے بھی کچھ وہی حالات ہوتے جو انگریزوں نے شاہ جہاں کے ذریعے 1650 میں تعمیر کردہ مسجد اکبر آبادی کا کیا تھا۔ مفتی صدرالدین آزردہ کے آبا و اجداد کشمیری تھے، آپ دہلی میں پیدا ہوئے۔ 18ویں اور 19ویں صدی میں جن عظیم علمائے کرام سے دلی کی علمی وادبی اور مذہبی محفل آباد تھی اور پورے ہندوستان میں جن خانوادوں کے علم کا ڈنکا بج رہا تھا، انھیں میں لطف اللہ کشمیری کے خانوادے کو بھی بڑی اہمیت حاصل تھی۔ لطف اللہ کشمیری کے جد اعلیٰ خواجہ بہاء الدین خوارزمی فاروقی مغل دورِ حکومت کے عہد اکبری میں دہلی آئے اور یہیں بس گئے۔ صاحب کشف وکرامت خیرالدین ابوالخیر بھی انھیں کی اولاد میں سے تھے۔ مولانا فخرالدین جیسی عظیم ہستی بھی اسی خاندان میں پیدا ہوئی اور انھیں کے بھائی لطف اللہ کشمیری کے گھر مفتی صدرالدین آزردہ جیسے ماہر فن اور جید عالم دین پیدا ہوئے۔

آزردہ کی پیدائش 1204 ہجری 12 دسمبر 1789 میں پرانی دہلی کے چتلی قبر علاقے میں ہوئی۔ آزردہ کو بیک وقت کئی علوم میں دسترس حاصل تھی۔ صرف ونحو، منطق وفلسفہ، معانی و بیان، ادب وانشا، فقہ وحدیث اور تفسیر واصول وغیرہ میں آپ ید طولیٰ رکھتے تھے۔ مفتی آزردہ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد لطف اللہ کشمیری سے حاصل کی اور علم منقولات کے لیے خانوادہ ولی اللہ کی طرف رجوع کیا۔ حضرت شاہ عبدالعزیز، حضرت شاہ عبدالقادر اور حضرت شاہ رفیع الدین آپ کے علوم نقلیہ کے اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں اور معقولات کا درس آپ نے استاذ مطلق علامہ فضل حق خیرآبادی کے والد علامہ فضل امام فاروقی خیرآبادی سے لیا۔ شاہ عبد العزیز (1239 / 1824) اور فضل امام خیرآبادی (1244 / 1829) کے گھرانے۔ اس دور میں دو بڑی درس گاہیں تسلیم کی جاتی تھیں اور دہلی و اطراف ہی نہیں بلکہ ہندوستان بھر کے طلبا یہاں آکر ان سے شرف تلمذ حاصل کرتے تھے۔ مفتی صدرالدین آزردہ 1827 سے 1844 تک صدر امین اور 15 جون 1844 سے 1857 صدر الصدور دہلی کے عہدے پر فائز تھے، یہ بات غور طلب ہے کہ انگریزوں کے ذریعے ہندوستانیوں کو دیا جانے والا یہ سب سے بڑا عہدہ تھا، جس پر آزردہ فائز تھے۔ آزردہ نے اپنے خانوادے کی وراثت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا، وہ بھی

تازندگی درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ان کی سخاوت کافی مشہور تھی، جس محفل میں ہوتے میر کارواں ہوتے اور اپنے شاگردوں کے لیے وہ محض استاذ نہیں بلکہ ان کے والدین کا کردار نبھایا کرتے۔مورخین لکھتے ہیں کہ جامع مسجد دہلی میں واقع مدرسہ دارالبقا کے طلبا کو مفتی آزردہ وظیفہ دیا کرتے تھے۔اتنا ہی نہیں مولوی بشیر الدین احمد دارلبقا اور آزردہ کی سخاوت کے حوالے سے رقم طراز ہیں۔

''مسجد کے جنوبی دروازے کی طرف دارالبقا کا دارالعلوم تھا۔اگلے زمانے میں اس میں طالب العلم رہتے تھے اور معقول ومنقول پڑھا کرتے تھے۔ یہ مدرسہ اسی زمانے میں بالکل خراب و برباد ہوکر ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ مولوی صدرالدین خاں صاحب صدر الصدور نے اپنی عالی ہمتی سے بصرف زرخطیر اس کو مرتب کیا اور شاہجہانی طور پر جو جو حجرے اس کے ٹوٹ گئے تھے ان کو نئے سرے سے بنوایا تھا۔طلبا کی خبرگیری خود فرماتے تھے۔ دارالشفا اور دارالبقا بہت پہلے ہی سے خستہ حالت میں تھیں۔غدر 57 کے بعد یہ دونوں عمارتیں گرا کر صاف میدان کردیا گیا، یہ دونوں عمارتیں بھی مسجد کے ساتھ ہی ساتھ بنی تھیں۔'' (واقعات دارالحکومت، جلد دوم، ص 113)

مفتی صدرالدین کو بطور مجاہد آزادی یاد کیا جاتا رہے گا، آزردہ نے تمام صعوبتیں برداشت کیں لیکن پیشانی پر شکن تک نہیں آنے دیا۔دہلی میں علامہ فضل حق خیرآبادی اور مفتی صدرالدین آزردہ غدر کی جنگ میں مجاہدین کی قیادت کررہے تھے۔مرادآباد میں مفتی کفایت علی کافی، آگرہ میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی ومولانا احمداللہ مدراسی، روہیل کھنڈ میں مفتی عنایت احمد کاکوروی اور مولانا رضا علی خاں بریلوی مجاہدین آزادی کے قائد ورہنما تھے۔ان علما نے دہلی کی جامع مسجد سے بیک وقت انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ جاری کیا جس کے نتیجے میں مسلمان اس جنگ کو اپنا مذہبی فریضہ سمجھتے ہوئے لڑے۔

جنرل بخت خاں روہیلہ نے جنگ کا بگل پھونکا تو دہلی میں بھی علما نے انگریزوں کے خلاف ایک فتویٰ جہاد جاری کیا، اس فتوی جہاد پر مفتیان کرام کے دستخط تھے، جن میں مفتی صدرالدین آزردہ بھی شامل تھے۔فتویٰ جہاد اخبارالظفر دہلی سے صادق الاخبار دہلی نے نقل کرکے مورخہ 26 جولائی 1857 میں شائع کیا۔یہ اخبار نیشنل آرکائیوز میں محفوظ ہے۔صدرالصدور دہلی مفتی صدرالدین آزردہ کو عہدہ صدرالصدور سے برطرف کردیا گیا، جائداد ضبط کرلی گئی، آپ کی ذاتی لائبریری جس میں تقریباً تین لاکھ روپیوں کی کتابیں تھیں، برباد کردی گئی۔آزردہ پر غم والم کے یہ پہاڑ 1273ھ میں ٹوٹے۔لیکن مفتی آزردہ کے ہمدرد پنجاب کے کمشنر جان لارنس نے تمام جرم سے انھیں بری کردیا۔

جنگ آزادی ہند 1857 کے دوران، مفتی صدرالدین آزردہ لال قلعے میں بہادر شاہ ظفر سے ملنے جاتے رہے اور انقلابی مجاہدین ہدایات اور مشاورت کے لیے ان کے گھر آتے تھے۔آزادی ہند 1857 کے ہنگامے کے بعد نصف جائداد ضبط ہوگئی۔مفتی صدر الدین آزردہ عرصہ دراز تک حوالات میں قید رہے بعد میں رہائی ملی لیکن عہدے سے بھی برطرف کردیے گئے۔

آزردہ اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔شعر وسخن کا سلسلہ جوانی سے ہی شروع ہوچکا تھا۔اردو میں پہلے شاہ نصیر سے اصلاح لی اور آخر میں میر نظام الدین ممنون اور مجرم مرادآبادی سے مشورۂ سخن کیا کرتے تھے۔افسوس کی بات یہ ہوئی کہ کلام دیوان کی صورت میں مرتب نہیں ہوا۔آزردہ نے شعرائے اردو کا ایک تذکرہ بھی لکھا تھا، جواب ناپید ہے۔ریختہ اور دیگر کتابوں میں موجود ان کے نمونۂ کلام سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ شاعری میں ثقیل الفاظ لانے کے قائل نہیں تھے۔ان کی شاعری کا اسلوب نہایت ہی شستہ اور سہل ہے۔

اس درد جدائی سے کہیں جان نکل جائے
آزردہ! مرے حق میں ذرا تو بھی دعا کر

ان کا دوسرا شعر دیکھیں۔

وہ اور وصل کا قاصد نہیں نہیں
سچ سچ بتا یہ لفظ انہی کی زباں کے ہیں

مفتی صدرالدین آزردہ سے مرزا غالب کے دوستانہ مراسم تھے، غالب کے خطوط میں آزردہ کا ذکر مختلف حالات میں پڑھا جاسکتا ہے۔دونوں کے درمیان نوک جھونک بھی خوب ہوا کرتی تھی، کچھ باتیں اکثر نقل کی جاتی ہیں۔ غالب کی شاعری میں بھاری بھرکم اصطلاحات کے استعمال پر وہ انھیں پسند نہیں کرتے تھے، مگر دونوں کی رغبت کا عالم یہ تھا کہ ایک دفعہ جب مقروض غالب پر ادائیگی کے مطالبات بڑھے تو آزردہ نے غالب کے قرض کی ادائیگی کی اور غالب کو بچالیا۔کچھ ایسا ہی رویہ غالب کا تھا، شیفتہ تذکرہ مرتب کررہے تھے اور آزردہ کا ذکر نہیں کیا، لیکن غالب نے ان کی توجہ مرکوز کرائی اور تذکرۂ شیفتہ میں آزردہ شامل ہوئے۔

بدقسمتی سے ان کی تمام شاعری فسادات اور تباہی کی نذر ہوگئی۔اب ان کی شاعری کا ذکر صرف مختلف تذکروں میں ملتا ہے۔منشی ذکاءاللہ دہلوی لکھتے ہیں:

''دہلی کی جامع مسجد جو شہر کی تمام مسجدوں کی ناک تھی انگریزوں نے ایسے نکما بنادیا کہ سپاہ کی بیرک اس کو بنایا۔اس میں پیشاب پاخانہ سے پرہیز نہ کیا۔سکھوں نے سُور ذبح کرکے پکائے۔کتے جو انگریزوں کے ساتھ تھے وہ درگاہ شریف میں پڑے پھرتے تھے۔''

(تاریخ عروج انگلشیہ)

دہلی کی فتح کے بعد انگریز فوج نے شہری آبادی سے خوف ناک انتقام لیا۔لوگوں کو بے دریغ قتل کیا۔سیکڑوں کو پھانسی پر چھڑھا دیا گیا۔ ہزاروں نفوس گولیوں سے اڑا دیے گئے۔ بہت سے مقتدر اور متمول مسلمانوں کی جائدادیں تباہ ہوگئیں اور اقتصادی حالات اس قدر خراب ہوئے کہ ایک وقت کی روٹی بھی نصیب نہیں ہوتی۔مفتی صدرالدین آزردہ کے نامکمل کاموں اور ان کے نظریات کو ان کے شاگردوں نے فروغ دیا۔نواب یوسف علی خان والی رام پور، نواب صدیق حسن خان رئیس بھوپال، مولانا ابوالکلام کے والد مولانا خیر الدین، مولانا فیض الحسن خاں اور سرسید احمد خان وغیرہ جیسے مشاہیر ان کے شاگردوں میں سے تھے۔اگست 1858 میں برطانوی پارلیمنٹ نے اعلان کرکے ملکہ وکٹوریہ کے ذریعے ایسٹ انڈیا کمپنی کا خاتمہ کیا اور ہندوستان کو تاج برطانیہ کے سپرد کردیا۔اس جنگ کے بعد خصوصا مسلمان زیر عتاب آئے۔ یوں مسلمانوں پر جدید علم کے دروازے بند کردیے گئے اور مسلمان جدید علوم وفنون سے محروم کردیے گئے۔ آزردہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔ان کے کلام سے محبوب الٰہی نظام الدین اولیا کے تئیں احترام ظاہر ہے۔آزردہ اپنے ایک شعر میں لکھتے ہیں۔

نہ چھوڑیں گے محبوب الٰہی کے در کو
نہیں گو ہم اس آستانے کے قابل

مفتی صدرالدین آزردہ فالج کے مرض میں مبتلا ہوکر 81 برس کی عمر میں 16 جولائی 1868 (24 ربیع الاول 1285 ہجری) کو دنیائے فانی سے رخصت ہوگئے اور درگاہ حضرت چراغ دہلیؒ کے صحن میں دفن کیے گئے۔آزردہ نے لاڈو بیگم سے شادی کی تھی مگر لاولد تھے، البتہ انھوں نے اپنی اہلیہ کے بھانجے محمد احسان الرحمٰن خان کو گود لیا تھا۔

کتابیات

1 تذکرۂ آزردہ، مولفہ: مفتی صدرالدین آزردہ، مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد، انجمن ترقی اردو پاکستان، 1974
2 مفتی صدرالدین آزردہ: عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، جولائی 1977
3 واقعات دارالحکومت دہلی، بشیرالدین احمد، اردو اکادمی دہلی 1919

Syed Ainain Ali Haque
B-91, Second Floor, Hayat Enclave Loni
Ghazibad - 201102
Mob.: 9268506925
Email.: alihaq_ainain@yahoo.com

آصف مبین

علمِ ماحولیات اور اردو کا ثانوی نصاب تعلیم

علم ماحولیات کی حیثیت ایک لازمی اور ناگزیر علم کی ہے۔ ایک مستقل سائنس کے طور پر متعارف ہونے سے قبل اور قومی تعلیمی پالیسی 1986 کے نفاذ سے پہلے بھی یہ علم متفرق عنوانات پر اسباق کی شکل میں ہماری تعلیم کا حصہ رہا ہے۔ ابتدائی اور ثانوی درجات کے لیے زبان و ادب کی کتابوں میں: موسم، کھیتی باڑی، جھیل تالاب اور ہمارے اطراف پائے جانے والے زندگی کے دیگر عنوانات پر مضامین اور نظمیں 'علمِ ماحولیات' کا حصہ رہے ہیں۔ مولوی اسماعیل میرٹھی صاحب کی ریڈریں، اس باب میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہیں۔ اپنی ادبی حیثیت کے ساتھ ساتھ! ان کتابوں میں ایک معتد بہ حصہ گاؤں، دیہی زندگی اور اُس کی مصروفیات پر مشتمل ہوا کرتا تھا۔ واضح رہے کہ ملکی پیمانے پر نصاب کی تیاری اور اس کے لیے کتابوں کی فراہمی کے ذمے دار مقتدر ادارے این. سی. ای. آر. ٹی. نے تیسری، چوتھی اور پانچویں جماعت کے نصاب میں علمِ ماحولیات کو 'آس پاس' کے نام سے شامل کیا ہے۔ لیکن حیرت ہے کہ چھٹی سے بارہویں جماعت تک اس کا کہیں پتا نہیں چلتا۔ اس کا ایک سادہ جواب تو یہ ہے کہ علوم اور اُن پر مبنی مضامین بڑھتے جاتے ہیں، لہٰذا تمام مضامین کو نصابِ تعلیم میں کھپانا بھی ایک کارے دارد والی بات ہے۔ لیکن اس مشکل کا ایک حل یہ ہوسکتا ہے کہ آمدہ موضوعات کو پہلے سے موجود متعلقہ مضامین میں جوڑا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر علم ماحولیات کو سائنس، جغرافیہ، ادب اور کسی حد تک تاریخ کے مضامین میں بسہولت داخل کیا جاسکتا ہے (تاریخ کے مضمون میں حیوانات، نباتات اور جمادات کے مطالعۂ زندگی کے نام سے)۔ اس پس منظر میں بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اگر علمِ ماحولیات کو لازمی یا اختیاری مضمون کے بجائے مثلاً زبان کے نصاب میں توجیہی اسباق کے رُوپ میں شامل کردیا جائے تو نصاب کا بوجھ بھی کم ہوجائے گا اور 'ہماری زبان' میں 'ہمارا ماحول' بھی شامل ہوجائے گا۔ اسی خیال کے تحت این. سی. ای. آر. ٹی. سے شائع درجہ پنجم، ہشتم، نہم اور درجہ دہم یا ہائی اسکول میں زبانِ اُردو کے نصاب پر نظر ڈالی گئی ہے۔

سائنس اور ٹکنالوجی کے طفیل انسان نے زندگی کے مختلف شعبوں میں شاندار ترقی کی جس کی وجہ سے انسان کو آج اس قدر سہولتیں حاصل ہوگئی ہیں جن کا وہ چند دہائیوں قبل تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ لیکن اس شاندار ترقی کے جہاں بہت سارے مثبت پہلو ہیں وہیں کچھ منفی پہلو بھی ہیں۔ اُن میں سب سے اہم ہے ماحولیاتی عدم توازن۔ حالیہ برسوں میں ماحولیاتی عدم توازن کے نتیجے میں عالمی درجۂ حرارت میں اضافے، بالائے بنفشی شعاعوں سے محفوظ رکھنے والی اوزون پرت میں شگاف، موسموں کی ناوقت تبدیلی اور مختلف قسم کی آلودگیوں کی وجہ سے، بے شمار مسائل اور نت نئی بیماریوں نے جنم لیا ہے۔ شہر کاری (Urbanization) میں غیر منضبط پھیلاؤ اور قدرتی ذرائع کے استعمال میں توازن کی کمی کی وجہ سے بیسویں صدی میں دنیا کے آدھے سے زیادہ سبز خطے اپنے قیمتی وسائل سمیت معدوم ہوگئے۔ اہلِ دانش اور خاص کر انسانی مستقبل کے تعلق سے فکرمندی رکھنے والے سائنس دانوں نے اس بات سے آگاہ کیا ہے کہ آسائش اور لذت کوشی کی تلاش میں فطری وسائل کے اندھادھند استعمال نے زمین پر موجود حیاتی تنوع (Biodiversity) اور ماحولیاتی نظام (Ecosystem) دونوں کی بقا اور وجود پر سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔ ماحول کی یہ ٹوٹ پھوٹ اُس گھر کی ٹوٹ پھوٹ ہے جس میں نوعِ انسانی کے ساتھ ساتھ حیوانات، نباتات، جمادات اور فضائی زندگی کی ایک وسیع دُنیا آباد ہے۔ علمِ ماحولیات کی اہمیت اور ماحولیاتی آلودگی کے برے اثرات کی نشاندہی کی خاطر مثالاً ایک آلودہ کار [Pollutant] 'مصنوعی روشنی' کے نقصانات کی طرف درج ذیل پیراگراف میں اشارہ کیا گیا ہے۔

''زندگی، لاکھوں سال سے زمین پر روز و شب کے اُس منضبط نظام کے سہارے چل رہی تھی، جو نباتات اور حیوانات کی طبیعت میں رچ دیا گیا ہے۔ پودے اور جانور دن و رات کے اسی چکر کے تحت روزمرہ کے معمولات مثلاً خوراک کا حصول، تولید، نشوونما، نیند اور شکاریوں سے بچاؤ، جیسے اعمال کو انجام دیتے ہیں۔ لیکن انسانوں

کے ذریعے رات میں کی جانے والی روشنی اس قدرتی چکر کو سخت نقصان پہنچا رہی ہے۔ شکاری جاندار شکار کرنے کے لیے روشنی کا اور شکار اپنے بچاؤ کے لیے تاریکی کا سہارا لیتے ہیں۔ اس روشنی کی وجہ سے اندھیرے میں زندگی بتانے والی مخلوقات کی زندگی خطرات میں پڑگئی ہے۔

(اس پیراگراف کے لیے ویب سائٹ /www.darksky.org light-pollution پر موجود مضمون Light Pollution Effects on Wildlife and Ecosystems سے مدد لی گئی ہے۔)

اطالوی وامریکی سائنسدانوں کے ذریعے پیش کیے گئے آلودگی کے عالمی اشاریے کے مطابق؛ رات کے وقت ہونے والی روشنیوں کے باعث، دنیا کی ایک تہائی آبادی کی نگاہوں سے کہکشاں اوجھل ہوگئی ہے۔ اور یہ صرف شب ماہتاب کے نظارے کی بات نہیں، نوری آلودگی کی وجہ سے؛ آنکھوں میں چندھیاہٹ اور فضا میں چمک کا اضافہ ہوا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں، مصنوعی روشنی کی کثرت نے فضا میں ایک چمکیلی چادر تان دی ہے جو رات میں نظر آنے والے تاروں کو اوجھل کررہی ہے۔ نوری آلودگی نے انسانوں سے رات کے آسمان کا حسن ہی نہیں، بہت کچھ چھینا ہے۔ اس آلودگی نے نہ صرف بری نظامِ حیات بلکہ سمندری زندگی کو بھی بری طرح متاثر کیا ہے۔ مصنوعی اُجالے کی یہ کثرت جنگلاتی اور سمندری نظامِ زندگی کو اُلجھن میں ڈال کر اُن کی ہلاکت کا سبب بن سکتی ہے۔ ایک مثبت پہلو یہ ہے کہ ہم برقی آلودگی کو؛ ضرورت کے مطابق روشنی کو محدود یا بالکل ہی بجھا کر، کنٹرول کرسکتے ہیں، ختم کرسکتے ہیں۔ ورنہ حالت تو یہ ہے کہ شہری علاقوں کی فضا، آج سے دوسو برس قبل کے مقابلے سیکڑوں بلکہ ہزاروں گنا زیادہ چمکدار ہوچکی ہے اور ہم معاملے کی خطرناکی کا صرف اندازہ کرسکتے ہیں۔

(مختصر از رپورٹ، Chronicle, August-2016، صفحہ 54 ایڈیٹر N.N.Ojha)

علم ماحولیات:

ٹیلر (Taylor-1936) نے ماحولیات کی تشریح کرتے ہوئے اُسے حیاتی سائنس کی ایک ایسی شاخ بتایا تھا جو جاندار اجسام اور ان کے ماحول کے درمیان تعلقات کا مطالعہ کرتی ہے۔ (ماحولیاتی مطالعہ، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد) لیکن پچھلے دو دہوں سے علم ماحولیات نے ایک مستقل سائنس کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ اور آج اس کا مطالعہ اور تدریس اس نئی حیثیت میں جاری ہے۔ ماحولیات اور حیاتی تنوع کی بقا کے تئیں بیداری، قدر افزائی اور اُس کے مسائل کے حل میں تعلیم ایک بنیادی رُول ادا کرسکتی ہے۔ ہمارے تعلیمی نظام کو ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تینوں مرحلوں میں ماحول اور ماحولیات پر زور دینے کی ضرورت ہے۔ اگر یہ ہوجاتا ہے تو یقیناً یہ امید کی جاسکتی ہے کہ ماحول اور ماحولیاتی اشتراک (یہاں ماحولیاتی اشتراک سے مراد حیوانات، نباتات اور جمادات کے وہ افعال ہیں جنھیں وہ فطری ذمے داریوں کے تحت انجام دیتے ہیں) ترقی کریں گے اور یہ کوشش انفرادی اور اجتماعی ہر دو سطح پر وسائل کے مناسب ترین استعمال کے لیے قدروں اور رویوں کی تشکیل کرے گی۔

ماحولیات کے تئیں عالمی بیداری:

حیاتی تنوع پر خطرات اور اس کے تحفظ پر برازیل کے صدر مقام ریوڈی جنیرو (Rio De Janeiro) میں 1992 میں 'ماحول اور ترقی' پر 3 تا 14 جون ایک کانفرنس منعقد ہوئی جو ارض چوٹی کانفرنس (Earth Summit) کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کانفرنس میں 154 اقوام نے شرکت کی اور ایجنڈا 21 جاری کیا۔ ایجنڈے میں اور باتوں کے ساتھ مندرجہ ذیل شقیں بھی شامل تھیں:

1 عوام کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ صحت مند اور پیداواری زندگی گزاریں۔
2 ہر ملک کو قدرتی وسائل کو استعمال کرنے کی آزادی ہے۔
3 ماحولیاتی نظاموں جیسے سمندر، دریا وغیرہ کا تحفظ
4 زمینی وسائل کا تحفظ، جنگلات کی کٹائی کی روک تھام اور حیاتی تنوع کا تحفظ
5 جنگلات کو ترقی دینا اور اس کے تحفظ سے دنیا کو سبز دنیا میں بدلنا (ماحولیاتی مطالعہ ص 112)

جوہانسبرگ (جنوبی افریقہ) میں 26 اگست تا 4 ستمبر 2002 دوسری چوٹی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں قابل بقا ترقی (Renewable Energy) پر زور دیا گیا۔

(ماحولیاتی مطالعہ ص 113)

ماحولیاتی تعلیم ہندوستان میں:

ماحولیاتی شعور کو اُجاگر کرنے کے لیے ماحولیاتی تعلیم کی ضرورت کو ہندوستان میں بہت دیر سے محسوس کیا گیا۔ 1988 میں مہتا بمقابلہ مرکزی حکومت ہند کے مقدمہ میں سپریم کورٹ کی ہدایت کے بعد تمام سطحوں پر ماحولیات کی تعلیم کا آغاز کیا گیا۔ یہ ارادہ کیا گیا کہ بچپن سے ہی بچوں کو ماحولیات کا شعور دیا جائے۔ طلبہ کے ساتھ عوام میں بھی ماحولیاتی شعور کو بیدار کرنے کے اقدامات کیے جائیں نیز انھیں یہ بتایا جائے کہ وہ قدرتی وسائل سے بہتر

ہمارے تعلیمی نظام کو ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تینوں مرحلوں میں ماحول اور ماحولیات پر زور دینے کی ضرورت ہے۔ اگر یہ ہوجاتا ہے تو یقیناً یہ امید کی جاسکتی ہے کہ ماحول اور ماحولیاتی اشتراک (یہاں ماحولیاتی اشتراک سے مراد حیوانات، نباتات اور جمادات کے وہ افعال ہیں جنھیں وہ فطری ذمے داریوں کے تحت انجام دیتے ہیں) ترقی کریں گے اور یہ کوشش انفرادی اور اجتماعی ہر دو سطح پر وسائل کے مناسب ترین استعمال کے لیے قدروں اور رویوں کی تشکیل کرے گی۔

استفادہ کس طرح کر سکتے ہیں۔ اس طرح اقدار پر مبنی ماحولیاتی تعلیم طرز زندگی میں تبدیلی لائے گی۔ ماحولیات کی تباہی سے حاصل ہونے والی ترقی دراصل ہم سب کی تباہی ہے۔ کارخانوں اور گاڑیوں سے نکلنے والے دھویں کو کم کرنے کے لیے ہمیں دوبارہ فطری زندگی کی طرف لوٹنا (Back to Nature کا نعرہ) ہوگا۔

(ماحولیاتی مطالعہ، ص 83-82)

قومی تعلیمی پالیسی 1986 میں تعلیم کے سبھی مراحل کے طلبا کے بیچ ماحولیاتی شعور اور ماحولیات کے تحفظ کے تئیں بیداری پر زور دیا گیا ہے۔ نیشنل یونیورسٹی آف ایجوکیشنل پلاننگ اینڈ ایڈمنسٹریشن کے ذریعے 2013 میں شائع ایجوکیشنل ایڈمنسٹریشن (Educational Administration: Structure, Processes and Future Prospectus) میں تعلیمی پالیسی اور پروگرام ہیڈنگ کے تحت آٹھ بڑی اسکیمات گنائی گئی ہیں جو بالترتیب مندرجہ ذیل ہیں:

1 ضلعی ابتدائی تعلیمی پروگرام
2 سبھی کے لیے تعلیم، مہم
3 صلاحیت میں افزائش پروگرام
4 کستور با گاندھی گرلس اسکول
5 تعلیم بالغان
6 تعلیم حرفہ
7 اسکولی تعلیم میں ماحولیات کا تعارف
8 معذور طلبا کے لیے انٹیگریٹیڈ ایجوکیشن

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ 319 صفحات کی اس کتاب میں علم ماحولیات پر سوا اس ایک ذیلی عنوان اور قومی تعلیمی پالیسی کے ذکر کے کچھ بھی نہیں ہے۔

(Educational Administration by National University of Educational Planning and Administration-67-p40)

اُردو ثانوی نصاب تعلیم:

این. سی. ای. آر. ٹی. کی درجہ پنجم کی کتاب میں علم ماحولیات پر مستقل کوئی سبق نہیں البتہ ایک سبق جو مشہور شاعر اختر شیرانی کی نظم ہے 'دریا کنارے چاندنی' کے عنوان سے ہے۔ نظم میں چاندنی کے ظاہر ہونے، چھانے اور دریا کی لہروں پر منعکس ہونے کو بیان کیا گیا ہے۔ ٹھنڈی ہوا، اُجلی فضا اور رات کے سناٹے کا تذکرہ ہے۔ تیسرے بند میں بدلی آنے اور چاندنی کو چھپا لینے کا ذکر ہے جبکہ چوتھے اور آخری بند میں گجردم شاعر اپنے مسکن پر واپس آجاتا ہے اور نظم ختم ہوجاتی ہے۔ یہ سبق جیسا کہ کہا گیا 'علم ماحولیات' پر نہیں لیکن 'ماحول سے متعلق' ضرور ہے۔ (ابتدائی اُردو، برائے درجہ پنجم- 2012)

اگلی کتاب درجہ ہشتم کی ہے اور نومبر 2013 میں شائع ہوئی ہے۔ جونیر ہائی اسکول کی اس کتاب میں بھی کوئی مضمون براہ راست ماحولیات کی اہمیت پر نہیں، البتہ ماحول میں موجود قدرتی مظاہر میں سے ایک مظہر پر ہے۔ ایک سبق شاہنامۂ اسلام کے خالق حفیظ جالندھری کی نظم 'لو پھر بسنت آئی' ہے۔ سبق میں موسم بہار کی آمد، اور ماحول اور انسانی طبیعت پر اُس آمد کے اثر کو بیان کیا گیا ہے۔ اس سلسلے کا دوسرا سبق روش صدیقی کی نظم 'شبنم' ہے۔ شبنم کی حقیقی صورت گری میں شاعر نے خلاقانہ طبیعت کا مظاہرہ کیا ہے۔ شبنم کی ننھی بوندوں کو تارے، موتی، ہیرے اور رات کے آنسوؤں سے تشبیہ دے کر شاعر نے نظم کی لڑی میں الفاظ کے موتی پرو دیے ہیں۔

(اپنی زبان، برائے درجہ ہشتم- 2013)

درجہ نہم کی درسی کتاب میں ماحول سے متعلق محض ایک سبق عبدالحلیم شرر کا 'دیہاتی زندگی' کے نام سے ہے اور ماحولیات کے سلسلے میں ہندوستان کی دیہی زندگی جو نمائندہ کردار ادا کرسکتی ہے، اُس کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے۔ اسی درجے کی معاون درسی کتاب کا ایک سبق 'بدلی کا چاند' جو شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی کی نظم ہے، کو ماحول سے متعلق قرار دیا جاسکتا ہے۔

(نوائے اُردو، برائے درجہ نہم- 2013)

ایک عام آدمی کی نظر میں ماحولیاتی مسئلہ بھی ایک 'سائنسی مسئلہ' ہے جس پر سائنس داں بحث کرتے رہتے ہیں۔ اُس کے خیال میں یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس میں وہ دلچسپی لے یا جس پر غور وفکر کیا جائے۔ لیکن ذرا بتائیے کہ کیا ہم کو اس بات کی فکر نہیں ہے کہ آج کل کینسر کا مرض اتنی شدت کیوں اختیار کرگیا ہے، دل کے امراض کیوں عام ہورہے ہیں، لوگوں کو سانس کی تکلیف کیوں ہورہی ہے، موسموں کا چلن کیوں بگڑ گیا ہے، برسات کی وہ رُتیں اور جھڑیاں کیوں ختم ہوگئی ہیں، دریاؤں کا پانی گدلا اور کنوؤں کا پانی زہریلا کیوں ہوگیا ہے، تازہ ہوا کے وہ جھونکے کہاں چلے گئے کہ جو روح کو شاد کیا کرتے تھے، موتی کی طرح شفاف پانی کے وہ قدرتی چشمے کہاں کھو گئے جن کی تہہ کا حال اُوپر سے ہی نظر آجاتا تھا۔

یقیناً یہ ایسے مسائل ہیں کہ جن کا تعلق ہم سے اور ہماری فنا و بقا سے ہے۔ اور اب اگر یہ کہا جائے کہ ان تمام مسئلوں کا سیدھا واسطہ ہمارے بگڑتے ہوئے ماحول سے ہے تو کیا اب بھی آپ ماحولیاتی مسئلے کو محض ایک سائنسی مسئلہ کہیں گے؟ ("نوائے اُردو، برائے درجہ دہم- 2012)

علم ماحولیات کی تعریف کو ہائی اسکول کی سطح پر کچھ اس سادگی سے سمجھایا ہے:

''قدرت نے دنیا کی ہر چیز کو ضرورت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے جوڑ دیا ہے۔ یہاں ہر ایک چیز دوسری چیز کو کسی نہ کسی طرح متاثر کرتی ہے۔ اس آپسی تعلق کو سمجھنے اور سمجھانے کا نام 'ماحولیاتی سائنس' ہے۔'' (ایضاً)

اس کتاب میں علم ماحولیات پر مبنی اس مکمل سبق کے ساتھ نظموں کے کچھ اسباق بھی ماحولیات سے متعلق موجود ہیں۔ ان میں جوش ملیح آبادی کی نظم 'گرمی اور دیہاتی بازار' اور اختر شیرانی کی نظم 'او دیس سے آنے والے بتا' بھی شامل ہے جس میں دیہات کی سادہ اور محبت سے بھرپور زندگی کا نقشہ بے تکلف فطری انداز میں کھینچا گیا ہے۔ (ایضاً)

■

Mohd Mubeen Asif
J-68, B3, Flat-1, G/F, Abul Fazal Enclave
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi - 110025
Mob.:9990289656

محمد محسن رضا

تلوک چند محروم اور ادب اطفال

تلوک چند محروم بیسویں صدی کے شعری و ادبی منظر نامے پر ایک ایسا نام ہے جن کی تعریف اقبال جیسے شاعر نے بھی کی۔ لالہ کرم چند مدیر 'پارس' نے اقبال سے ایک بار مخزن میں شائع ہونے والے شعرا کے بارے میں دریافت کیا کہ آپ اپنے علاوہ کس کو بہترین شاعر مانتے ہیں تو اقبال نے جواب دیا 'جو سب سے اچھا تھا اس کا انتقال ہوگیا (اسی وقت سرور جہان آبادی کا انتقال ہوا تھا) اور موجودہ شعرا میں تلوک چند محروم ہی سب سے اچھا کہنے والا ہے۔' محروم بھی اقبال سے بہت عقیدت رکھتے تھے جب وہ یورپ سے لوٹ کر آئے تو محروم نے ان کے استقبال میں نظم بھی لکھی جو مخزن میں شائع ہوئی اور اقبال نے اسے دیکھ کر تلوک چند محروم کو تشکر نامہ بھی لکھا۔ [1]

تلوک چند محروم کی ولادت یکم جولائی 1887 کو دریائے سندھ کے کنارے ایک انتہائی پسماندہ گاؤں میں ہوئی۔ جب انھوں نے اپنی تعلیم کا آغاز کیا تو ایسے اسکول میں ان کا داخلہ ہوا جہاں کوئی لائبریری بھی نہیں تھی اور نہ شعر و ادب کا ذوق رکھنے والے اساتذہ تھے۔ تاہم انھیں کہیں سے 'دیوان ذوق' مل گیا جسے پڑھ کر بہت متاثر ہوئے اور شعری ذوق کو جلا ملی۔ پھر بعد میں دیوان غالب جب ہاتھ لگا تو اس کے اسیر ہوگئے اور مسلسل اسے اپنے مطالعے میں رکھتے تھے۔ تلوک چند محروم پیدائشی شاعر تھے اور ان کے اندر شعر و ادب کا فطری ذوق موجود تھا۔ چنانچہ تیسری، چوتھی جماعت سے شعر موزوں کرنے لگے تھے اور آٹھویں جماعت تک ان کی نظمیں اساتذہ کو بھی حیرت زدہ کرنے لگیں۔ دوران اسکول سالانہ معائنہ کے لیے ایک بار ڈویژنل انسپکٹر آف اسکولز نے اسکول کا دورہ کیا۔ انسپکٹر ادبی ذوق بھی رکھتے تھے چنانچہ تلوک چند محروم کو ان کے سامنے پیش کیا گیا اور کچھ سنانے کی فرمائش کی گئی۔ انھوں نے ایک مرثیہ اور ایک نظم 'خدمت والدین' کے عنوان سے پیش کی جسے سن کر انسپکٹر بہت خوش اور متاثر ہوئے اور مرثیے کی ایک نقل ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم کو بھجوا دی اور پھر وہاں سے خوب تعریف و توصیف ملی۔ بظاہر یہ معمولی واقعہ ہے لیکن اس سے ان کے ادبی و شعری ذوق کو بڑی تقویت ملی اور شعری میدان کے وہ شہسوار ہوگئے۔ [2] تلوک چند محروم کی شخصیت اور شاعری کے اتنے پہلو ہیں کہ ان سب پر گفتگو کرنے کے لیے ایک ضخیم تحقیقی مقالے کی ضرورت ہے۔ سردست محروم کی شاعری کے ایک گوشے یعنی ادب اطفال پر گفتگو مقصود ہے۔

بچوں کا ادب اس لحاظ سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے کہ اس سے مقصود بچوں کی بہتر تعلیم و تربیت ہے۔ بچے کسی بھی ملک کا مستقبل ہوا کرتے ہیں اور اس ملک و قوم کی ترقی کا دارومدار انھیں پر ہوتا ہے۔ اس لیے انھیں بہتر تعلیم و تربیت سے آراستہ کرنا بنیادی فریضہ ہے۔ ادب اطفال بچوں کی ذہنی و فکری نشو و نما میں بہت اہم رول ادا کرتا ہے۔ چناں چہ دنیا کی تمام زبانوں میں اس پر خاص توجہ دی جاتی ہے اور بچوں کے ادیبوں کی پذیرائی کی جاتی ہے۔ اردو میں بھی اس پر کافی کچھ لکھا گیا اور اب بھی سلسلہ جاری ہے۔ ادب اطفال چوں کہ کم سن اور کم عمر بچوں کے لیے ہوتا ہے اس لیے اس میں بچوں کی نفسیات کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے۔ لہٰذا ادب اطفال پر لکھنے والا شاعر و ادیب ضروری نہیں کہ کامیاب ہو ہی جائے۔ تلوک چند محروم شعبہ تعلیم سے وابستہ رہے اور زندگی بھر بچوں کو پڑھانے لکھانے میں مصروف رہے اس لیے بچوں کی نفسیات و کیفیات سے بحسن و خوبی واقف ہیں۔ اس لحاظ سے ادب اطفال کی تخلیق میں وہ انتہائی کامیاب ہیں۔ اس میدان میں اسمٰعیل میرٹھی کے بعد محروم کا نام بہت اہم ہے۔ چناں چہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور 'بہار طفلی' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں: ''اس میدان کے قائد کی حیثیت سے مولوی اسمٰعیل میرٹھی کے بعد مرد مجاہد کی حیثیت سے اردو شاعری میں حضرت محروم کا نام نامی لیا جاسکتا ہے۔'' [3]

تلوک چند کی شخصیت ہمہ جہت تھی۔ انھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیت کو نہایت آزادی کے ساتھ استعمال کیا مگر بے لگام نہیں ہونے دیا۔ زندگی کے معمولی سے معمولی شعبوں اور آدمیوں کو موضوع تخلیق بنایا اور ان کے دکھ درد کو محسوس کیا۔ غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کے لیے اس کے خلاف مسلسل آواز بلند کی اور ہندوستان کی شان میں بے شمار نظمیں لکھیں۔ ان کے دل و دماغ میں ہر طبقے کے افراد اور سماج کے لیے بے انتہا گنجائشیں تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی خاص طبقے یا افراد تک محدود نہیں رہے بلکہ ہر ایک کے دکھ درد میں برابر کے شریک رہے اور بہتر معاشرے کی تشکیل و تعمیر میں ہمیشہ اپنا تعاون پیش کرتے رہے۔ بچوں کے لیے لکھی گئی نظمیں بھی اسی سلسلے کی اہم کڑی ہے۔ محروم کی زندگی کا خلاصہ پروفیسر گوپی چند نارنگ کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

''انھوں نے جوانوں، بوڑھوں، بچوں، سرفروشوں، وطن پرستوں، جاں بازوں، دہقانوں، محنت کشوں، غم زدوں، ہجر نصیبوں سب کو اپنے دل میں جگہ دی۔ سب کے درد کو اپنا درد اور سب کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھا۔ انھوں نے

ہر صنف سخن میں اظہار خیال کیا۔ رباعی کے میدان میں ان کا لوہا استادوں نے بھی مانا۔ لیکن وہ نظم کے مرد میدان تھے۔ وہ حالی، سرور، اسمٰعیل، چکبست، شوق، اکبر اور اقبال کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے۔ مخزن کی تحریک میں شامل رہے تھے اور اس روایت کو اپنے شعور کا حصہ بنا کر انھوں نے قدم آگے بڑھایا، اور نظم کے خزانے میں ذاتی، اخلاقی، سماجی، تاریخی، وطنی اور قومی مضامین کا انبار لگا دیا۔ ان کا دل چوٹ کھائے ہوئے تھا، ذاتی صدموں، نجی محرومیوں اور اخلاقی زوال کے ہاتھوں؛ اور انھیں گہرا رنج تھا، قومی افلاس اور بدحالی کا اور ملکی نفاق اور غلامی کا؛ یہ دل زدگی اور دردمندی ان کے کلام میں موج تہ نشین کی طرح جاری و ساری ہے اور اسی نے اسے تاثیر کی وہ دولت عطا کی ہے جس پر کبھی زوال نہیں آ سکتا۔ ان کا خطاب کسی ایک فرقے یا سماج کے ایک طبقے سے نہیں تھا۔ یہ پورے ملک اور پوری قوم سے تھا، بلکہ پورے عالم انسانیت سے تھا۔ وہ وسیع معنوں میں انسانیت کے شاعر تھے۔ انھوں نے شرافت و صداقت، حق گوئی و بے باکی، غیرت و حمیت، حریت پسندی و وطن دوستی، رواداری و یگانگت وغیرہ قدروں پر اس وقت زور دیا جب غلامی نے ہمارے احساس کے دھارے کو کند کر دیا تھا اور صنعتی زندگی کی حشر سامانی میں ہم خود کو بھولنے لگے تھے۔ محروم کی شاعری اس لحاظ سے ہماری عزیز ترین متاع ہے کہ اس میں ہمارے پچھلے پچاس برسوں کی سماجی زندگی کی نبض چلتی ہوئی اور ہماری قومی تحریکوں کا دل دھڑکتا ہوا دکھائی دیتا ہے، اس نے پچھلی نصف صدی میں ہمارے کئی سماجی اور ملکی تقاضوں کو پورا کیا۔ دو تین نسلوں کی ذہنی تربیت میں اہم حصہ لیا اور جمالیاتی و تخلیقی سطح پر ان قدروں کی پاس داری کی جن پر یمان تازہ کرنے کی ضرورت ہر دور میں محسوس ہوتی رہے گی۔ محروم کی یاد تازہ کرنا گویا اپنے ذہنی اور ادبی سرمائے کی قدر کرنا اور اس سے محبت کا ثبوت دینا ہے۔''[4]

شعر و ادب کے بارے میں تلوک چند محروم کا بنیادی خیال یہ ہے کہ وہ افادی ہونا چاہیے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ فنی کمزوریاں معاف ہیں بلکہ فنی سطح پر کامیاب ہونے کے ساتھ ساتھ سماج کے لیے اس میں افادی پہلو بھی ہونا چاہیے۔ محروم کو سیاست اور سماج کا گہرا شعور تھا اور وہ اسے شاہراہ ترقی پر گامزن دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی ذہنی و فکری اور شعری و ادبی تشکیل میں مناظر فطرت، محرومیت اور محزونیت کے جذبات اور اخلاقیات اور سماجی شعور کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ محروم کا عہد اردو شاعری خصوصاً نظم نگاری کے حوالے سے عہد زریں تھا۔ اس عہد میں سرور جہان آبادی، اقبال، اکبر الہ آبادی، اور اسمٰعیل میرٹھی جیسے جید نظم نگار موجود تھے اور ہر طرف ان کی نظم نگاری کا شور تھا، ان کی موجودگی میں اپنی علیحدہ شناخت قائم کرنا بہت مشکل امر تھا۔ تاہم محروم کی تخلیقی اپج نے نظم، غزل اور رباعی تینوں میں اپنی انفرادیت قائم کی۔ محروم کے جذبات میں اخلاص و متانت، سنجیدگی اور سچائی پائی جاتی ہے۔ ان کی شاعری کے بارے میں نیاز فتح پوری کہتے ہیں: ''لیکن محروم کا رنگ ان سب سے علیحدہ تھا۔ اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ حالی کا اثر سب سے زیادہ محروم نے ہی قبول کیا۔ وہی سادگی بیان، وہی پر خلوص لہجہ، وہی صداقت جذبات، اور وہی سب کچھ جو ایک مخلص دوست کہہ سکتا ہے۔ ان کے یہاں نہ مجاہدانہ جوش و خروش ہے، نہ سرفروشانہ تبلیغ، لیکن صداقت اتنی زبردست پائی جاتی ہے کہ اس سے متاثر نہ ہونا ممکن نہیں۔''[5]

ادب اطفال کے حوالے سے تلوک چند محروم کا نام بہت اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے بچوں کی تعلیم و تربیت اور ذوق و شوق کو نکھارنے کے لیے بہت سی نظمیں لکھی جو مجموعے کی شکل میں 'بہار طفلی' کے نام سے 1960 میں اور 'بچوں کی دنیا' کے نام سے 1964 میں شائع ہو کر منظر عام پر آ چکی ہیں۔ بہار طفلی میں چوبیس طبع زاد نظمیں، پانچ ترجمہ شدہ نظمیں اور قطعات کے علاوہ فرہنگ میں مشکل الفاظ کے معانی بھی درج ہیں۔ بچوں کے لیے جتنی نظمیں لکھی جاتی ہیں ان کا بنیادی مقصد تعلیم، حسن اخلاق اور پوشیدہ صلاحیتوں کو نکھارنا ہوتا ہے۔ اس پس منظر میں تلوک چند محروم کی نظمیں مکمل کامیاب ہیں۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی شعر و ادب تخلیق کیا اور اس کے پیچھے ان کی بنیادی منشا یہی تھی کہ اصلاح معاشرہ پر توجہ دی جائے۔ بچوں کے معاملے میں وہ انتہائی نبض شناس اور ان کے مسائل پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظمیں سادہ اور دل نشیں انداز میں نغمہ و آہنگ سے لبریز بچوں کو متاثر کرتی ہیں اور حسن اخلاق و اقدار کی تعلیم دیتی ہیں۔ محروم کے اس مجموعے میں بچوں کے لیے سبق آموز اور زندگی کے لیے نصیحت آموز نظمیں ہیں۔ چناں چہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور اس کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''اس چمنستان سخن کا ہر ورق ایک 'دبستان' بنا ہوا ہے۔ ہر نظم ایک سدا بہار گلستاں کا منظر پیش کرتی ہے۔ شاعر ہر نظم کے موضوع کے ساتھ خود کو اس سلیقے سے وابستہ کرتا ہے کہ وہ بھی بچوں کی برادری کا ایک فرد معلوم ہوتا ہے... اسی طرح صفائی، تندرستی، جھوٹ اور ادب پر حضرت محروم کی نظمیں بڑی ہی عمدہ، معیاری اور بچوں کے اخلاق و اطوار کو سنوارنے والی ہیں۔ 'محنت' عنوان والی نظم

ادب اطفال کے حوالے سے تلوک چند محروم کا نام بہت اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے بچوں کی تعلیم و تربیت اور ذوق و شوق کو نکھارنے کے لیے بہت سی نظمیں لکھی جو مجموعے کی شکل میں 'بہار طفلی' کے نام سے 1960 میں اور 'بچوں کی دنیا' کے نام سے 1964 میں شائع ہو کر منظر عام پر آ چکی ہیں۔ بہار طفلی میں چوبیس طبع زاد نظمیں، پانچ ترجمہ شدہ نظمیں اور قطعات کے علاوہ فرہنگ میں مشکل الفاظ کے معانی بھی درج ہیں۔ بچوں کے لیے جتنی نظمیں لکھی جاتی ہیں ان کا بنیادی مقصد تعلیم، حسن اخلاق اور پوشیدہ صلاحیتوں کو نکھارنا ہوتا ہے۔ اس پس منظر میں تلوک چند محروم کی نظمیں مکمل کامیاب ہیں۔

کورس میں شامل ہونے کے سبب بچوں میں کافی مقبول رہی ہے۔ ویسے ان کی بیشتر نظمیں درسی کتابوں اور بچوں کے رسالوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ جن سے استفادہ کر کے آج کے بچے کل کے اچھے شہری بن رہے ہیں۔[6]

بہار طفلی کا آغاز ایک خوب صورت دعا سے ہوتا ہے جس میں خدا کی قدرت اور نصرت نہایت سادگی کے ساتھ اور دل چسپ پیرائے میں بیان کی گئی ہے۔ اس کو پڑھنے کے بعد دل و دماغ پر ایک تاثر طاری ہو جاتا ہے اور ذہن میں اطاعت و فرماں برداری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ پھر 'خدا کا شکر، سال نو مبارک، بچوں کو نیا سال مبارک، ہمارا دیس، کام، سویرے اٹھنا، اچھے کام، کتاب، بلبل، محنت، صفائی، دشمنی، ہم ہرگز جھوٹ نہ بولیں گے، جھوٹ بڑا پاپ ہے، ادب، بد زبانی سے پرہیز کرو، تندرستی ہزار نعمت ہے اور اچھا آدمی' وغیرہ جیسے عنوان سے نظمیں ہیں جن میں سے ہر ایک سادہ و سلیس زبان اور دلچسپ پیرایہ میں نصیحت آمیز ہیں۔ نئے سال کی مبارکباد دینے کے لیے جو نظم لکھی گئی ہے اس میں نیک تمناؤں اور دعاؤں کے ساتھ ساتھ نئے سال میں کچھ بہتر کرنے کا عزم اور ہمت و حوصلہ بھی موجود ہے۔ پہلے مصرع میں سال نو کی مبارکبادی پیش کی جاتی ہے اور دوسرے میں ہی دعا اور نصیحت آمیز گفتگو شروع ہو جاتی ہے۔ تاہم نظم میں ناصحانہ خشکی کے بجائے دل چسپی اور تر و تازگی کا احساس برقرار رہتا ہے۔ ایک بند ملاحظہ فرمائیں۔

مبارک سال نو اے نو نہالان وطن! تم کو
خدا دل کی امنگوں میں کرے ذوق عمل پیدا

چڑھیں پروان ننھے ننھے پودے آرزوؤں کے
ہوں ان میں نیکیوں کے خوب صورت پھول پھل پیدا

اسی طرح اپنی نظم 'کتاب' میں بچوں سے مخاطب ہوکر کتاب کی اہمیت ومعنویت پر توجہ دلائی جاتی ہے اور بچوں کے ذہنوں نشین کرائی جاتی ہے کہ دنیا کے دوستوں کی محبت دائمی نہیں بلکہ کبھی کبھی اس میں دراڑ آسکتی ہے، تاہم کتاب ایسی دوست ہے جو کبھی جدا نہیں ہوسکتی اور ہمیشہ اس سے سرخروئی اور ناموری ہی حاصل ہوگی اگر اس کو اپنا رفیق بنالیا جائے۔ ذیل کا شعر دیکھیں۔

بہتر کوئی رفیق نہیں ہے کتاب سے
بہتر کوئی شفیق نہیں ہے کتاب سے

دوسرا مجموعہ 'بچوں کی دنیا' کے نام سے ہے جس میں 'اونچے ارادے، اچھا بچہ، صبح ہوئی، پہلے کام پیچھے آرام، مور، سچائی، سگرٹ، استاد کی چھڑی، بہت بولنا عیب ہے، پرندوں کو ایذا نہ پہنچاؤ، قرض اور وقت کی پابندی' وغیرہ طبع زاد نظمیں ہیں۔ اس کے علاوہ دس نظمیں ترجمہ کی ہوئی ہیں اور اخیر میں فرہنگ بھی شامل ہے۔ ان نظموں میں اچھی عادتوں کو اپنانے پر زور دیا گیا ہے تو بری عادتوں سے باز رہنے کی بھی تلقین کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ مناظر فطرت کی خوب صورتی بھی بچوں کے ذہن ودماغ میں نقش کرنے کے لیے نظم کی گئی ہیں۔ مثلاً 'اچھا بچہ، صبح ہوئی اور پہلے کام پیچھے آرام' ایسی نظمیں ہیں جن میں اچھی عادت کی خوبیاں بیان کرکے انھیں اپنانے کی دعوت دی گئی ہے۔ اسی طرح 'سگرٹ، بہت بولنا عیب ہے، جھوٹ اور پرندوں کو ایذا نہ پہنچاؤ وغیرہ اس قسم کی نظمیں ہیں جن میں بری عادتوں کی خامیاں بیان کرکے ان سے بچوں کو باز رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ادب اطفال کا بنیادی مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ بچوں میں اچھی باتوں کی رغبت دلانا اور بری باتوں سے نفرت پیدا کرنا۔ 'پہلے کام پیچھے آرام' کا ایک بند ملاحظہ کریں۔

پہلے تم کام کرو، بعد میں آرام کرو!
کام کے وقت جو آرام کیا کرتے ہیں
آخر کار وہ ناکام رہا کرتے ہیں
سخت نادان ہیں وہ لوگ برا کرتے ہیں

تلوک چند محروم اس عہد کے نظم نگار ہیں جب جدید نظم کا رجحان تیزی سے فروغ پا رہا تھا۔ اس عہد کی نظموں میں سماجی اور سیاسی موضوعات بڑی تیزی سے شامل ہو رہے تھے اور حب الوطنی کا ایک مستحکم جذبہ فروغ پا رہا تھا۔ آزاد، حالی، اکبر، اور اسمٰعیل میرٹھی کی نظم نگاری اپنے عروج پر تھی۔ اقبال، ظفر علی خاں اور برج موہن کیفی وغیرہ کی نظمیں تیزی سے مقبولیت حاصل کر رہی تھیں۔ محروم نے بھی اس صنف میں خوب طبع آزمائی کی اور مختلف سیاسی، سماجی اور ثقافتی موضوعات پر بے شمار نظمیں کہی۔ حب الوطنی پر اتنی کثرت سے نظمیں لکھی ہیں کہ ایک ضخیم مجموعہ کلام تیار ہوگیا جو 'کاروان وطن' کے نام سے شائع ہو چکا ہے جس میں ایک سو اسی سے زائد نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں ہندوستان کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ تلوک چند محروم نے بہ یک وقت غزل، نظم اور رباعی میں اپنی تخلیقی صلاحیت کا لوہا منوایا ہے۔ ان کے کلام میں تازگی اور برجستگی کی ایک لہر، فکر وخیال کی پاکیزگی اور اخلاص موجود ہے۔ بہار طفلی کے حوالے سے نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

''بہار طفلی ایسی نظموں کا مجموعہ ہے جو بچوں اور لڑکوں کے لیے کہی گئی ہیں۔ بچوں کی ذہنیت اور ان کی نفسیات بالکل جداگانہ ہوتی ہے۔ ان کی ذہنی تربیت کے لیے ایسی نظمیں درکار ہیں جو صحیح معنوں میں بچوں کی طبیعت کے موافق ہوں اور ان کی سلیقہ سے تربیت کر سکیں۔ حضرت محروم نے جو نظمیں کہی ہیں وہ بچوں کے ذہن اور نفسیات کے عین مطابق اور موافق ہیں۔ ان کو بچے نہ صرف شوق اور دل چسپی سے پڑھتے ہیں بلکہ یہ ان کی تربیت کا ایک بہترین سبق ثابت ہوئی ہیں۔''[7]

غرض کہ اردو میں ایسے شاعر وادیب کم یاب ہیں جنھوں نے بہ یک وقت تین صنف سخن میں اپنی شناخت مستحکم کی ہو، ان میں تلوک چند محروم کا نام نمایاں ہے۔ محروم نے ایسے ماحول میں جہاں تعلیم وتربیت کا کوئی نظم و نسق نہیں تھا اپنے شعری سفر کا آغاز کیا اور اپنی منفرد شناخت قائم کرنے میں وہ کامیاب ہوکر زندۂ جاوید ہوگئے۔ مناظر فطرت ہو، سیاست ہو، ثقافت ہو یا تعلیم و تربیت ان تمام پہلوؤں کو انھوں نے نظم کا خوب صورت لباس پہنا دیا۔ بقول سیدہ جعفر ''جس طرح حسن نظامی اردو نثر میں اپنے عنوانات کی ندرت اور انفرادیت کے لیے مشہور ہیں اسی طرح محروم نظم میں اپنے اچھوتے عنوانات کے لحاظ سے منفرد حیثیت کے مالک ہیں۔''[8]

تلوک چند محروم نے بچوں کے لیے جتنی نظمیں لکھی ہیں ان میں الفاظ کی تراش خراش اور سادگی زبان کا خاص خیال رکھا ہے اور نظم کا عنوان بھی دل چسپ اور معنی خیز منتخب کیا ہے۔ انگریزی کی اہم نظموں کا ترجمہ بھی انھوں نے اتنی عمدگی سے کیا ہے کہ ان پر تخلیق کا گمان ہوتا ہے۔ محروم نے مناظر فطرت کی دلکش عکاسی کے ساتھ ساتھ محرومیوں پر بھی خوب خوب نظمیں لکھی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی سانکی میں مناظر فطرت رچے بسے ہوئے ہیں اور محرومیوں کے عکس بھی۔ چوں کہ تلوک چند محروم نے وادی سندھ کے ایک انتہائی پسماندہ گاؤں اور کھلی فضاؤں میں اپنا بچپن گزارا۔ دریائے سندھ کی وجہ سے یہ علاقہ انتہائی سبزہ زار ہوا کرتا تھا اور ایک خوش نما ماحول ہوتا تھا۔ مگر پانی کا بہاؤ جب کبھی زیادہ ہوتا تو یہاں کے لوگوں کے لیے مصیبتیں کھڑی ہوجاتیں اور زندگیاں مشکلوں میں پھنس جاتیں۔ یہ سارے پس منظر ان کے یہاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ محروم کی شخصیت کے متنوع پہلو ہیں ان میں سے جن پر بھی نظر ڈالی جائے ایک مکمل پہلو سامنے آتا ہے۔ تاہم دیگر پہلوؤں اور گوشوں سے یکسر قطع نظر کرکے گوشہ اطفال کو ہی نظر میں رکھا جائے اور ان کی نظموں کا تجزیہ کیا جائے پھر بھی ان کی شاعرانہ عظمت اور خدمت قائم ودائم رہے گی۔

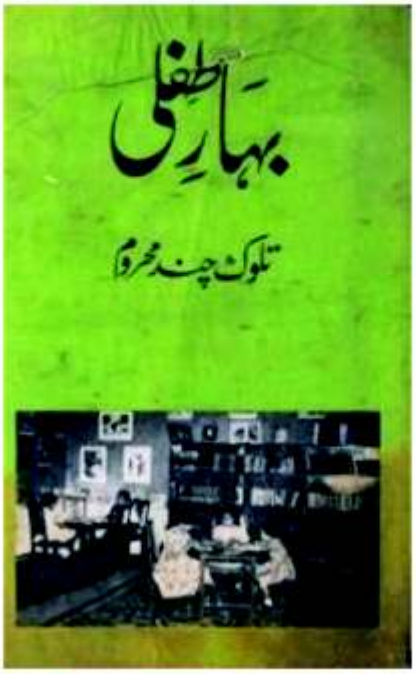

حواشی

1 جگن ناتھ آزاد، ص 31
2 جگن ناتھ آزاد، حیات محروم، انجمن ترقی اردو ہند، 1987، ص 22
3 ڈاکٹر محی الدین زور، دیباچہ بہار طفلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، 1960، ص 10
4 گوپی چند نارنگ، آثار محروم (پگڈنڈی امرتسر کا محروم نمبر)، مرتبہ گوپی چند نارنگ، 1968، ص 6-5
5 نیاز فتح پوری، کاروان وطن، مکتبہ جامعہ، 1960، ص 23
6 دیباچہ بہار طفلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، 1960، ص 12
7 آثار محروم (پگڈنڈی امرتسر کا محروم نمبر)، مرتبہ گوپی چند نارنگ، 1968، ص 100-99
8 آثار محروم (پگڈنڈی امرتسر کا محروم نمبر)، مرتبہ گوپی چند نارنگ، 1968، ص 104

Dr. Md Mohsin Raza
Govt. Sr. Sec. School
Gadhi Jheelpatti ka Maan
Bharatpur - 321024 (Rajasthan)
Email.: mohsinrazajnu@gmail.com
Mob.: 9540859041

ای۔آر محمد عادل

اردو غزل میں فوبیا

یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ غزل دورِ حاضر میں مقبولیت کی نئی نئی منزلوں کو طے کرتی جارہی ہے۔صدیوں سے یہ اردو شاعری کی مقبول ترین صنف رہی ہے کیوں کہ ہمارے اردو شعرا نے ہر طرح کے مضامین کو اس میں شامل کر کے اس کو حسن و عاشقی کے محدود حلقے سے آزاد کرایا اور مختلف رنگوں میں اشعار کہہ کر اپنی شاعری کے ایسے کمالات دکھائے جس سے نئی نسل کی دلچسپی اس صنف کی طرف بڑھنے لگی۔آج کے دور میں شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہوگا جس نے اس صنف شاعری میں طبع آزمائی نہ کی ہو۔آج کا دور سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ہر لمحہ انسان نئی نئی سائنسی ترقیات اور ایجادات سے ہم کنار ہو رہا ہے اس لیے دورِ حاضر میں لکھا جانے والا ادب بھی سائنس کے رنگ میں رنگتا چلا جا رہا ہے۔وہ دن دور نہیں جب مخصوص سائنسی غزلیں لکھیں جائیں گی اور ہماری غزلوں کے اشعار سائنسی مضامین کی کنجی ثابت ہوں گے۔اگر اردو شعر و ادب میں دلچسپی رکھنے والے طلبہ کی رسائی سائنسی مضامین تک کرادی جائے اور وہ سائنسی علوم سے بخوبی آشنا ہو جائیں تو ہماری غزلیں سائنسی مضامین کی لمبی چوڑی باتوں اور اصول و ضوابط کو اپنے اشعار میں پیش کرنے کے حیرت انگیز کارنامے انجام دے سکتی ہیں۔اس کی مثال کے طور پر چکبست لکھنوی کا یہ شعر پیش کیا جا سکتا ہے جس میں سائنس کے مختلف مضامین اور اصول و ضوابط سمٹ کر آ گئے ہیں۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب　　موت کیا ہے ان ہی اجزا کا پریشاں ہونا

اگر سائنس کے مختلف موضوعات کی روشنی میں چکبست کے اس مشہور شعر کا تجزیہ مختلف زاویوں سے کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ چکبست نے کس خوبی سے سائنس، فلسفے اور منطق کی ادق باتوں کو اپنے اس ایک شعر میں سمو دیا ہے۔

'اردو غزل میں فوبیا' کے عنوان سے یہ مضمون اپنے دامن میں میڈیکل سائنس اور علم نفسیات کی منفرد معلومات پر روشنی ڈالتا ہے۔ایسا ہرگز نہیں ہے کہ ہماری اردو شاعری کے لیے یہ مضمون بالکل نیا ہو۔کلاسیکی شعرا کے کلام سے لے کر دورِ جدید اور مابعد جدید شعرا کے کلام میں اس طرح کے مضامین کو بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ہمارے شعرا نے انسانی جذبات، اور نفسیات پر بہت سے اشعار لکھے ہیں۔خوف و ہراس، گھبراہٹ، کو بھی پیش کیا ہے۔جس کا کہیں نہ کہیں تعلق 'فوبیا' سے بھی جڑتا ہوا نظر آتا ہے۔آیئے سب سے پہلے اس بات کو سمجھتے ہیں کہ آخر 'فوبیا' کیا ہے اور انسانی نفسیات سے اس کا کیا تعلق ہے۔

'فوبیا' یونانی (Greek) لفظ 'فوبوس' (Phobos) سے نکلا ہے۔ماہرین کے مطابق اگر آپ ضرورت سے زیادہ اور بنا کسی وجہ کے ڈرتے ہیں یا خوف زدہ ہوتے ہیں تو یہ 'فوبیا' ہے۔یہ ڈر کسی خاص جگہ، حالت اور چیز سے لگ سکتا ہے۔یوں تو فوبیا کی سو (100) سے زیادہ اقسام ہو سکتی ہیں۔لیکن کچھ خاص علامتوں کی وجہ سے اس کو تین بڑے گروپ میں درجہ بند کیا جا سکتا ہے۔

1 سماجی فوبیا　2 اگورفوبیا　3 مخصوص فوبس

سماجی فوبیا (Social Phobia): سماجی فوبیا ایک ایسی نفسیاتی بیماری ہے جس میں مریض سماجی ماحول میں جانے یا حصہ لینے سے بہت ڈرتا ہے۔اگر وہ اس ماحول میں حصہ لیتا ہے تو اسے بہت تکلیف ہوتی ہے۔اور اس کے کام کرنے کی صلاحیتیں اس فوبیا کی وجہ سے بہت کم ہو جاتی ہیں۔یہ ایک عام نفسیاتی بیماری ہے۔ایک اندازے کے مطابق لگ بھگ 12% ہندوستانی جوان اس کے شکار ہو سکتے ہیں۔

دراصل سماجی فوبیا کو سماجی تشویش کے طور پر پہچانا جاتا ہے۔اس فوبیا میں گرفتار افراد سماجی حالات کے بارے میں انتہائی تشویش رکھتے ہیں اور ہمیشہ ایک انجانے خوف میں مبتلا رہتے ہیں۔کسی محفل، مجلس اور پروگرام میں شامل ہونے سے گریز کرتے ہیں اور اگر ان کو کسی کام میں شریک کیا جاتا ہے یا خطاب کرنے کو کہا جاتا ہے تو ان پر ایک گھبراہٹ طاری ہونے لگتی ہے۔اس کے علاوہ یہ افراد بہت چھوٹے چھوٹے کاموں مثلاً ٹیلی فون اٹھانے، لوگوں سے موبائل پر بات کرنے، ریستوراں میں جانے اور کھانے کا آڈر کرنے میں بھی جھجکتے ہیں۔اور اپنے اس عمل کے سبب لوگوں کی تنقید کا نشانہ بنتے ہیں۔

اگور فوبیا (Agora Phobia) : اگورفوبیا ایک ایسی نفسیاتی بیماری ہے جس میں گرفتار افراد گھر سے باہر جانے، دوکانوں یا فلم ہال میں گھومنے میں، بھیڑ بھاڑ میں جانے، ٹرین میں اکیلے سفر کرنے میں گھبراہٹ محسوس کرتے ہیں۔یعنی وہ یہ تصور کرتے ہیں کہ یہ ایسی جگہیں ہیں جہاں ان کو پریشانی ہو سکتی ہے اور وہاں سے نکلنا آسان نہیں ہے۔ماہرین کے مطابق اگورفوبیا ایک ایسی بیماری ہے جو سماجی فوبیا کے ساتھ جڑی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔لیکن فرق یہ ہے کہ اگورفوبیا کے ساتھ لوگوں کو یہ خوف ہے کہ وہ اس جگہ کی ہنگامی صورت حال سے بغیر کسی مدد کے باہر نہیں نکل سکیں گے جہاں ان کو طبی امداد کی ضرورت پیش آئے گی۔

مخصوص فوبیا (Specific Phobia): ماہرین نفسیات کے مطابق مخصوص فوبیا تشویش کی بیماریوں کی ایک قسم ہے جو خاص طور پر کسی مخصوص چیز یا واقعے کے بارے میں شدید یا غیر معمولی خوف کو ظاہر کرتی ہے۔اس فوبیا میں گرفتار افراد کسی مخصوص چیز یا صورت حال کا سامنا کرنے سے گھبراتے ہیں۔مثال کے طور پر ایسے افراد بلند

مقامات پر پرواز کرنے، جانوروں کو دیکھ کر، انجکشن لگوانے، اور خون دیکھنے وغیرہ سے گھبرا کر ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔

آیئے اب اردو غزل میں ایسے اشعار پر نظر ڈالتے ہیں جن میں فوبیا کی مختلف اقسام دیکھنے کو ملتی ہیں۔

میسو فوبیا (Misophobia): میسوفوبیا ایک ایسی حالت ہے جس میں ایک شخص کسی مخصوص آواز سے خوف زدہ ہو کر اس پر اپنا ردعمل ظاہر کرتا ہے۔ یہ آوازیں مختلف ہو سکتی ہیں جو اس شخص کو بے قرار کر سکتی ہیں۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے ایسی بہت سی آوازیں جو لوگوں کی عادت میں ہوتی ہیں مثلاً چبانے، زبان پر کلک کرنے، سیٹی بجانے وغیرہ کی آوازیں بھی آدمی کو بے قرار کر سکتی ہیں اگر وہ اس قسم کے فوبیا سے متاثر ہے۔ ماہرین نفسیات کے مطابق یہ ایک نفسیاتی بیماری ہے اگر اس کا علاج نہیں کیا گیا تو یہ مرض زندگی بھر قائم رہ سکتا ہے۔ ابھی اس مرض پر مزید تحقیقات کی ضرورت ہے کہ اس کی وجوہات کیا ہیں اور کیسے اس پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ دنیا کی کئی مشہور و معروف شخصیات مثلاً بیسویں صدی کا بہترین ناول نگار 'فرانز کافکا' (Franz Kafka)، روسی افسانہ نویس اور ڈرامہ نگار' انتون پاولاوچ چیخوف' (Anton Pavlovich Chekhov)، اداکارہ 'میلانی لنسکی' نغمہ نگار 'سیلی آوسبورن' اس فوبیا میں گرفتار ہو چکے ہیں۔ اردو غزل کا ایک شعر ملاحظہ کریں جو میسوفوبیا کی ترجمانی کرتا ہے۔

بہت تھا خوف جس کا پھر وہی قصہ نکل آیا　　مرے دکھ سے کسی آواز کا رشتہ نکل آیا

بشر نواز

شاعر نے اپنے اس شعر میں مخاطبانہ لہجہ اختیار کیا ہے۔ جس میں وہ میسوفوبیا کا ذکر کر رہا ہے۔ وہ اس فوبیا کی علامت بتاتے ہوئے اس بات پر بھی روشنی ڈالتا ہے کہ کس طرح آواز کے خوف سے اس کو اذیت ہو رہی ہے۔ جب مریض آواز کے خوف میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کی رات کی نیند اور دن کا چین بھی حرام ہو جاتا ہے۔ محمد شاہد فیروز نے بھی اپنے ایک شعر میں اس فوبیا کی ترجمانی کی ہے۔

جس نے تمھاری نیند کی دنیا اجاڑ دی　　مجھ کو بھی ایک ایسی ہی آواز کا ہے خوف

محمد شاہد فیروز

یہ بات بھی واضح ہے کہ میسوفوبیا کے شکار لوگ شور سے دور بھاگتے ہیں اور تنہائی کو پسند کرتے ہیں۔ اگر ایسے افراد کو کسی شور بھری جگہ پر لایا جائے تو ایسے ماحول میں ان کو بہت تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور وہ چیخ و پکار سے خوف زدہ نظر آتے ہیں۔ عرفان صدیقی کے یہ اشعار ملاحظہ کریں جو اس بات کی عکاسی کرتے ہوئے ہیں۔

جانے کب سے ایک سناٹا سا ہے ذہن میں　　اب کوئی ان کو پکارے گا تو ڈر جائیں گے لوگ
یہ گزرگاہ کا سناٹا، یہ پر شور ہوا　　کھڑکیاں کھول کے سونے نہیں دیتا کوئی

عرفان صدیقی

گلوسوفوبیا (Glossophobia): گلوسوفوبیا یعنی عوام میں بولنے کا خوف نمایاں طور پر ایک عام نفسیاتی بیماری تصور کیا جاتا ہے۔ یہ سماجی فوبیا کی ایک قسم ہے۔ ماہرین کے مطابق یہ ایک عام حالت ہے تقریباً 75 فی صد آبادی کا تعلق اس نفسیاتی بیماری سے جڑا ہو سکتا ہے۔ اردو غزل کا شاعر جب اس موضوع پر قلم اٹھاتا ہے تو کہتا ہے۔

خوف سا پھر لبوں پہ طاری ہے　　اک عجب کیفیت ہماری ہے

اعجاز الحق شہاب

اعجاز الحق شہاب نے اپنے اس شعر میں گلوسوفوبیا کی مکمل عکاسی کر دی ہے۔ کہ اس فوبیا میں گرفتار شخص کی ذہنی اور جسمانی کیفیت کیا ہوتی ہے اور کس طرح وہ ردعمل کرتا ہے۔ اگر اس کو کسی محفل میں خطاب کرنے کو کہا جاتا ہے۔ تو اس پر ایک انجانا خوف طاری ہو جاتا ہے۔ اور اس کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگتے ہیں اور اس کے لبوں پر بھی کپکپاہٹ اور زبان میں لکنت آنے لگتی ہے۔

اگورفوبیا (Agoraphobia): پچھلے سطور میں اس فوبیا کی وضاحت ہو چکی ہے کہ اگورفوبیا (Agora Phobia) ایسی جگہ یا صورت حال ہے جس میں مبتلا افراد بھیڑ، سماجی حالت یا گھر سے باہر جانے سے بچتے ہیں اور وہ گھر یا تنہائی میں زیادہ آرام محسوس کرتے ہیں۔ یہ فوبیا سماجی فوبیا سے جڑا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ اس فوبیا کے ساتھ لوگوں کو یہ خوف رہتا ہے کہ وہ اس جگہ سے باہر نہیں نکل سکیں گے جہاں ان کی کوکسی طبی یا ہنگامی صورت حال میں کسی کی ضرورت پڑے گی۔ اردو غزل کے اشعار میں اس فوبیا کا یوں ذکر ملتا ہے۔

خوف آتا ہے بھیڑ سے جب بھی　　گھر کی ویرانیوں سے ڈرتے ہیں

فرحان حنیف وارثی

بھیڑ کے خوف سے پھر گھر کی طرف لوٹ آیا　　گھر سے جب شہر میں تنہائی کے ڈر سے نکلا

علیم مسرور

پہلے شعر میں آیا مصرع ''خوف آتا ہے بھیڑ سے جب بھی'' اگورفوبیا کی علامت بیان کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ دوسرے شعر میں ''بھیڑ کے خوف سے پھر گھر کی طرف لوٹ آیا'' کہہ کر شاعر نے اس فوبیا کی کیا خوب عکاسی کر دی ہے۔ کس طرح اگورفوبیا میں گرفتار شخص بھیڑ میں خوف کھاتا ہے۔ اور پرسکون جگہ پر رہنا پسند کرتا ہے۔

ایکرو فوبیا (Acrophobia): یہ مخصوص فوبیا کی ایک قسم ہے۔ اس فوبیا کے شکار انسان کو اونچائی سے ڈر لگتا ہے۔ اس مرض میں مبتلا مریض کو پہاڑوں، پل اور بلند عمارتوں میں جانے سے بھی بہت ڈر لگتا ہے۔ فوبیا کے اثرات میں چکر آنا، پسینے آنا اور ایسا محسوس ہونا کہ وہ باہر نکلے گا تو بے ہوش ہو جائے گا وغیرہ شامل ہے۔ ایکروفوبیا کے حوالے سے یہ اشعار دیکھیں۔

اس بلندی خوف سے آزاد ہوا اس نے کہا　　چاند سے جب بھی کہا نیچے اترنے کے لیے

شہریار

شہریار اپنے اس شعر میں 'بلندی' اور 'خوف' کا ذکر کر رہے ہیں۔ جس سے ایکروفوبیا کی طرف ذہن جاتا ہے۔

فریحہ نقوی کا شعر ملاحظہ کریں۔

اسی لیے میں سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتی ہوں　　اتنی بلندی سے رہتا ہے گر جانے کا خوف

فریحہ نقوی

فریحہ نقوی اپنے شعر میں بلند مقام پر سنبھل سنبھل کر قدم اٹھانے کی بات کہتی ہیں۔ اور اس کا سبب وہ یہ بیان کرتی ہیں کہ بلندی پر جانے کے بعد گر جانے کا خوف لگا رہتا ہے۔ یعنی فریحہ نقوی ایکروفوبیا کی علامت کو بیان کر رہی ہیں۔

عادل فراز اس موضوع کو اس طرح پیش کرتے ہیں۔

بلندیوں　پر　پہنچنے　والو　　قدم زمیں پر جمائے رکھنا

عادل فراز

شاعر اس شعر میں بلندیوں پر پہنچنے والوں کو مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ بلندیوں پر پہنچنے والو اس بات کا خیال رہے کہ تمھارے قدم زمین سے اکھڑنے نہ پائیں۔ کیوں کہ اکثر بلندیوں پر پہنچنے کے بعد گرنے کا خوف ہوتا ہے۔ واضح ہے کہ شاعر بلندی کے خوف 'ایکروفوبیا' کو بیان کر رہا ہے۔ اشوک ساحل کا ایک مشہور شعر ہے۔

بلندیوں پہ پہنچنا کوئی کمال نہیں　　بلندیوں پہ ٹھہرنا کمال ہوتا ہے

اگر اشوک ساحل کے اس شعر کو 'ایکروفوبیا' کی عکاسی کے طور پر لیا جائے تو یہ بات

ثابت ہوجاتی ہے کہ یہ شعر بلندی کے خوف کا عکاس ہے۔تب ہی تو وہ بلندی پر ٹھہرنے کو کمال بتا رہے ہیں۔

ایقوا فوبیا (Aquaphobia) : اس فوبیا میں آدمی کو پانی سے بے حد ڈر لگتا ہے۔ اس میں ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ کبھی کبھی لوگ گہرے پانی یا بڑی لہروں سے بھی ڈرتے ہیں۔جب کہ کچھ لوگ سوئمنگ پول یا اس کے علاوہ پانی دیکھنے سے بھی ڈر جاتے ہیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ ایک ایسی بیماری ہے جس میں مریض کسی رقیق مادے کو دیکھ کر بھی خوف زدہ ہوسکتا ہے۔اور ردعمل ظاہر کرسکتا ہے۔آیئے اس سے متعلق اشعار کو دیکھیں۔

دل خوف میں ہے عالم فانی کو دیکھ کر　　آتی ہے یاد موت کی پانی کو دیکھ کر
منیر نیازی

منیر نیازی نے اپنے اس شعر میں 'ایقوا فوبیا' کی عمدہ ترجمانی کی ہے۔شاعر نے اس شعر میں ایک ایسے شخص کا خاکہ کھینچا ہے جو اس فوبیا میں گرفتار ہے۔اور کس طرح وہ ہر لمحہ خوف زدہ رہتا ہے۔جب کبھی وہ پانی کو دیکھتا ہے تو خوف میں مبتلا ہوجاتا ہے اور اس کو اپنی موت یاد آنے لگتی ہے۔

'ایقوا فوبیا' کا مریض نہ صرف رقیق مادے کو دیکھ کر خوف کھاتا ہے بلکہ اس کو گہرے پانی میں ڈوب کر مرجانے کا بھی خطرہ لاحق رہتا ہے۔ساجد پریمی اپنے ایک شعر میں اس علامت کو کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

ایسے تیراک ہم نہیں ساجد　　خوف گہرائیوں سے کھاتے ہیں　　ساجد پریمی

نکٹو فوبیا (Nyctophobia): اس فوبیا میں گرفتار شخص کو رات اور اس کے اندھیرے سے بے حد ڈر لگتا ہے۔ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ اس فوبیا میں مبتلا افراد بہت توہمات کا شکار ہوتے ہیں۔وہ جن، بھوت، بلاؤں کے خیالات میں گرفتار رہتے ہیں۔اس فوبیا سے متعلق اشعار دیکھیں۔

ہمیں یہ خوف اندھیرے نگل نہ جائیں کہیں　　سو ہم نے جسم کو ڈھانپا ہے آفتاب کے ساتھ
زعم رشید

زعم رشید اپنے اس شعر میں اندھیرے سے پیدا ہونے والے خوف کی بات کر رہے ہیں۔اندھیرے کا خوف ہونے کے سبب شاعر روشنی میں رہنے کو ترجیح دے رہا ہے۔مصرع میں 'ڈھانپا ہے آفتاب کے ساتھ' اس بات کی وضاحت کر رہا ہے۔اس کے علاوہ شاعر کہتا ہے 'ہمیں یہ خوف اندھیرے نگل نہ جائیں کہیں' یہ مصرع مکمل طور پر نکٹوفوبیا میں مبتلا شخص کی کیفیت کو بیان کرتا ہے۔شاعر نے اپنے اس شعر میں نکٹوفوبیا کی علامت اور اس کے بعد ہونے والے ردعمل کو بڑی خوبصورتی سے پیش کردیا ہے۔

شہریار کا ایک شعر ملاحظہ کریں جس میں وہ نکٹوفوبیا کی ترجمانی بڑے منفرد انداز میں کرتے ہیں۔

عجیب سانحہ مجھ پر گزر گیا یارو　　میں اپنے سائے سے کل رات ڈر گیا یارو
شہریار

شہر یار کا یہ شعر نکٹوفوبیا میں گرفتار شخص کی ذہنی کیفیت کا عکاس ہے۔ماہرین نفسیات کے مطابق جس شخص کو یہ فوبیا ہوتا ہے وہ شخص اپنے سائے سے بھی دور بھاگتا ہے اور اگر اس کی نظر اپنے سائے پر پڑ جائے تو وہ خوف زدہ ہوجاتا ہے اور ردعمل ظاہر کرتا ہے۔شہریار اپنے اس شعر کے ذریعے اس فوبیا میں مبتلا شخص کا بہترین خاکہ پیش کرتے ہیں۔ناصر کاظمی اس موضوع کو جب اپنے شعر کے قالب میں پیش کرتے ہیں تو یوں کہتے ہیں۔

کیسی اندھیری رات ہے دیکھو　　اپنے آپ سے ڈر لگتا ہے　　ناصر کاظمی

یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ اس فوبیا میں گرفتار شخص رات اور اس کے اندھیرے میں بے حد خوف زدہ ہوجاتا ہے اور اس کی کیفیت بدلنے لگتی ہے۔ماہرین کا کہنا ہے کہ رات کو اس خوف کے سبب مریض کے دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہوجاتا ہے۔اور اگر اس فوبیا کا علاج نہ کیا جائے تو یہ خوف ہمیشہ کے لیے اس کے دل میں بیٹھ جاتا ہے۔سلمان اختر کا ایک شعر دیکھیں جو اس علامت کو پیش کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

رات کے بعد رات آئے گی　　دل سے جاتا ہے کب یہ ڈر دیکھو
سلمان اختر

عباس تابش بھی اس فوبیا کو علامتی انداز میں کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں۔

رات کو گھر سے نکلتے ہوئے ڈر لگتا ہے　　چاند دیوار پہ رکھا ہوا سر لگتا ہے
عباس تابش

ماہرین نفسیات کا کہنا ہے جس شخص کو فوبیا ہوجائے اس کے ساتھ بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ایسے شخص کو رات کے وقت اکیلا گھر پر نہیں چھوڑنا چاہیے۔کیونکہ ایسا شخص رات کے خوف میں مبتلا ہوکر کچھ بھی ردعمل کرسکتا ہے۔آشو شرا کس انوکھے انداز میں اس بات کو بیان کر رہے ہیں۔

دل کو اب ہجر کے لمحات میں ڈر لگتا ہے　　گھر اکیلا ہو تو پھر رات میں ڈر لگتا ہے
آشو شرا

آیئے اب کچھ ماحول اور موسمی فوبیا پر غور وفکر کرتے ہیں کہ کس طرح شاعر نے اس سے متعلق فوبیا کو اپنے اشعار میں پیش کیا ہے۔

استرافوبیا (Astraphobia): یہ دو یونانی (Greek) لفظ ''استرو'' (Astro) جس کا مطلب ہے 'آسمانی بجلی کی چمک' اور فوبوس (Phobos) جس کا مطلب ڈر ہے سے مل کر بنا ہے۔یہ ماحول کے خوف سے متعلق ایک فوبیا ہے۔جس کا شمار مخصوص فوبیا میں ہوتا ہے۔

استروفوبیا ایک ایسی نفسیاتی بیماری ہے جس میں مریض آسمانی بجلی کی چمک، بادل کی گرج اور آندھی طوفان سے ڈرنے لگتا ہے۔اس دوران وہ عجیب حرکتیں کرنے لگتا ہے۔جیسے اس کے ساتھ کچھ برا ہو رہا ہے۔وہ ایسے حالات سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔کئی بار وہ خود کو کمرے میں بند کرلیتا ہے اور اپنے کانوں پر انگلی سے بند کرلیتا ہے۔اگر موسم کچھ گھنٹے تک خراب رہتا ہے تو اس شخص کی ذہنی اور جسمانی حالت بھی خراب ہونے لگتی ہے۔وہ شخص ڈر سے چیخنے اور چلانے لگتا ہے۔جب کہ کئی موقعوں پر رونے بھی لگتا ہے۔ڈر سے اس آدمی کا پورا بدن کانپنے لگتا ہے۔یہ ہر عمر کے لوگوں کو متاثر کرسکتا ہے۔حالانکہ یہ بچوں میں بڑوں سے زیادہ عام ہوسکتا ہے۔یہ جانوروں میں بھی پایا جاتا ہے۔اور وہ بھی طوفان کے سبب خوف زدہ نظر آتے ہیں اور ردعمل کرتے ہیں۔ اس فوبیا میں مبتلا لوگوں کو طوفانی آندھی میں پھنس جانے یا شدید موسمی حالات سے دوچار ہونے کا خوف لگا رہتا ہے۔اور ان کے اوپر ایک اضطراب اور بے چینی دکھائی دیتی ہے۔وہ یہ سوچتے ہیں کہ اگر وہ ایسے نامناسب حالت میں مبتلا ہوئے تو کیسے اس سے باہر نکلیں گے۔جب کہیں گرج اور چمک دیکھتے ہیں تو شدید ردعمل کا اظہار کرتے ہیں۔یہ ایک قابل علاج بیماری ہے۔امریکی نفسیاتی ایسوسی ایشن (America Psychiatric Association) کے مطابق یہ کوئی بڑی بیماری نہیں ہے۔اس کو نفسیاتی علاج کے ذریعے ختم کیا جاسکتا ہے۔استرافوبیا سے متعلق اردو غزل میں آئے اشعار دیکھیں۔

کیوں خوف زدہ ہوگئے تم ایک گھٹا سے　　میں نے تو بتایا تھا کہ طوفان نہیں ہے
نجمہ شاہین کھوسہ

خود پر کوئی طوفان گزر جانے کے ڈر سے　　میں بند ہوں کمرے میں بکھر جانے کے ڈر سے
حسن عزیز

نیفو فوبیا (Nephophobia) : بادلوں کے ڈر کو نیفوفوبیا کہا جاتا ہے۔یہ لفظ دو یونانی لفظوں سے مل کر بنا ہے۔نیفو (Nepho) جس کا مطلب ہے بادل اور فوبوس

(Phobos) کا مطلب ڈر اور خوف ہے۔ یہ حالت بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ لیکن جن لوگوں کو یہ نفسیاتی بیماری ہوتی ہے۔ ان کے لیے بادلوں کا خوف بہت بڑی بات ہے۔ نیفوفوبیا کی علامتیں مختلف حالات میں مختلف ہوسکتی ہیں۔ ہر شخص الگ الگ تجربہ کرسکتا ہے۔ لیکن ماہرین نفسیات کے مطابق کچھ علامتیں اس طرح ہیں۔ مریض بہت زیادہ خوف زدہ اور جذباتی ہوجاتا ہے اور اس کی کیفیت میں تبدیلی آجاتی ہے جب وہ بادلوں کو جمع ہوتے ہوئے یا بادلوں کی شکل وصورت بدلتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے۔ اس حالت میں چکر آنا یا متلی ہونا عام بات ہوتی ہے۔ نیفوفوبیا سے متعلق یہ شعر دیکھیں۔

سمجھ میں آتی ہے بادل کی آہ وزاری اب　　وہ مہربان مجھے بھی بہت رلاتا ہے

شائستہ یوسف

چاؤ نو فوبیا (Chionophobia) : یہ دو یونانی الفاظ 'چیون' مطلب برف اور 'فوبوس' مطلب خوف سے مل کر بنا ہے۔ اس فوبیا کی وجہ عام طور پر برف میں شامل بچپن کے تکلیف دہ تجربے کا نتیجہ ہے۔ جیسے برف میں کھیلتے ہوئے وقت یا کسی ٹریفک حادثے میں اگر وہ برف میں دب جاتا ہے، یا زخمی ہوجاتا ہے۔ تو اس کے دل میں ایک انجانا خوف گھر کر جاتا ہے۔ جب کبھی وہ برف باری دیکھتا ہے۔ یا کہیں پر زیادہ مقدار میں برف دیکھتا ہے تو ردعمل ظاہر کرتا ہے۔ اس کو لگتا ہے کہ برف میں دب جانے سے اس کی جان بھی جاسکتی ہے اور ایسی صورت حال میں کوئی اس کی مدد بھی نہیں کرپائے گا۔ دوسرے فوبیا کی طرح اس فوبیا کے مریض میں بھی دل کا تیز دھڑکنا، سانس لینے میں دشواری ہونا، رونا، چیخنا، بے ہوشی، دماغ میں کمی کا احساس اور بھاگ جانے یا چھپنا دیکھنے کو ملتا ہے۔ چاؤنو فوبیا سے متعلق اشعار دیکھیں۔

برف جمنے لگی بدن پہ میرے　　کون مجھ کو یہاں بچائے گا

عبدالحفیظ

گھر سے کیوں جاؤں میں باہر کہ برف باری ہے　　آج عالم میں مری موت کی تیاری ہے

عالم نسیم

آمبر و فوبیا (Ombraphobia): یہ دو یونانی الفاظ "Ombros" جس کا مطلب ہے 'بارش کا طوفان' اور "Phobos" مطلب خوف سے مل کر وجود میں آیا ہے۔ بارش کے طوفان سے پیدا ہونے والا خوف 'آمبروفوبیا' کہلاتا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ بالغ لوگوں کے مقابلے بچوں میں زیادہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس میں مبتلا مریض جب کبھی موسم تبدیل ہوتے ہوئے، بادلوں کے ساتھ بجلی کڑکتے یا بارش ہوتے دیکھتا ہے۔ تو خوف زدہ ہوکر ردعمل ظاہر کرتا ہے۔ اگر یہ مرض حد سے تجاوز کر جائے تو وہ ہلکی پھلکی بوندا باندی، اور ہواؤں کی سرسراہٹ سے بھی خوف زدہ ہونے لگتا ہے۔ ایسے مریض کے لیے برسات کے دن عام طور ناپسندیدہ ہوتے ہیں۔ وہ بارش کے خوف سے باہر نکلنے سے بھی ڈرتے ہیں۔ اردو میں اس سے متعلق اشعار ملاحظہ کریں۔

کیا کہوں دیدۂ تر یہ تو مرا چہرا ہے　　سنگ کٹ جاتے ہیں بارش کی جہاں دھار گرے

شکیب جلالی

بادلوں کے درمیاں رات کیا سازش ہوئی　　میرا گھر مٹی کا تھا میرے گھر بارش ہوئی

بشیر بدر

ہیلو فوبیا (Heliophobia): یہ ایک ایسا فوبیا ہے جس میں مبتلا افراد سورج کی روشنی اور اس کی تپش سے خوف کھاتے ہیں۔ اور سورج کی روشنی میں باہر جانے سے گھبراتے ہیں۔ ایسے لوگ اندھیرے کمرے میں رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ وہ دن کے بجائے رات میں کام کرنے کو پسند کرتے ہیں۔ شعر دیکھیں۔

سوکھا، بارش کے ماروں کا دکھ کب جا کر ختم ہوا
سورج دیکھ کے ڈر جائے ہیں بادل دیکھ کے گھبرائے ہیں　　پرتاپ سوم نشی

بوٹانو فوبیا (Botanophobia) : بوٹانو فوبیا پودوں کا ایک غیر معمولی اور مستقل خوف ہے۔ جو ماضی کے کسی منفی تجربے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ بوٹانو فوبیا کے شکار افراد کو پودوں کا سامنا ہونے پر عجیب سی بے چینی ہوتی ہے۔ اگر اس مرض کا علاج نہ کیا جائے تو یہ فوبیا بہت تکلیف دے سکتا ہے۔ اس سے متعلق شعر دیکھیں۔

شہر گل کے خس و خاشاک سے خوف آتا ہے
جس کا وارث ہوں اسی خاک سے خوف آتا ہے　　افتخار عارف

انتھو فوبیا (Anthophobia): پھولوں سے لگنے والے خوف کو انتھوفوبیا کہا جاتا ہے۔ اس مرض میں مبتلا افراد یا تو ہر طرح کے پھول سے خوف کھاتے ہیں یا کچھ خاص قسم کے پھولوں کو چھونے یا دیکھنے سے خوف زدہ ہوتے ہیں۔ اس سے متعلق شعر دیکھیں۔

نہ خوف برق نہ خوف شرر لگے ہے مجھے　　خود اپنے باغ کے پھولوں سے ڈر لگے ہے مجھے

ملک زادہ منظور احمد

سیلینو فوبیا (Selenophobia) : یونانی زبان میں "Selene" چاند کو کہتے ہیں۔ چاند یا اس کی روشنی کا غیر معقول خوف 'سیلینو فوبیا' ہے۔ اس کے خوف میں مبتلا افراد چاند کے بارے میں بات کرنے یا سوچنے سے بھی خوف یا اضطراب میں آسکتے ہیں۔ اس سے متعلق ایک شعر دیکھیں۔

یہ کب کہا تھا نظاروں سے خوف آتا ہے　　مجھے تو چاند ستاروں سے خوف آتا ہے

وصی شاہ

ڈسٹا ئچیفوبیا (Dystychiphobia) : یہ حادثات کے سبب پیدا ہونے والا خوف ہے۔ اکثر ایسے شخص میں دیکھا جاتا ہے جو ماضی میں کسی سنگین یا مہلک حادثے کا شکار رہا ہو۔ میں حادثے میں کسی کے کھو جانے سے بھی یہ فوبیا متحرک ہوجاتا ہے۔ اس فوبیا کے مریض کو یہ خوف لگا رہتا ہے کہ دوسرے افراد اس کو تکلیف پہنچا سکتے ہیں۔ اس سے متعلق اشعار دیکھیں۔

آنے والے حادثوں کے خوف سے سہمے ہوئے　　لوگ پھرتے ہیں کہ جیسے خواب ہوں ٹوٹے ہوئے

آزاد گلاٹی

گھر کی گھٹن سے دور نکل جائے آدمی　　سڑکوں پہ خوف ہو نہ اگر حادثات کا

بدیع الزماں خاور

افینو فوس فوبیا (Aphenphosmphobia): اس فوبیا میں فرد کسی کے چھونے بھر سے ہی خوف زدہ ہوجاتا ہے۔ اکثر یہ جنسی حملے کے خوف سے منسلک ہوتا ہے۔ اس فوبیا میں گرفتار شخص کو جنسی استحصال کا نشانہ بننے کا خدشہ لگا رہتا ہے۔ شعر دیکھیں۔

اپنا بھی ہاتھ چھونے سے ڈر جائے آدمی　　میری سمجھ میں آچکا کتنا برا ہے خوف

محمد شاہد فیروز

الغرض اردو غزل سے فوبیا کی مختلف اقسام پر اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں جن کو پڑھ کر اور سمجھ کر اردو کے قارئین بخوبی اندازہ کرسکتے ہیں کہ ہماری اردو غزل نے موجودہ دور میں سائنس کی آواز میں آواز ملا کر کس قدر ترقی حاصل کی ہے۔ اور کس طرح مختلف موضوعات کو اپنے دامن میں سمیٹا ہے۔

■

Er. Mohd Adil
Hilal House, H.N.: 4/114, Jagjeevan Colony
Naglah Mallah, Civil Line, Aligarh - 202002 (UP)
Mob.: 9358856606
Email.: mohdadil75@gmail.com

کرتار سنگھ دگل کی اردو ڈرامانگاری

اقبال احمد

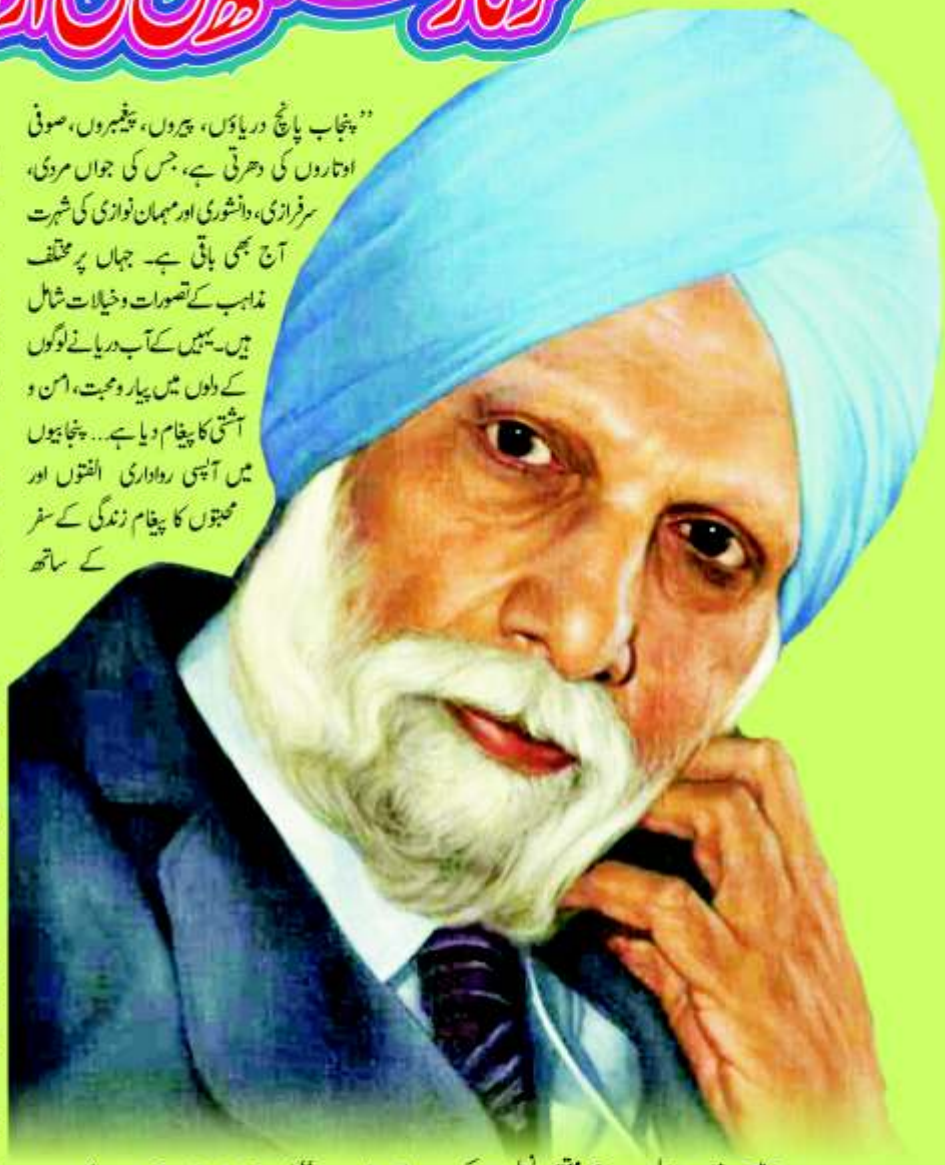

سرزمینِ پنجاب ازل سے ہی مختلف نسلوں کے افراد سے آباد ہے اور مختلف مذاہب و عقائد یہاں کی رنگارنگ زندگی کا جزو ہیں۔ یہاں تھوڑے فاصلے سے یا کہیں کہیں گردوارے، مسجد، مندر اور گرجا گھر اکٹھے بھی نظر آتے ہیں۔ جو اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ یہ علاقہ سیکولر ہے اور ان مختلف مذاہب وعقائد کے باوجود پنجاب میں ہمیشہ سے ہی اتحاد، اتفاق ہے۔ دراصل یہی باطنی احساس اور نفسیاتی و جذباتی ہم آہنگی کا تصور قومیت کی تشکیل کرتا ہے اور کسی قوم کو متحد رکھنے میں ایک اہم رول ادا کرتا ہے۔ پروفیسر محمد جمیل اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ:

''پنجاب پانچ دریاؤں، پیروں، پیغمبروں، صوفی اوتاروں کی دھرتی ہے، جس کی جواں مردی، سرفرازی، دانشوری اور مہمان نوازی کی شہرت آج بھی باقی ہے۔ جہاں پر مختلف مذاہب کے تصورات وخیالات شامل ہیں۔ یہیں کے آب دریا نے لوگوں کے دلوں میں پیار و محبت، امن و آشتی کا پیغام دیا ہے... پنجابیوں میں آپسی رواداری الفتوں اور محبتوں کا پیغام زندگی کے سفر کے ساتھ رواں دواں ہے۔'' (اردو فارسی اور پنجاب، ص 8-107)

اسی متحدہ قومیت کے تصور کو قائم رکھنے کے لیے ایک ایسی زبان کی ضرورت تھی جسے اس خطے کے تمام افراد سمجھ، بول اور پڑھ سکیں۔ جب برصغیر ہند میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ عربی و فارسی زبانیں آئیں اور ایک عرصہ تک فارسی یہاں کی سرکاری و درباری زبان بھی رہی اور بیرونی زبانیں یہاں کی مقامی زبانوں کے ساتھ میل جول کے باعث ایک نئی مخلوط زبان نے جنم لیا جسے مختلف ادوار اور علاقوں میں الگ الگ ناموں سے پکارا جاتا رہا اور بالآخر اردو کے نام سے موسوم ہوئی۔

اس بات کے کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ بلاشبہ اردو زبان کے جنم داتا مسلمان رہے ہیں مگر اردو محض مسلمانوں کی ہی زبان نہیں ہے اور نہ ہی اسے مذہب کے ساتھ جوڑا جاسکتا ہے۔ اس زبان کی ترویج و اشاعت میں ہمارے غیر مسلم ادبا و شعرا کا ایک بہت بڑا حصہ ہے بلکہ یہ کہا جائے کہ برابر کے شراکت دار ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ امام مرتضیٰ نقوی لکھتے ہیں کہ:

''اردو کو اس کی دلکشی اور رعنائی کے باعث ہر مذہب اور ہر فرقے کے لوگوں نے اپنایا ہے۔ ہندو ہوں یا مسلم سکھ ہوں یا عیسائی۔ ہندوستان کے ہر گروہ اور فرقے نے اس میں اپنے لیے پناہ ڈھونڈی ہے۔''

(اردو ادب میں سکھوں کا حصہ، ص 5)

تقریباً دو سوا دو صدیوں پر محیط اردو ادب کے منظرنامے کا جائزہ لینے سے اردو کے غیر مسلم ادبا میں صرف سکھ قلمکاروں کے ہی اَن گنت ایسے نام سامنے آتے ہیں جو اردو کے خدمت گزاروں اور جاں نثاروں میں شامل ہیں۔ اردو نظم ونثر، صحافت۔ خطابت، ڈرامہ، تنقید وتحقیق وغیرہ غرض ہر صنف اور ہر دور میں سکھ قلمکاروں کی خدمات اردو زبان و ادب کو حاصل رہی ہیں۔ اردو میں سکھ شعرا کی تعداد بہت زیادہ ہے لیکن نثر کے میدان میں ان کی تعداد شاعری کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ ڈاکٹر سیفی پریمی لکھتے ہیں کہ:

''آج ہمارے سامنے سکھ شاعروں کی طویل فہرست موجود ہے جنھوں نے نعت، قصیدہ، سلام وغیرہ مختلف اصناف پر طبع آزمائی کی ہے۔''

(اردو ادب میں سکھوں کا حصہ، ص 11)

اسی طرح سکھ نثر نگاروں کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''سکھوں میں وقیع نثر نگار بھی ہیں۔ ان کی نگارشات آل انڈیا ریڈیو سے نشر کی جاتی ہیں۔ انھوں نے ریڈیو کے لیے فیچر لکھے ہیں۔ بمبئی میں فلم کے مکالمے سپرد قلم کیے ہیں... ممتاز کہانی کار، ناول نویس، ڈرامہ نگار اور نقاد ہیں۔ بعض تخلیقات پر حکومتِ ہند نے انعام بھی دیا ہے۔''

(اردو ادب میں سکھوں کا حصہ، ص 12-11)

اردو کی دیگر نثری اصناف کے ساتھ ساتھ سکھ قلمکاروں

نے ڈرامے کے فروغ میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے اور اردو کے چند گنے چنے بلند پایہ ڈرامہ نگاروں میں سکھ ڈرامہ نگاروں کا نام بھی شامل ہے جن میں ایک اہم نام کرتار سنگھ دگل کا بھی ہے۔

کرتار سنگھ دگل کا شمار صرف پنجاب کے ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے اہم قلمکاروں میں ہوتا ہے۔ دگل کا جنم یکم مارچ 1917 کو راولپنڈی میں ہوا تھا۔ فارمین کرسچن کالج لاہور سے ایم۔اے کرنے کے بعد 1942 میں آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت حاصل کی اور اس کے علاوہ نیشنل بک ٹرسٹ کے ڈائریکٹر بھی رہے۔ دگل کا نام پنجابی زبان وادب میں تو کافی اہمیت رکھتا ہی ہے اس کے علاوہ وہ، اردو، ہندی اور انگریزی میں بھی اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ان کا پنجابی اردو اور ہندی کا کل ادبی سرمایہ جو 41 کہانیوں کے مجموعوں، 33 ڈراموں، 14 ناولوں، 9 تحقیقی وتنقیدی کتابوں، دو سوانح حیات اور 8 شعری مجموعوں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ انگریزی زبان میں ان کی مجموعی تخلیقات 41 ہیں جو ناولوں، افسانوں اور ڈراموں پر مشتمل ہے۔ دگل کے عرصۂ حیات کے ساتھ ساتھ ان کے فن کی عمر بھی کافی طویل رہی مگر اس طویل عرصے میں انھوں نے دیگر زبانوں کے مقابلے میں اردو ادب کو بہت کم تخلیقات عطا کی ہیں مگر جو دی ہیں وہ کافی بلند پایہ، منفرد اور شاہکار ہیں۔ ادب میں دگل کے مقام کے متعلق ڈاکٹر انعام الرحمٰن لکھتے ہیں کہ:

''پنجابی اور اردو ادب میں ان کا مقام وہی ہے جو انگریزی ادب میں ملک راج آنند اور خوشونت سنگھ، اردو ادب میں سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی اور اوپندر ناتھ اشک کا ہے''

(پنجاب میں اردو ڈرامے کی روایت: تفہیم وتجزیہ، ص 402)

کرتار سنگھ دگل کی سلطنتِ اردو نثر نگاری کی سرحدیں صرف افسانے اور ناول تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ انھوں نے صنفِ ڈرامہ میں بھی قابل قدر کارنامے انجام دیے ہیں۔ کرتار سنگھ دگل اردو کے ایک اہم اور مایہ ناز ڈرامہ نگار تھے۔ ان کا ڈرامہ 'دیا بجھ گیا' اور ایک ڈراموں کا مجموعہ 'اوپر کی منزل' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ان کے ڈراموں کا مجموعہ 'اوپر کی منزل' دس ڈراموں پر مشتمل ہے۔ دگل نے زیادہ تر ایکانکی ڈرامے لکھے ہیں اور پنجاب کے ایکانکی ڈراما نگاروں، اوپندر ناتھ اشک، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو اور راجندر سنگھ بیدی کے ساتھ ان کا نام لیا جاسکتا ہے۔ 'ایکانکی ڈراما' ڈرامے کی ایک ایسی قسم ہے۔ جسے انگریزی میں ون ایکٹ پلے (One Act Play) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ون ایکٹ پلے میں سب سے زیادہ اہمیت مرکزی کردار کی رہتی ہے، جس کا پلاٹ بہت مختصر ہوتا ہے اور اس کے بھی کردار مرکزی کردار کو ایک ایکٹ میں پیش کرتے ہیں۔ دگل کا شمار اردو کے ان چند ڈراما نگاروں میں کیا جاتا ہے جن کے ڈرامے فنی اعتبار سے کامیاب اور مکمل کہے جاسکتے ہیں۔ انعام الرحمٰن لکھتے ہیں کہ:

''دگل نے اپنے فن کا لوہا اس وقت منوایا جب ان کے ارد گرد کرشن چندر، سعادت حسن منٹو اور راجندر سنگھ بیدی جیسے افسانہ اور ڈرامہ نگار موجود تھے۔ ریڈیو ڈراموں میں جو مقبولیت دگل کو ملی کسی کو بھی نصیب نہیں ہوئی''

(پنجاب میں اردو ڈرامے کی روایت: تفہیم وتجزیہ، ص 405)

کرتار سنگھ دگل کا ایک مخصوص وصف جو انھیں دوسرے ڈرامہ نگاروں سے ممیز کرتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کے چند ڈرامے مونولوگ Monologue ہیں۔ مونولوگ سے ایسے ڈرامے مراد لیے جاتے ہیں۔ جن میں صرف ایک ہی کردار ہو۔ اس طرح کے ڈرامے ریڈیو کے لیے لکھے جاتے تھے اور ان کے اکثر و بیشتر ڈرامے ریڈیو کے لیے ہی لکھے گئے ہیں۔ ان کے مشہور ریڈیو ڈراموں میں دیا بجھ گیا، پرانی بوتلیں، اپنی اپنی کھڑکی اور 'اوپر کی منزل' شامل ہیں۔ یہ ڈرامے پنجاب اور بیرونِ پنجاب ریڈیو کے علاوہ اسٹیج پر بھی دکھائے گئے ہیں۔ 'اوپر کی منزل' ان کے مونولوگ ڈرامے کا بہترین نمونہ ہے۔ اس ڈرامے کا مرکزی خیال ان مردوں کی کہانی ہے جو اپنی بیویوں کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اس ڈرامے کا مرکزی کردار ایک مرد ہے جو اپنی بیوی پر شک کرتا ہے۔ نمونے کے طور پر اس ڈرامے کے کردار کی خود کلامی کو ملاحظہ کریں:

''مرد:۔ (بھرائی ہوئی آواز میں)
کبھی ایسا ہوا ہے
دنیا میں کبھی ایسا ہوا ہے
کہ کوئی پینتیس سال کی بیوی
پھر سے عشق کرنے لگ جائے
کبھی ایسا بھی ہوا ہے
کہ کوئی تین بچوں کی ماں
کسی پرائے مرد کے لیے پاگل ہوا تھے
کبھی کسی نے یہ بھی سنا ہے
پندرہ سال ایک چھت کے نیچے رہ کر
کوئی یوں آزاد ہو جائے''

(اوپر کی منزل، ص 101-100)

انھوں نے اپنے ڈراموں کو صرف پنجابی ہی نہیں بلکہ ہندوستانی تہذیب اور معاشرت کے پس منظر میں بھی پیش کیا ہے۔ ہندوستان کے تقریباً ہر طبقے کی ترجمانی ان کے ڈراموں میں ملتی ہے۔ ان کے ڈراموں کے کردار امیر، غریب، فقیر اور متوسط غرض ہر طرح کے لوگ ہیں۔ انھوں نے اپنے ایک ڈرامہ 'جھوٹے ٹکڑے' میں ایک فقیر اور رئیس کا نقشہ کچھ یوں کھینچا ہے۔

''ایک: فقیر (گلی میں) بابا اللہ کے نام پر ایک ٹکڑا روٹی! میں بھوکا ہوں۔
بڑھیا: یہ کم بخت پھر آ گیا۔
فقیر گاتے ہوئے
''چڑی چونچ بھر لے گئی ندی نہ گھٹیو نیر''
بڑھیا:۔ یہ پیچھا نہیں چھوڑے گا عشوا سے کچھ دے کر ٹالو۔'' (اوپر کی منزل ص 270)

مکالمے ڈرامہ کی جان ہوتا ہے اور ڈرامے کی کامیابی اسی پر منحصر ہوتی ہے۔ مکالمے سے ہی کسی شخص کے ذہنی رجحان، نفسیات اور مزاج کا پتہ چلتا ہے اور یہ ڈرامہ نگار کی صلاحیت پر منحصر ہے کہ اپنے کردار سے کس قسم کا مکالمہ ادا کروائے۔ دگل نے مکالمہ نویسی کے حوالے سے تمام تر باریکیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہی ڈرامے تحریر کیے ہیں۔ ان کے اکثر و بیشتر ڈرامے ریڈیو کے لیے ہی لکھے گئے ہیں اور ریڈیو ڈرامے چونکہ بصری نہیں بلکہ سمعی ہوتے ہیں اس لیے اس کمی کو مکالموں، صوتی اثرات اور

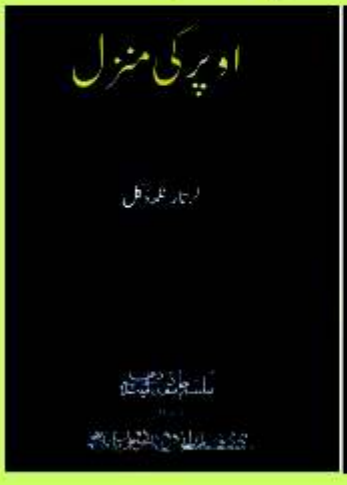

تخیل سے پورا کیا جاتا ہے۔ ان کے ڈراموں کے مکالمے، کرداروں کی انفرادیت ان کے شعور اور عمل کو ظاہر کرتے ہیں۔ موقع محل کی وضاحت بھی مکالمات سے ہی ہوتی ہے۔ ان کے ڈراموں کے مکالمے عام طور پر مختصر ہیں اور جہاں کہیں طویل مکالمے ہیں انھیں چھوٹے چھوٹے جملوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ نمونے کے طور پر ان کے ڈرامہ 'دیا بجھ گیا' سے یہ طویل مکالمہ ملاحظہ کریں:

''نوراں
بیٹا جو تیرے جی میں آئے کر
تو اس گھر کی مالکن ہے
آج میں کتنی خوش ہوں
کشمیر یہ جنت
کشمیر یہ فرشتوں کا دیش
جہاں پریاں آ کر بہلتی ہیں
حوریں جہاں آ کر ستاتی ہیں''

اسی طرح تقریباً ایک سے زائد صفحے پر مشتمل یہ طویل مکالمہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں منقسم ہے۔ دگل کے مکالمے کرداروں کی آمد و رفت کو ظاہر کرنے کے ساتھ ساتھ تخیل کی بیداری اور ریڈیو اسلوب کے لیے بہت ہی موزوں ہیں۔

کرتار سنگھ دگل کے ڈراموں کے پلاٹ مربوط اور متناسب ہیں ان میں عضویاتی وحدت موجود ہے۔ انھوں نے اپنے ڈراموں کے واقعات اور کرداروں کے انتخاب کرنے میں اختصار اور اہمیت کا خاص دھیان رکھا ہے۔ وہ کم سے کم وقت میں اہم واقعات اور کرداروں کو پیش کرنے کے فن سے بخوبی واقف تھے۔ ان کے ڈراموں کے پلاٹ کی تینوں منازل یعنی آغاز، درمیان اور انجام سبھی صاف اور واضح ہوتے ہیں۔ دگل اپنے ڈراموں کے پلاٹ کی ترتیب و تعمیر میں انجماد اور ایجاز و اختصار سے کام لیتے تھے۔ ان کے پلاٹ اپنے اندر ایک معتدل قسم کی رومانیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے المیہ اور طربیہ دونوں قسم کے ڈرامے لکھے ہیں۔ المیہ ڈراموں کی تخلیق آسان نہیں ہوتی اس کا تعلق جذبات سے ہوتا ہے اس لیے ڈرامہ نگار کے لیے یہ از حد ضروری ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے اندر ایسے جذبات پیدا کرے جس سے وہ کامیاب کرداروں کی تخلیق کر سکے۔

دگل کے المیہ ڈراموں میں امانت، جھوٹے ٹکڑے، اور 'دیا بجھ گیا' بہت ہی کامیاب ڈرامے ہیں۔ ان کا ڈرامہ امانت ایک ایسی نوجوان لڑکی کی کہانی ہے، جو جوانی میں موت کے منھ میں چلی جاتی ہے۔ مرتے وقت اس لڑکی کے جذبات ایک مکمل تصویر بن کر ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ اس ڈرامے کا اختتام کچھ یوں ہوتا ہے۔

''لڑکی: اب سن میری چھاتی کی طرف چل پڑی ہے
میرا گلا رک رہا ہے
میری آنکھوں کے سامنے جیسے تارے گھوم رہے ہیں
میری آخری سانس تک
ابا میں جا رہی ہوں
امی میں جا رہی ہوں
بھیا میں جا رہی ہوں
بہنو میں جا رہی ہوں
میں جا.....
لڑکی کی آواز رک جاتی ہے۔''

(اوپر کی منزل ص 212)

اسی طرح 'چھوٹے ٹکڑے' میں بھی دگل نے ایک غریب گھرانے کا نقشہ کھینچا ہے، جس کا ایک نوجوان غربت اور فاقوں کے باوجود بھی اپنی خودداری کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ جھوٹے ٹکڑوں کو وہ نوجوان حقارت سے دیکھتا ہے اور ملامت کرتا ہے۔ مکالمے ملاحظہ کریں:

''باپ: تمھیں کیا ہو رہا ہے
برکت: یوں خیرات دے کر سیٹھ نے ہماری غربت کا منھ چڑایا ہے
باپ: بیٹا!
برکت یہ تمھارے ہاتھ میں ٹارچ کیسی ہے
باپ: حبیب سیٹھ نے دی تھی
برکت: چاندی چاندنی دیکھو کیسے کھلی ہوئی ہے اور سیٹھ نے اسے ٹارچ دی ہے۔ اندھیرے سے بچنے کے لیے چوروں سے بچنے کے لیے۔ ادھر مٹھائی دیتے ہیں ادھر چوروں سے بچانے کا انتظام کراتے ہیں۔ ہمارا کوئی بیری نہیں ہے۔ ہمارے پاس ہے ہی کیا جو کوئی چرا لے جائے گا۔ میں ایسی مٹھائی کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔
بڑھیا: اب لے ہی آئے ہیں تو کھا ہی لے
برکت: مجھے اس میں سے بو آتی ہے۔ میں اسے چھونے تک کو تیار نہیں۔''

(ٹوکری کو فرش پر پھینک دیتا ہے۔)

(اوپر کی منزل، ص 301-302)

المیہ ڈراموں میں دگل کو کافی حد تک کامیابی ملی ہے بلکہ کامیاب ہوئے ہیں لیکن طربیہ ڈرامے لکھتے وقت ان کا قلم ذرا دھیما چلتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے سوچ سوچ کر اور رک رک کر لکھ رہے ہیں۔ ان کے طربیہ ڈرامے رومانیت سے سرشار ہیں۔ ان کے طربیہ ڈرامے 'اپنی اپنی کھڑکی' میں وہ ایک دوشیزہ کے جذبات کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں:

''میرا: کھڑکی بڑی اور چھوٹی کیا کھڑکی میں سے تو کسی کی جھلک ہی لینی ہوتی ہے ایک نظارہ اور کوئی مدہوش ہو جاتا ہے۔ کھڑکی بڑی اور چھوٹی کیا دیکھنا یہ ہے کہ کھلتی کس طرف ہے نیلے آسمان کی جانب یا کسی بدرو کی طرف۔ کھڑکی بڑی اور چھوٹی کیا کھڑکی میں سے تو ٹھنڈی ہوا آتی ہے۔ محبوب کے دیس کی حسین یادیں۔''

(اوپر کی منزل، ص 143)

دگل نے اپنے ڈراموں میں جہاں کہیں عورت کا کردار پیش کیا ہے وہ ہمیں صرف مشرقی عورت کے روپ میں ہی نظر آتی ہے۔ یعنی جس میں توہم پرستی بھی ہے، ایثار بھی ہے، محبت کا پیکر و مجسمہ بھی ہے اور زندگی کے نشیب و فراز سے واقف بھی ہے۔ دگل کے ڈراموں کے نسوانی کرداروں میں نوراں، راجی، میرا اور پروین وغیرہ اس کا اہم نمونہ ہیں۔

المختصر کرتار سنگھ دگل نے اپنے ڈراموں کے ذریعے زندگی کے تمام پہلوؤں کی نمائندگی کی ہے۔ انھوں نے نہ صرف اردو ادب کو بہت سے ڈراموں اور کہانیوں سے نوازا ہے بلکہ پنجابی ادب کو بھی ڈھائی سو کے قریب کہانیاں عطا کی ہیں۔ ان کی تخلیقات میں انسان دوستی، اتحاد، رفاقت، نئے دور کی بشارت، وطن پرستی، سماجی شعور، ہندوستان کی معاشرت کا نقشہ اور قومی تصورات وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے فنی کارنامے ثابت کرتے ہیں کہ دنیا کی کسی بھی زبان پر کسی مخصوص طبقے اور مذہب کی اجارہ داری نہیں ہے۔ زندگی کو سنوارنے اور نکھارنے میں زبان و ادب کا ایک اہم رول ہوتا ہے۔ کرتار سنگھ دگل نے بھی دیگر زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو زبان میں بھی اس کام کو انجام دیا ہے۔ بلاشبہ اردو ڈرامہ نگاری میں ان کا ایک اہم مقام ہے۔ اردو ڈرامہ نگاری بالخصوص پنجاب کی اردو ڈرامہ نگاری کے حوالے سے انھیں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ دگل کو ادبی خدمات کے اعتراف میں پدم بھوشن سمیت ان گنت اعزازات اور ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔

■

Iqbal Ahmed
Research Scholar
Deptt. of Persian,Urdu & Arabic
Punjabi University
Patiala- 147002 (Punjab)
Email:oafgme9111@gmail.com
Contact 9682619937

اکیسویں صدی میں ہندوستان کا اردو افسانہ

شہاب ظفر اعظمی

اکیسویں صدی اردو فکشن کے لیے بہت زرخیز ثابت ہوئی ہے۔ قلم کاروں اور قارئین دونوں کو نثری اصناف میں سب سے زیادہ اردو فکشن نے ہی متوجہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آہستہ آہستہ یہ صدی 'فکشن کی صدی' کے طور پر پہچان قائم کررہی ہے۔ میں یہ بات مبالغتاً نہیں حقیقتاً کہہ رہا ہوں کیونکہ اس صدی کی دو دہائیوں میں جس تواتر کے ساتھ افسانوی مجموعے اس کی مقبولیت، افسانہ نگاروں اور افسانہ پسند قارئین کے بیدار مغز ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ 2017 میں معروف ناقد ڈاکٹر نعیم انیس نے اپنی کتاب 'اکیسویں صدی میں اردو افسانہ' میں نئے افسانوی مجموعوں کی جو نامکمل فہرست بنائی ہے اس میں محض سترہ سالوں میں 350 افسانوی مجموعے شمار کروائے گئے ہیں۔ اس تناسب کا خیال رکھا جائے تو دو دہائی میں یہ تعداد تقریباً 500 تک پہنچ جاتی ہے۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ صدی افسانوی ادب کی صدی کے طور پر شناخت قائم کررہی ہے۔

اکیسویں صدی میں اردو افسانہ لکھنے والوں کی کئی نسلیں ایک ساتھ لکھ رہی ہیں۔ کچھ ترقی پسند تحریک کی یادگار ہیں، کچھ جدیدیت کی دین ہیں، کچھ مابعد جدیدیت کے قائل اور کچھ بالکل نئے زمانے یعنی اکیسویں صدی کی نئی نسل سے تعلق رکھنے والے۔ ان تمام لکھنے والوں میں کم وبیش سب نے عصری مسائل کو اپنے فکشن میں برتا ہے۔ موضوعات کی تخصیص نہیں رہی ہے۔ مثبت اور منفی کی خانہ بندی نہیں رہی۔ افسانہ چاہے بیانیہ ہو یا علامتی، جدید رہا ہو یا غیر جدید، عصری موضوع ہر زمانے میں اور ہر طرح کے افسانوں میں موجود رہا۔ اس سلسلے میں اقبال مجید، رتن سنگھ، شفیع جاوید، جیلانی بانو سے حسین الحق، عبدالصمد، شوکت حیات، سلام بن رزاق، انیس رفیع، علی امام، شموئل احمد اور بعد میں سید محمد اشرف، نورالحسنین، مشرف عالم ذوقی، نگار عظیم، قمر جہاں، خورشید حیات، ثروت جہاں اور صغیر رحمانی وغیرہ کی نسل تک کے متعدد افسانے بطور مثال پیش کیے جاسکتے ہیں۔

موجودہ جدید ترین عہد جسے اکیسویں صدی کے نام سے جانا جاتا ہے، یہ موضوعاتی، فکری اور تہذیبی اعتبار سے گذشتہ صدی سے کئی معنوں میں مختلف ہے۔ یہ عہد انفارمیشن ٹکنالوجی کا عہد ہے، انٹرنیٹ، ویب سائٹ، پورٹل، ای میل، ایس ایم ایس، واٹس اپ، ٹوئٹر، گوگل سرچ، وکی پیڈیا موبائل، انٹرنیٹ، ای کتب، ای لائبریری نے اسکول کالج اور یونیورسٹی ہی نہیں ہماری زندگیوں میں بھی انقلاب پیدا کردیا ہے۔ نئے مسائل، نئے موضوعات اور نئے راستوں سے آشنا کیا۔ مگر دوسری طرف زندگی کو سہل اور آسان بنانے کی جتنی راہیں ہموار ہوئیں، آسائشوں کے دروازے بھی کھل گئے۔ کاریں، فلیٹس، موبائل اور ٹیبلیٹ ہمارے لیے اسٹیٹس سمبل بن گئے۔ انسان کی پوری توجہ مادی آسائش، پرائیویسی حصول دولت پر ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فحاشی، ہوس پرستی، قتل وغارت گری، زنا، درندگی اور غیر انسانی افعال نے معاشرے کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ انسانیت کا زوال آخری حد کو پہنچ گیا اور رشتوں کا تقدس باقی نہ رہا۔ اب مسائل کا ایک نیا انبار ہے جو اسے اپنی گرفت میں لے کر مثبت اور توانا قدروں کی جانب سوچنے کا بھی موقع نہیں دیتا۔ چنانچہ وہ فکشن نگار جو بیسویں صدی سے لکھتے آرہے ہیں یا وہ جنھوں نے اسی صدی میں لکھنا شروع کیا ہے، دونوں کے یہاں اس عہد کے نئے مسائل شعوری یا غیر شعوری طور پر حاوی ہیں۔ ایک طرف جیلانی بانو، عبدالصمد، غضنفر، حسین الحق، سلام بن رزاق، شوکت حیات، شموئل احمد، طارق چھتاری، سید محمد اشرف، بیگ احساس، نورشاہ، خورشید حیات، انیس رفیع، نورالحسنین، شاہد اختر، ذکیہ مشہدی، ترنم ریاض، نگار عظیم، احمد صغیر، صغیر رحمانی، اسرار گاندھی، مشرف عالم ذوقی، مشتاق احمد نوری، غزال ضیغم، دیپک بدکی، اسلم جمشید پوری، فیاض رفعت، عشرت بیتاب، اقبال متین، انجم عثمانی، مشتاق اعظمی، ف س اعجاز، صدیق عالم، حمید سہروردی، اقبال حسن آزاد، شہیرہ سرور، قاسم خورشید، فخر الدین عارفی، عشرت ظہیر اور ابن کنول وغیرہ ہیں جو ماقبل صدی سے لکھ رہے ہیں مگر نئی صدی کے مسائل وموضوعات نے بھی انھیں اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ دوسری طرف نئے لکھنے والے بھی خاصی تعداد میں ہیں جن کے موضوعات نئی صدی کے مسائل کے ساتھ ہی شروع ہوئے ہیں۔ ایسے افسانہ نگاروں میں کہکشاں پروین، مسرور تمنا، اشرف جہاں،

شبیر احمد، پرویز شہریار، ایم مبین، سید احمد قادری، نعیم اختر، فاروق راہب، بلراج بخشی، وحشی سعید، یسین احمد، خالد جاوید، اشتیاق سعید، سلمیٰ صنم، بشیر مالیر کوٹلوی، صادقہ نواب سحر، شائستہ فاخری، تسنیم فاطمہ، افشاں ملک، شبانہ رضوی، غزالہ قمر اعجاز، فرقان سنبھلی، ارشد نیاز، مشتاق احمد وانی، مہ جبیں انجم، زیب النسا، ریاض توحیدی، ابرار مجیب، آشا پربھات، عشرت ناہید، شہناز رحمان، نشاں زیدی، احمد رشید، نوشابہ خاتون، رخسانہ صدیقی، عنبری رحمان، اختر آزاد، مہتاب عالم پرویز، نیاز اختر، نصرت شمس، شارقہ شفتین، سلمان عبدالصمد، سفینہ، شفقت نوری، نہال آڑھوی، ترنم جہاں شبنم، وسیم عقیل شاہ، مستمر محمد علیم اسماعیل، رومانہ تبسم اور ذاکر فیضی وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ میں یہاں پر واضح کردوں کہ کسی نسل کا ذکر کرتے ہوئے فہرست سازی قطعی مقصود نہیں اس لیے مثالاً جن کے نام یاد آرہے ہیں ذکر کررہا ہوں۔ اس سے کہیں زیادہ نام ہو سکتے ہیں جو اپنے عہد کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان تمام لکھنے والوں نے عہد حاضر کے جن مسائل کو خصوصی طور پر اپنے افسانوں میں برتا ہے وہ ہیں ماحولیات کا تحفظ، پانی کی قلت، مذہبی منافرت، شدت پسندی، مسلک کی لڑائی، فرقہ پرستی، دہشت گردی، عورتوں کی آزادی، روایتی عورتوں کے خانگی مسائل، تانیثی احتجاج، انسانیت کا زوال، خودغرضی و بے ضمیری، وطن سے محبت، انسان کی جنسی کج روی، زرد صحافت اور دلت طبقات کے مسائل وغیرہ۔ کچھ افسانوں کے نام شمار کرتے ہوئے مثالاً ایک دو افسانے پر گفتگو کرنے کی کوشش کروں گا۔ مثلاً ماحولیات کے تحفظ، پانی کی قدر و قیمت، شجر کاری کی اہمیت پر جو افسانے لکھے گئے ہیں ان میں مہتاب عالم پرویز کا افسانہ 'کارواں' مہ جبیں انجم کا افسانہ 'بے جڑ کا پودا' فرقان سنبھلی کا 'آب حیات' اور اختر آزاد کا افسانہ 'پانی' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان میں ماحولیات کے تحفظ کے ساتھ شجر کاری، پانی کی قدر و قیمت اور آلودگی یعنی Pollution کے مسائل خوبصورتی سے پیش کیے گئے ہیں۔

پانی، پودے اور ماحول: نئی صدی میں پورے ملک میں رائج کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مہ جبیں انجم نے اپنے افسانے 'بے جڑ کا پودا' میں اسی فکر کو فنکاری سے برتا ہے۔ کہانی میں ایک درخت اور اس کا نگہبان بس دو کردار ہیں اور دونوں ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں۔ مگر وقت کے ساتھ ان دونوں کی محبت میں کمی ہوجاتی ہے اور درخت سوکھنے لگتا ہے۔ کہانی بیانیہ کی تہ داری کے سبب مختلف ابعاد کی حامل ہے۔ پیڑ کا سوکھنا محبت کے فقدان کی علامت بھی ہوسکتا ہے۔ مگر ظاہری سطح پر یہ کہانی تحفظ ماحولیات کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ ایک طرف پانی کے تحفظ کا درس دیتی ہے تو دوسری طرف پیڑ پودوں کی بقا کی اہمیت واضح کرتی ہے جس کا تعلق پانی کے وجود سے ہی ہے۔ اسی لیے کہانی کے اختتام پر جب پیڑ کی زندگی کے لیے پانی کی ضرورت پڑتی ہے تو نگہبان اس کی تلاش میں نکل پڑتا ہے:

''نگہبان مجھے دلاسہ دے کر پانی کی تلاش میں نکل پڑا۔

دن ڈھل گیا، وہ نہیں لوٹا تو مجھے تشویش ہونے لگی۔ مگر رات کے پر پھیلانے سے پہلے وہ لوٹ آیا۔ بدحال۔ تھکا ماندہ... مگر اس کے ہاتھوں میں پانی دیکھ کر میرے نازک وجود میں سرور کی لہریں دوڑ گئیں۔ اس نے وہ پانی مجھ پر چھڑکا تو مجھے لگا جیسے میرے تن سے جڑیں پھوٹ رہی ہوں۔'' (افسانوی مجموعہ 'پیاس'، 2004)

گویا پیڑ پودوں کی بقا پانی پر منحصر ہے۔ افسوس ہم پانی کی اہمیت سے ناواقف ہیں۔ زندگی کے وجود کے لیے سب سے ضروری چیز پانی کا تحفظ نہیں کرسکے ہیں۔ اسی لیے فرقان سنبھلی اپنے افسانہ 'آب حیات' میں ایک کردار سے کہلواتے ہیں کہ:

''ہمارے سیارے پر ہر سہولت اور ہر شے موجود ہے جو کسی بھی آکاش گنگا میں پائی جاتی ہوگی لیکن ہمارے بزرگوں نے ترقی کی اندھی خواہش میں نہ صرف کنکریٹ کے جنگل کھڑے کیے بلکہ تالاب پاٹ ڈالے، ہرے بھرے پیڑ کاٹ ڈالے اور یہاں تک کہ قدرت کے ساتھ دشمنی کی کہ سیارے کی آب وہوا آلودہ ہوگئی، پانی سوکھ گیا۔ ندی نالے ختم ہوگئے۔ یہاں کی مخلوق پانی کی قلت سے تل تل مرنے لگی۔'' (مجموعہ 'آب حیات' 2010)

فرقان سنبھلی نے پانی کی قدر و قیمت اور اس کے تحفظ کو زندگی و دنیا کی بقا کے لیے بنیاد قرار دیا ہے۔

مذہب، نفرت اور دہشت: مذہبی شدت پسندی ہمارے ملک کا بڑا مسئلہ ہے، جس نے منافرت کی ایسی دیوا رکھڑی کی ہے کہ بدامنی، فرقہ واریت اور فسادات ہمارا مقدر ہوگئے ہیں۔ فسادات اور فرقہ واریت پر یوں تو پہلے سے افسانے لکھے جاتے رہے ہیں، مگر موجودہ عہد میں مذہبی شدت پسندی اور منافرت کو افسانہ نگاروں نے نئے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں خورشید اکرم کا افسانہ 'مذبح کی بھیڑیں'، ذوقی کا افسانہ 'لیبارٹری' ایم مبین کا 'نئی صدی کا عذاب' خورشید حیات کا 'انسانیت کے دشمن' صغیر رحمانی کا افسانہ 'داڑھی' ارشد نیاز کا 'یہ جہاد نہیں انتقام ہے' اور ریاض توحیدی کا افسانہ 'جنت کی چابی' وغیرہ پڑھے جاسکتے ہیں۔

مثلاً خورشید حیات نے 'انسانیت کے دشمن' میں دو دوستوں کی طنزیہ کہانی رقم کی ہے جن میں ایک ہندو ہے اور دوسرا مسلم۔ یہ دونوں نئی نسل کے ان نوجوانوں کی نمائندگی کررہے ہیں جن کے ذہن ہر قسم کی فرقہ واریت، شدت پسندی اور منافرت سے آزاد ہیں۔ یہ ایک صالح، امن پسند اور محبتوں سے بھرپور معاشرے کا خواب دیکھتے ہیں۔ مگر سیاست اور فرقہ واریت انہیں ایسے حالات سے دوچار کردیتی ہے جسے وہ سمجھنے سے قاصر ہیں:

''رحیم میرے بھائی، ابھی کوئی ہندو نہیں، کوئی مسلمان نہیں، کبھی انسانیت کے دشمن ہیں۔ چلو ہم دونوں اس شہر، جنگل سے دور چلیں۔ غموں سے لدے ہوئے دونوں راکیش اور رحیم ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے، ان کے معصوم ذہن میں طرح طرح کے سوالات ابھر رہے تھے مگر وہ اپنے سوالوں کا جواب کس سے پوچھیں؟ کس سے مانگیں؟ (مجموعہ 'ایڈز' 2000)

اسی نفرت اور شدت پسندی کو کشمیر کے تناظر میں ریاض توحیدی نے 'جنت کی چابی' میں ایک نئے کینوس پر پیش کیا ہے۔

'جنت کی چابی' یا اس طرح کے دیگر افسانے دراصل دہشت گردی، مذہبی منافرت اور شدت پسندی کی صورت میں عصر حاضر کے ان المیوں کا آئینہ ہیں جو ہمارے معاشرے میں تیزی کے ساتھ پنپ رہے ہیں۔

سیاست، فرقہ واریت اور قومی یک جہتی: اس طرح کے مسائل کا تعلق ہماری سیاست سے بھی ہے۔ سیاست اور ملک کی سیاسی صورت حال پر مشرف عالم ذوقی کے افسانے گلدان، لیبارٹری، ذکیہ مشہدی کا 'بھیڑیے سیکولر تھے' شاہد اختر کا 'کتے' ابرار مجیب کا 'رات کا منظر نامہ' اور احمد رشید کے افسانے ناخدا، مداری اور اندھا قانون وغیرہ پڑھے جاسکتے ہیں۔

مگر ان افسانہ نگاروں نے سیاسی صورت حال سے پیدا شدہ تاریکی میں روشنی بکھیرنے والے کرداروں کو بھی گڑھا ہے۔ ہمارے ملک کی بنیاد قومی یک جہتی اور وسیع المشربی پر قائم ہے۔ صدیوں سے ہندو مسلمان اس ملک میں ایک ساتھ رہتے چلے آرہے ہیں اور ان میں باہمی تعلقات بھی ہیں۔ کبھی کبھی ان کے درمیان اختلافات ہوتے ہیں۔ اس کا فائدہ سیاسی پارٹیاں اٹھاتی ہیں۔ نئے افسانہ نگاروں نے اکثر اپنی کہانیوں سے ہندو مسلمان کے درمیان خلیج کو کم کرنے اور محبت کا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ذوقی کے افسانے مگر نمچی، ہجرت، قیصر اقبال کا افسانہ 'مٹی' شفیع مشہدی کا 'پنڈدان' سید احمد

قادری کا 'زندگی کے لیے' مجیر احمد آزاد کے افسانے 'پہچان'، 'تاریک راتیں' اور قیام نیر کا افسانہ 'دھوپ سایہ' وغیرہ اسی قبیل کی کہانیاں ہیں۔ مثلاً سید احمد قادری کے دو کردار دیکھیے شیخ رحمت اور مکند پرساد، جن کے درمیان نہر کے پانی کے بٹوارے پر جھگڑا ہو جاتا ہے اور گاؤں دو گروپ میں منقسم ہو جاتا ہے۔ اسی دوران زبردست سیلاب آ گیا اور افراتفری مچ گئی۔ رمضان کا مہینہ تھا، سارے گاؤں نے سب سے اونچی جگہ یعنی مندر کو پناہ گاہ بنالیا۔ افطار کا وقت آ گیا۔ شیخ رحمت نے سوچا افطار کیسے ہو؟ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک بھیڑ کو چیرتا ہوا مکند پرساد اور ان کا بیٹا ارون سامنے آیا۔ ان کے ہاتھ میں پنڈت کی تھالی تھی، جس میں کئی طرح کے پھل تھے اور لوٹا میں پانی تھا۔ مکند پرساد شیخ رحمت کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا اور بولا "تم لوگ روزہ سے ہو، سمئے ہو گیا ہے، روزہ کھول لو"۔ شیخ رحمت نے مکند پرساد کی باتیں سنیں اور ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ جلدی سے کھڑے ہو گئے اور مکند پرساد کو گلے لگاتے ہوئے کہا" انسانیت ایک ایسا رشتہ ہے جس کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔" (افسانوی مجموعہ 'ملبہ' 2015)

اسی طرح مجیر احمد آزاد 'برگد' میں سماجی ہم آہنگی کا درس دیتے ہیں کہ چودھری ونشی دھر کی شخصیت برگد کے پیڑ کی طرح ہے جس کے سائے میں ہندو مسلمان راحت اور سکون پاتے ہیں۔ رحمان شاہی 'سانپ کا پھن پکڑنے والے' میں یہ دکھاتے ہیں کہ گاؤں کے بھولے بھالے عوام آپس میں مل جل کر رہتے ہیں لیکن نیتا جی کی طرح کوئی خرافاتی سیاست کا کھیل کھیل کر سماجی اعتماد کو ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح تمام نئے افسانہ نگار نہ صرف سیاسی داؤں پیچ سے قارئین کو واقف کراتے ہیں بلکہ ملک کی سالمیت، سماجی ہم آہنگی کا درس دے کر سماج کو بہتر اور پرامن بنانے میں تعاون کرتے ہیں۔

تانیثیت، بغاوت اور نسائی حسیت: 'عورت' ہمیشہ اردو فکشن کا مرکزی موضوع رہی ہے۔ انھیں موضوع بنانے والوں میں عورتیں خود بھی رہیں اور مردوں نے بھی اپنے طور پر انھیں پیش کیا۔ نئے زمانے میں تانیثیت، نسائی حسیت اور نسوانیت کے حوالے سے عورتوں کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش فکشن نگاروں نے کی ہے۔ موجودہ عہد کی عورت روایتی عورتوں کے برعکس خوداعتمادی اور جرات کا مظاہرہ کرتی ہے۔ وہ مجبور نہیں رہی، اپنے مسائل سے خود نبرد آزما ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ وہ خود کو Empower بھی کر رہی ہے۔ اور اپنی ہم جنس خواتین کو Empower کرنے کی کوشش بھی کر رہی ہے۔ اشرف جہاں کا افسانہ 'اکیسویں صدی کی نرملا' نفیس بانو شمع کا 'برف کا آدمی' غزال ضیغم کا 'سوریہ ونشی چندر ونشی' شائستہ فاخری کا 'اداس لمحوں کی خودکلامی' رفیعہ شبنم عابدی کا 'کہو قبول ہے' غزالہ قمر اعجاز کا 'کھو کھلے رشتے' کہکشاں پروین کا 'تواپر کی عورت' تسنیم فاطمہ کا 'آدھا چاند' سلمیٰ صنم کا 'یخ لمحوں کا فیصلہ' ترنم جہاں شبنم کا 'کوکھ کی تلاش' عشرت ناہید کا 'آج کی حوا' اور رخسانہ صدیقی کے 'وجود' میں عورت ایک خاص تیور کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ یہ عورت آج کی عورت ہے جو سماج کی ناانصافیوں کو برداشت تو کرتی ہے مگر اسے نوشتۂ تقدیر سمجھ کر قبول نہیں کرتی۔ نگار عظیم کا افسانہ 'حصار' دیکھیے جس میں زاہدہ اپنی بیٹی کی تعلیم کے لیے اپنے شوہر کے سامنے تن کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ زاہدہ تعلیم یافتہ تھی اس لیے تعلیم کی اہمیت سے واقف تھی۔ اُس کا شوہر مزمل بیٹی کو زیادہ پڑھانے کے حق میں نہیں تھا۔ اپنی بیٹی کا کالج کے دوستوں کے ساتھ ایک گروپ فوٹو دیکھ کر مزمل آگ ببولا ہو جاتا ہے۔ زاہدہ سے تو تو میں میں کے بعد وہ بیٹی کو گھسیٹ کر ایک طرف لے گیا اور زاہدہ کو کئی تھپڑ رسید کر دیے کہ بیٹی کی بے راہ روی کا ذمہ دار وہ اسی کو مانتا تھا۔ ایسے میں زاہدہ کے اندر کی عورت بیدار ہو گئی:

"تھپڑ کھانے کے بعد زاہدہ سنبھلی... اور اپنی تمام قوت بٹور کر دہاڑی... بس... خاموش... ہاتھ میرا بھی اُٹھ سکتا ہے۔ میری بیٹی پڑھے گی اور ضرور پڑھے گی۔ بیوی کی مضبوط آواز اور اٹل قوت ارادی دیکھ کر مزمل بھونچکا سا رہ گیا" (گہن)

اسی طرح سلمیٰ صنم عورتوں کے ساتھ عدم مساوات اور جانبدارانہ رویے سے دلبرداشتہ ہیں اس لیے عورت کے حقوق منواتے ہوئے ان کے لہجے میں سہما کی کے بجائے بلاخوفی ہے۔ انھیں ان مراعات سے کد ہے جن سے رحم اور ترس کی بو آتی ہے۔ وہ معاشرہ جس کی کم وبیش نصف آبادی عورت پر مشتمل ہے محض اس لیے اسے آزادی سے محروم نہیں رکھا جا سکتا کہ وہ عورت ہے۔ اس کے لیے اختیارات وقوانین کا معیار جدا کیوں؟ یہ سوال بار بار صادقہ نواب سحر، ثروت خان، سلمیٰ صنم، اشرف جہاں، شائستہ فاخری، افشاں ملک سے شہناز رحمان تک سب نے اٹھائے ہیں۔ سلمیٰ صنم کی کہانی 'یخ لمحوں کا فیصلہ' کی ثانیہ اپنے فیصلے کا حق نہیں کھونا چاہتی۔ اسی لیے شوہر منصور کی خواہش کہ 'لڑکی ہے اس لیے حمل ضائع کرو' اور دھمکی کہ 'ایسا نہ کرنے پر وہ دوسری شادی کر لے گا' کے باوجود ثانیہ بیٹی کو جنم دینے کے اپنے حتمی فیصلے پر اٹل رہتی ہے۔ ثروت خان کی 'مانگی' کی عزت نفس پر حملہ ہوتا ہے تو وہ شوہر پر ہاتھ اٹھا دیتی ہے، شائستہ فاخری کی ثانیہ غفور بڑے اعتماد کے ساتھ شوہر کو طلاق دے کر آزادی حاصل کرتی ہے اور اشرف جہاں کی عورت بیٹی کو یہ تعلیم دیتی ہے کہ 'عورت کی شکتی کچھ ارن کرنے میں ہے'۔ صادقہ نواب سحر کے افسانے 'راکھ سے بنی انگلیاں' کی تبسم زیدی، اختر آزاد کے 'شدھی کرن' کی 'عورت'، تبسم فاطمہ کے حجاب کی 'نجمہ باجی' نورالحسنین کے 'زہر' کی اوشا اور بشیر مالیرکوٹلوی کے افسانہ 'سلگتے لمحوں کا حساب' کی نیلما میں بھی ایسی ہی عورت دکھائی دیتی ہے۔ گویا اکیسویں صدی کے افسانوں میں عورت کا ایک نیا روپ ابھر کر سامنے آتا ہے جس نے حالات کا مقابلہ کرنا سیکھ لیا ہے اور جو مردوں کے شانہ بشانہ چل کر سماج اور ملک کو بہتر بنانے میں نمایاں رول ادا کر رہی ہے۔

دلت، انصاف اور احتجاج: دلت کردار اور دلت طبقے کے مسائل ہندستانی سماج کا اہم حصہ رہے ہیں اور دوسری زبانوں میں ماقبل صدی سے ہی اہم موضوع کے طور پر برتے جاتے رہے ہیں۔ مگر اردو میں دلت مسائل پر افسانے نسبتاً کم لکھے گئے ہیں۔ ہمارے سینئر لکھنے والوں میں پریم چند، کرشن چندر، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس، سلام بن رزاق، انور قمر، ساجد رشید، غضنفر، شوکت حیات اور جابر حسین وغیرہ نے دلت کہانیاں لکھی ہیں مگر اس میں زیادہ رفتار اکیسویں صدی میں پیدا ہوئی ہے۔ شموئل احمد، مشتاق احمد نوری، ذوقی، رحمان شاہی، صغیر رحمانی، احمد صغیر، قاسم خورشید، اختر آزاد اور مجیر احمد آزاد وغیرہ کے یہاں دلت موضوعات پر کہانیاں کثرت سے ملتی ہیں۔ احمد صغیر نے تو ایک مجموعہ ہی مکمل طور پر دلت افسانوں کا پیش کر دیا ہے جو 'کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے' کے نام سے دلت ڈسکورس کو آگے بڑھاتا ہے۔ دلت موضوع پر اکثر افسانہ نگاروں نے احتجاج اور انتقام کے بجائے حالات کی تبدیلی کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ احمد صغیر کے افسانے 'تعفن'، 'شدھی کرن'، 'پیاسی زمیں پیاسا آسماں'، اسلم جمشید پوری کا افسانہ 'بنتے مٹتے دائرے' صغیر رحمانی کا 'ناف کے نیچے' مجیر احمد آزاد کا 'ڈوم' وغیرہ اس سلسلے میں نمائندہ کہانیاں کہی جا سکتی ہیں۔

گویا جہاں تک موضوعات کا تعلق ہے، نئے افسانوں میں وہ سب کچھ ہے جو ہماری آج کی زندگی کو متاثر کر رہا ہے۔ نئے افسانہ نگار اپنے عہد کے مسائل اور مزاج سے باخبر ہیں اور ظاہری طور متاثر کرنے والے واقعات وحالات سے گزر کر ان کے اسرار ورموز تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس لیے ان کے افسانے محض تہذیب اور قدروں کی بے ضابطگی، بے اصولی اور آزادروی کو نہیں درشاتے، بلکہ دھڑکتے دل اور بے چین روح کی حقیقتوں کو پیش کرتے ہیں۔ گویا نئے افسانہ نگاروں کے یہاں موضوعات کا تنوع ہے۔ انھوں نے قومی، ملکی مسائل اور تغیرات کے ساتھ چھوٹی چھوٹی باتوں، معمولی اور غیراہم

حادثوں کو بھی افسانے کا موضوع بنایا ہے جو بظاہر غیر اہم ہوتے ہیں مگر ان کے بطن سے قدروں کے زوال، رشتوں کی ناقدری، کرپشن، استحصال اور بے بسی جیسے مسائل سر ابھارتے ہیں اور قاری کو دعوت فکر دیتے ہیں۔

فن، اظہار اور اسلوب: موضوعات کے علاوہ فنی ٹریٹمنٹ، تکنیک اور اسلوب کے اعتبار سے بھی کچھ نئے افسانہ نگاروں کے یہاں تبدیلی کی ایک جھلک ملتی ہے۔ ان کے افسانوں میں اُس طرح کا بیانیہ یا علامتی اظہار نہیں پایا جاتا جس طرح جدیدیت کے دور میں افسانوں میں پایا جاتا تھا کہ عام قاری کی اکتاہٹ کا سبب بن جائے۔ نئے افسانے نئی لفظیات اور تہ دار معنویت کے ساتھ قاری کو جوڑے رکھتے ہیں۔ یہ پورے اعتماد کے ساتھ اظہار و اسلوب کے تجربات کر رہے ہیں۔ نئی ترکیبوں، نئی تشبیہات اور نئے الفاظ و محاورات کے ساتھ وہ مروجہ اسالیب کو نئی جہت بخشنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کے افسانوں پر عینیت پسندی کے بجائے حقیقت پسندی اور عقلیت زیادہ حاوی ہے۔ سائنسی اصطلاحات، انگریزی ہندی الفاظ اور گلوبل ولیج کے طور پر انٹرنیٹ یا سوشل میڈیا کے ذریعے پوری دنیا میں رائج ہونے والی زبان ان کے افسانوں کی زبان بن رہی ہے۔ زبان ہی نہیں افسانوں کی ہیئت اور تکنیک پر بھی سوشل میڈیا اور فلمی تکنیکوں کے اثرات مرتسم ہو رہے ہیں۔ کولاژ تکنیک، مکالماتی تکنیک اور Patches کے سہارے لکھے جانے والے افسانے مشرف عالم ذوقی، اسلم جمشید پوری، اختر آزاد، خورشید حیات سے سلمان عبدالصمد، اویناش امن، فرقان سنبھلی اور رومانہ تبسم وغیرہ تک پائے جاتے ہیں۔ یہ واضح بیانیہ کا استعمال کرتے ہیں مگر ساتھ ساتھ "برہنہ حرف نگفتن کمال گویائیست" کی طاقت سے بھی واقف ہیں اس لیے اپنی کہانیوں میں تہہ داری، معنویت اور تاثیر پیدا کر کے تخلیقی افسانوی اسلوب پر گرفت کا بھی اظہار کرتے ہیں۔ یہ کرداروں اور واقعے کے اعتبار سے زبان کا استعمال کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ مصنوعی زبان کے بجائے حقیقی اور رائج زبان میں کہانی کہی جائے تاکہ حقیقت نگاری مجروح نہ ہو۔ چنانچہ انگریزی، ہندی یا علاقائی زبان کے الفاظ استعمال کرتے ہوئے انھیں کہیں جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ روزمرہ کی زبان میں چونکہ انگریزی ہندی یا علاقائی لفظیات گھل مل گئی ہیں اس لیے ان کا افسانوں میں در آنا تعجب خیز نہیں شرط یہ ہے کہ استعمال میں تخلیقیت، روانی اور برجستگی برقرار رہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ افسانہ نگاروں نے ایسی لفظیات کو نہ صرف بخوبی متن کا حصہ بنایا ہے بلکہ کبھی کبھی افسانوں کے عنوانات میں بھی اسے شامل کر کے بدلتے اسلوب کی جانب اشارہ کر دیا ہے۔ مثلاً فزکس، کیمسٹری، الجبرا (مشرف ذوقی) بیسمنٹ (جابر حسین) سنسکرتی کا پانچواں ادھیائے (ذکیہ مشہدی) لالی پاپ (اشتیاق سعید) پشپ گرام کا اتہاس (ابرار مجیب) ریلٹی شو (اختر آزاد) ہستک چھیپ (ابن کنول) لافٹر شو (سلام بن رزاق) پنک پینتھر (شائستہ فاخری) کپل وستو (عشرت ظہیر) اور دکھ نکلوا (اسلم جمشید پوری) وغیرہ۔ نئے افسانوں کی زبان میں علاقائی، مقامی اور انگریزی لفظیات کے استعمال سے بیانیہ میں نیاپن اور حقیقی رنگ پیدا ہوا ہے جو افسانوی اسلوب کے لیے نیک فال ثابت ہوگا۔

> ادب کی تاریخ میں ایسا نہیں ہوتا. مقبولیت دھیرے دھیرے حاصل ہوتی ہے اور فن میں پختگی بھی آہستہ آہستہ پیدا ہوتی ہے.صبر وتحمل سے نئے لکھنے والوں کو اس وقت کا انتظار کرنا چاہیے جب وہ اُس منزل پر پہنچ جائیں کہ کسی بھی تحریر میںان کا ذکر ناگزیر ہو جائے۔

آخری بات: مختصر یہ کہ موجودہ افسانوں میں عہد نو کے جتنے موضوعات، مسائل اور اسالیب ہو سکتے ہیں وہ سب برتے جا رہے ہیں اور تشفی بخش تعداد میں افسانے سامنے بھی آ رہے ہیں۔ موضوعات و مسائل اور زبان کے لحاظ سے نہ تو اردو افسانہ کم تر ہے اور نہ ہی تہی دامن۔ مگر ایک سوال ذہن میں ضرور پیدا ہوتا ہے کہ نئی صدی میں بھی دو دہائی کا عرصہ بیت گیا، افسانوں کی ایک معتد بہ تعداد سامنے آچکی مگر اب تک ان افسانہ نگاروں میں سے اکثر نے نمایاں شخصیت قائم کیوں نہیں کی؟ یا ان کے افسانوں نے وہ توجہ حاصل کیوں نہیں کی جنھیں بلا تردد اردو افسانوں کے کسی انتخاب میں بغیر کسی اختلاف کے شامل کیا جا سکے۔ اس کی دو وجوہات مجھے فوری طور پر نظر آتی ہیں۔ اول تو یہ کہ ہمارے نئے افسانہ نگار بہت جلد Over confidence کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی ذہانت اور تجربہ پر تو اعتماد کرتے ہیں مگر مطالعے اور مشوروں کو خاطر میں نہیں لاتے۔ تمام بڑے افسانہ نگاروں نے یہ مانا ہے کہ لکھنے کے لیے مطالعے کا وسیع ہونا ضروری ہے۔ جتنا زیادہ مطالعہ ہوگا تحریر میں اتنی زیادہ نیرنگی، قوت اور تاثیر پیدا ہوگی۔ سوشل میڈیا نئے لکھنے والوں کو بہت جلد پہچان دے دیتا ہے مختلف سائٹس پر افسانہ پہنچ کر ڈھیر سارے لائکس اور کمنٹس بٹور لیتا ہے اور افسانہ نگار کو غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ اس کے فن میں کسی قسم کی کمی نہیں ہے۔ جبکہ ادب میں لکھنے والے کو تحمل کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ سوشل میڈیا کی تعریفیں تنقید کا معیار نہیں، اور نہ ہی صدفی صد حقیقت پر مبنی ہوتی ہیں۔ نئے لکھنے والے کاتا اور لے دوڑی کا شکار بھی ہیں۔ وہ فوراً افسانے کی اشاعت اور اس کا معاوضہ چاہتے ہیں۔ وہ افسانے پر سخت تنقید برداشت نہیں کر پاتے، یہاں تک کہ کسی مضمون میں ان کا نام شامل نہ کیا جائے تو وہ ناقد کو ہی معتوب قرار دے دیتے ہیں۔ ادب کی تاریخ میں ایسا نہیں ہوتا۔ مقبولیت دھیرے دھیرے حاصل ہوتی ہے اور فن میں پختگی بھی آہستہ آہستہ پیدا ہوتی ہے۔ صبر و تحمل سے نئے لکھنے والوں کو اس وقت کا انتظار کرنا چاہیے جب وہ اُس منزل پر پہنچ جائیں کہ کسی بھی تحریر میں ان کا ذکر ناگزیر ہو جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ افسانہ صرف موضوع یا مسئلے سے افسانہ نہیں بنتا ہے۔ کسی کہانی کو افسانہ بنانے کے لیے موضوع سے زیادہ اسلوب پر توجہ دینی پڑتی ہے۔ یعنی موضوع تو اہم ہے مگر لکھنے والے کا اس کے ساتھ فنی ٹریٹمنٹ کیسا رہا ہے؟ اظہار کا کون سا اسلوب اس نے اپنایا ہے؟ جب تک اس پر توجہ نہیں ہوگی، 'افسانہ' کامیاب افسانوں' کی فہرست میں شامل نہیں ہو سکے گا۔ جس طرح شعر موضوع اور اسلوب کو ملا کر 'بنایا' جاتا ہے اسی طرح افسانہ بھی صناعی کا تقاضا کرتا ہے۔ اسے بنانا پڑے گا۔ میں نے پہلے بھی ایک جگہ لکھا تھا کہ ادب کو غیر ادب سے جو چیز ممتاز کرتی ہے وہ 'اسلوب' ہے۔ یعنی اصل مسئلہ 'اسلوب' کا ہے۔ اسلوب افسانے کو کہانی سے آگے بڑھا کر 'فن پارہ' بناتا ہے۔ یہ درست ہے کہ ہر موضوع اپنا اسلوب خود لے کر آتا ہے مگر اس اسلوب کو شتر بے مہار بننے سے روکنا فنکار کا کام ہے۔ آج زیادہ تر نئے افسانہ نگاروں کا حال یہ ہے کہ اُن کے یہاں موضوع، طرز بیان پر حاوی ہے۔ کس موضوع پر قلم اٹھایا جائے، اس پر بہت توجہ دی جا رہی ہے مگر اس موضوع پر افسانہ کیسے لکھا جائے اس پر کم سوچا جا رہا ہے۔ پاپولر لٹریچر اور ادبی تحریر میں یہی تو فرق ہے۔ پاپولر لٹریچر میں صرف کہانی پیش کی جاتی ہے جبکہ ادبی فن پارے میں 'فن' بھی پیش کیا جاتا ہے۔ لہٰذا جب تک ہمارے نئے افسانہ نگار موضوع کے ساتھ ساتھ اسلوب اور فنی ٹریٹمنٹ پر توجہ نہیں دیں گے، ان کے افسانے تعداد میں تو اضافہ کریں گے، ہمارے ادبی ذخیرے میں اضافے کا باعث نہیں بن سکیں گے۔ عہد حاضر کے افسانہ نگاروں کو اس مسئلے پر سنجیدگی سے سوچنا ہوگا۔

■

Dr.Shahab Zafar Azmi
Associate Professor
Department of Urdu
Patna University,Patna (INDIA)800005
Email: drshahabzafar.azmi@gmail.com
Mob:8863968168

اکیسویں صدی میں اردو غزل کے امکانات

(کشمیر کے حوالے سے)

مشتاق احمد گنائی

ہندوستان کے بڑے ادبی مراکز کی طرح ریاست جموں وکشمیر میں بھی اردو زبان وادب سے شغف رکھنے والے افراد کی کثیر تعداد ہے اور یہ زبان یہاں کے مختلف خطوں میں آباد رنگا رنگ تہذیب، ثقافت، کلچر اور زبانوں کے باشندوں کے درمیان رابطے کا کام کرتی ہے۔

جموں وکشمیر میں اردو زبان کے متعارف ہونے کے ساتھ ہی یہاں کے مقامی ادیبوں اور قلم کاروں نے اپنے جذبات واحساسات کو آراستہ کرنے کے لیے کشمیری، لداخی، ڈوگری اور دیگر مقامی زبانوں کے علاوہ اُردو زبان کا انتخاب بھی کیا ہے۔ ریاست جموں وکشمیر میں اردو نثر ونظم کی جملہ اصناف پر مقامی قلم کاروں نے طبع آزمائی کرکے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ نثر کے مقابلے میں یہاں شاعری کی طرف زیادہ توجہ کی گئی۔ شاعری میں غزل ریاست کے شعرا کی پسندیدہ صنف سخن رہی ہے۔ اس سلسلے کی پہلی کڑی مرزا کمال الدین حسینی اندرابی رسوا اور ان کے دیگر معاصرین ہیں۔ ان کے کلام میں فارسی آمیز اردو اشعار ملتے ہیں۔ لیکن ریاست میں اردو غزل کا باقاعدہ آغاز شاعر کشمیر پیرزادہ غلام احمد مہجور سے ہوا ہے۔ ان کی غزل ریاست میں اردو شاعری کے ایک نئے موڑ کا پتا دیتی ہے۔ مہجور کے بعد ریاست میں اردو غزل گو شعرا کی اچھی خاصی تعداد منظر عام پر آئی جنھوں نے نہ صرف ریاست بلکہ ملکی سطح پر بھی اپنی انفرادیت، اہمیت اور شناخت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ 1947 تک ریاست جموں وکشمیر میں جن شعرا نے صنفِ غزل کی آبیاری بطور خاص کی ہے ان میں نند لال کول طالب کشمیری، رسا جاودانی، میر غلام رسول نازکی، کمال الدین شیدا، غ۔م طاؤس، شہ زور کاشمیری، دینا ناتھ رفیق، منوہر لال دل، غلام علی بلبل، شوریدہ کاشمیری، نشاط کشتواڑی، تنہا انصاری وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔

ریاست میں اردو غزل کا سنہرا دور تقسیم ہند کے بعد شروع ہوتا ہے۔ تقسیم ملک کے بعد ہونے والی سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کا اثر ریاست کے قلم کاروں پر بھی پڑا ہے۔ ادب کی اہم تحریکات ورجحانات کے ساتھ ریاست کے ادبا وشعرا نے بھی منسلک ہوکر اپنی ذہنی وابستگی کا اظہار اپنے کلام میں کیا ہے۔ اس کے علاوہ ریاست کے مختلف حالات وحادثات کا اظہار بھی یہاں کے شعرا کا اہم موضوع رہا ہے۔ اس دوران جن شعرا نے ریاست میں اردو غزل کی نمائندگی کی ہے ان میں حکیم منظور، حامدی کاشمیری، عرش صہبائی، ہمدم کاشمیری، مظفر ایرج، ودیا رتن عاصی، عابد مناوری، فاروق نازکی، رفیق راز، ایاز رسول نازکی، پرتپال سنگھ بیتاب، احمد شناس، بلراج بخشی، خالد بشیر احمد، فرید پربتی، شفق سوپوری، فاروق مضطر، تنویر بھدرواہی، رخسانہ جبیں، نذیر آزاد وغیرہ اہم نام ہیں۔

مذکورہ بالا شعرا کی رہنمائی اور رہبری میں ریاست جموں وکشمیر میں اردو غزل گو شعرا کی ایک نئی نسل پچھلے دو ڈھائی عشرے سے منظر عام پر آئی ہے، جو اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے اپنے شعری وجود کا احساس دلانے میں کسی حد تک کامیاب ہیں، اور جو ریاست جموں وکشمیر میں اردو غزل کے مستقبل کے حوالے سے اہم نام ہو سکتے ہیں۔ ایسے شعرا کی تعداد بھی یہاں اچھی خاصی ہیں۔ ان نئے شعرا کا کلام ریاست کے اخبارات ورسائل میں متواتر شائع ہوتا رہتا ہے، اور بعض کا کلام ملک کے اہم اور موقر جرائد میں بھی نظر آتا ہے۔ اس بات سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ریاست جموں وکشمیر میں اردو غزل کا مستقبل کس حد تک تابناک اور روشن ہوگا۔

رواں صدی میں ریاستی سطح پر اُردو غزل کی نئی نسل کے شعرا میں جن حضرات کا نام اور کام اہمیت کا حامل ہے، ان میں شیخ گلزار، پرویز مانوس، اشرف عادل، لیاقت جعفری، فاروق احمد فاروق، علمدار عدم، سلیم ساغر، خالد کرار، غضنفر علی شہباز، غلام نبی غافل وغیرہ شامل ہیں۔

زندگی کے ابتدائی ایام سے ہی شیخ گلزار اردو شعر وادب سے خصوصی رغبت رکھتے ہیں۔ درس وتدریس کے ساتھ ساتھ آپ شعری ذوق وشوق بھی رکھتے ہیں۔ گلزار اپنے جذبات اور مشاہدات کو ظاہر کرنے کے لیے شاعری کو وسیلہ بناتے ہیں۔ شیخ گلزار نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے، لیکن صنف غزل کی لوچ ولچک نے انھیں خاص طور پر گرویدہ کیا ہے۔ دیگر اصناف کے مقابلے میں صنف غزل میں ہی زیادہ تر اپنے جذبات اور تجربات

> **ریاست میں اردو غزل کا سنہرا دور تقسیمِ ہند کے بعد شروع ہوتا ہے۔ تقسیمِ ملک کے بعد ہونے والی سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کا اثر ریاست کے قلم کاروں پر بھی پڑا ہے۔ ادب کی اہم تحریکات و رجحانات کے ساتھ ریاست کے ادبا و شعرا نے بھی منسلک ہوکر اپنی ذہنی وابستگی کا اظہار اپنے کلام میں کیا ہے۔اس کے علاوہ ریاست کے مختلف حالات و حادثات کا اظہار بھی یہاں کے شعرا کا اہم موضوع رہا ہے۔**

کو پیش کرتے ہیں۔ شیخ گلزار کے اب تک دو مجموعے 'سایہ دھوپ کا' اور 'لمحے اندھیروں کے' کے ناموں سے منظر عام پر آ چکے ہیں، جنھیں ادبی حلقوں میں اچھی پزیرائی ملی ہے۔

شیخ گلزار کی غزلوں کے مطالعے سے یہ بات آشکار ہوتی ہے کہ موصوف اردو کی کلاسیکی قدروں کے امانت دار بھی ہیں اور جدید عصری حسیت کے روادار بھی۔ آپ کی شاعری میں روایتی موضوعات کی بوقلمونی بھی ہے اور دور حاضر کے نئے اور اور تازہ موضوعات کی فراوانی بھی۔ گلزار صنفِ غزل کے فنی لوازمات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ اپنے داخلی جذبات و احساسات کو غزل کا پیرہن عطا کرتے ہیں۔ ان کا انداز بیان نیا اور اچھوتا ہے۔

ریاست جموں و کشمیر میں نئی نسل کے غزل گو شعرا میں ایک اہم نام پرویز مانوس کا ہے۔ وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار غزل، نظم، افسانہ، ڈرامہ، ناول وغیرہ جیسی اہم اصناف میں یکساں طور پر کرتے ہیں۔ البتہ غزل موصوف کی پسندیدہ صنف رہی ہے۔ اور اس کو برتنے میں غیر معمولی دسترس رکھتے ہیں۔ پرویز کے اب تک تین شعری مجموعے 'بیتے لمحوں کی سوغاتیں'، 'موسم اڑان کا' اور 'چاند لمس گلاب' شائع ہو چکے ہیں۔

جہاں تک پرویز مانوس کی غزلوں میں موضوعات کا تعلق ہے، تو اس حوالے سے جو موضوع ان کی شاعری کی روح ہے وہ عشق ہے۔ عشق اور اس کی بے شمار وارداتیں پرویز مانوس کی غزلوں میں ہر سو نظر آتی ہیں۔ مانوس کے ابتدائی شعری مجموعے 'بیتے لمحوں کی سوغاتیں' کے مطالعے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ وہ رومان پسند شاعر ہیں۔ عشق و عاشقی کی مختلف کیفیات کی پر لطف عکاسی ان کے ابتدائی دور کی غزلوں میں جا بہ نظر آتی ہے۔

اور بڑھ جائے گا چاہت کا مزہ
جس گھڑی پہرے لگیں گے پیار پر
رنگینیاں، شباب، لطافت، نزاکتیں
یہ سب تمھارے حسن کے پیکر میں ڈھل گئے

پرویز مانوس کی غزلوں میں یاد، ہجر، غم، پہرہ، خواب وغیرہ جیسے الفاظ کا استعمال کثرت سے ہوا ہے۔ یہ الفاظ عشق کے اہم تجربات کی پیشکش میں ان کا بھرپور ساتھ دیتے ہیں کیونکہ جب عاشق معشوق سے روٹھ جاتا ہے یا کسی وجہ سے جدا ہو جاتا ہے، تو وہ اس کی یادوں کے ساتھ اپنی زندگی گزارنے لگتا ہے۔ پرویز مانوس کے کلام سے بھی اسی طرح کے ایک عاشق کی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

یاد اسے بھی ہوں گی شاید پہلے پیار کی وہ باتیں
رات گئے تک تنہائی میں جو مجھ کو تڑپاتی ہیں
تنہائی سے ڈر کر جب بھی لپٹا ہوں دیواروں سے
'بیتے لمحوں کی سوغاتیں' میر اول بہلاتی ہیں

اگرچہ پرویز مانوس کے کلام میں عشق ایک اہم موضوع کی حیثیت رکھتا ہے لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ صرف اسی میں الجھ کر رہ گئے ہیں، بلکہ ان کے یہاں دیگر جدید موضوعات بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ وہ جدید زمینی حقائق اور عصری حسیت سے واقف ہیں۔ ان کا عہد جن حالات و حوادث سے گزر رہا ہے، اس پر بھی پرویز مانوس گہری نظر رکھتے ہیں۔ محرومی، تنہائی، بے یقینی، عدم تحفظ، مایوسی، ناامیدی، مذہبی تعصب اور اخلاقی قدروں کی شکست و ریخت وغیرہ ایسے مسائل ہیں، جو آج کے دور کے انسان کی زندگی کا معمول بن گئے ہیں۔ ان معاملات کو پرویز مانوس نے فنی اور فکری بلندی کے ذریعے شعری لباس عطا کیا ہے۔

اشرف عادل وادیِ کشمیر کی نئی نسل کے غزل گو شعرا میں بہت ہی فعال اور سرگرم نظر آتے ہیں۔ انھیں اردو زبان اور شعر و ادب سے کالج کے زمانے سے رغبت پیدا ہوئی ہے۔ جو بعد ازاں تخلیقیت میں بدل گئی اور وہ باقاعدہ مشقِ سخن کرنے لگے۔ اشرف عادل نے اردو ادب کے کلاسیکی شعرا میں میر، غالب، مومن، داغ، آتش وغیرہ کے ساتھ ساتھ جدید غزل گو جیسے ساغر صدیقی، ناصر کاظمی، شہر یار اور عرفان صدیقی وغیرہ کے کلام کا بخوبی مطالعہ کیا ہے۔ جس سے ان کی فنکارانہ صلاحیتوں میں نئی جان پیدا ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ اشرف عادل نے وادی کے نامور شاعر مرحوم فرید پربتی سے بھی فیض حاصل کیا ہے۔ اس عمل سے ان کی شاعری کو کسی حد تک صحیح سمت ملی ہے۔

اشرف عادل کے یہاں مروجہ شعری میلانات کی پیشکش نئے انداز اور تازہ لہجے میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کے کلام میں حسن و عشق اور کیف و سرور کے واقعات کی تصویر کشی مخصوص لفظوں میں ہوتی ہے۔ وہ اردو کی کلاسیکی شاعری کے دلدادہ ہیں اور اساتذہ کے کلام کے مطالعے نے انھیں بعض ایسے اشعار کہنے پر مائل کیا جو ندرت کاری اور تازگی کا احساس دلاتے ہیں۔ عادل کی غزلوں میں روایتی موضوعات نئے لفظوں اور نئے انداز میں نظر آتے ہیں۔

موسم گل نہ مجھ کو بھاتا تھا
تیری چاہت نے خوش مزاج کیا
دل آشفتہ تیر کھا کے گرا
زخم پارینہ ہے نشان نیا
لکیروں میں بسی ہے تیری خوشبو
میری قسمت چمکنے کا ہے امکان

اشرف عادل کی غزلوں کا نمایاں وصف زبان و بیان کی سادگی ہے۔ وہ اپنے جذبات کو جدید شعری میلانات کے تحت آسان اور روزمرہ کی زبان میں پیش کرنے کے روادار ہیں۔ جدید غزل کے فنی و فکری لوازمات سے عادل نہ صرف پوری طرح سے واقف ہیں بلکہ ان کے اظہار و برتاو میں بھی انھیں ملکہ حاصل ہے۔ اشرف عادل کی غزلوں میں لہجے کی تازگی اور احساس کی ندرت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ جدید تر غزل میں زندگی کے اہم موضوعات کی ترجمانی ہر شاعر نے کی ہے۔ اشرف عادل بھی اپنی ذات کے وسیلے سے اپنے عہد اور معاشرے کا مطالعہ اور مشاہدہ گہرائی سے کرنے کے بعد اپنی غزلوں کو اس طرح کے موضوعات سے دلکش بناتے ہیں۔ اشرف عادل کی شاعری میں آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی۔

لیاقت جعفری غزل گو شعرا میں دور سے پہچانے جاتے ہیں۔ موصوف نے قلیل عرصے میں اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ آپ کا کلام ریاست کے علاوہ ملکی سطح کے اخبارات اور رسائل میں تواتر سے چھپتا ہے۔ لیاقت جعفری کا شعری مزاج سماجی حقیقتوں کے موافق ہے۔ ان کے کلام میں فرسودہ اور پامال مضامین نہ ہونے کے برابر ہیں۔ جعفری جدید فکری میلانات کے شاعر ہیں۔ ان کی غزل میں عصری آگہی کا عرفان موجود ہے۔ لیاقت جعفری حساس طبیعت کے مالک ہیں، آپ اپنے وجود کے تشخص کے ساتھ ساتھ اپنے گردونواح کے حالات و حادثات سے بھی باخبر ہیں۔ موصوف کے کلام میں آج کے دور کے انسان کی بے چارگی، محرومی، بے یقینی اور لاحاصلی خاص موضوعات ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

دب کے مر جاؤں گا اک روز میں اپنے نیچے
ایک گرتی ہوئی دیوار ہے میرے اندر
نیند بستی میں بھی بیدار بدن گھومتا ہوں
کوچۂ خواب بھی آباد میرا کوئی نہیں
کچھ سمجھ کر ہی حوالے کر دیا اپنا وجود
خود سے بچنے کا اگر چہ راستہ موجود تھا

لیاقت جعفری کی غزلوں کی زبان سلیس، عام فہم اور بامحاورہ ہے۔ انداز بیان اور طرز ادا بھی منفرد ہے۔ ان کی غزل لسانی و فنی اعتبار سے کافی پختہ ہے۔ ان کا لہجہ تازہ ہے۔ وہ اپنے جذبات کی پیش کش کے لیے مخصوص لفظیات کا انتخاب محتاط انداز میں کرتے ہیں۔ جعفری جدید اور مابعد جدید شعری رجحانات سے متاثر نظر آتے ہیں جن کی مثالیں ان کی شاعری میں موجود ہیں۔

فاروق احمد فاروق بھی ریاست کے شعرا کی جدید تر پود میں شمار ہوتے ہیں۔ فاروق احمد فاروق کا شاعرانہ مزاج مختلف و متنوع پہلوؤں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ ان کے یہاں ذاتی تجربات کی بوقلمونی بھی ہے، اور

عصر حاضر کی روداد بھی، فکر وفن کی تازگی بھی ہے، اور طرز ادا کی دل نشینی بھی، خیالات کی بلندی بھی ہے، اور احساسات کی فراوانی بھی۔ اُردو غزل کی فنی، ہیئتی اور لسانی باریکیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہ اپنے تجربات کا اظہار بڑی ہنرمندی سے کرتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

تفکر کو ہے آوارہ مزاجی
ہے مشکل ذوق میں اوسان رکھنا
میری آرزوئیں جواں ہو گئی تھیں
محبت کا جب آستاں چھو لیا تھا
حقیقتوں کے شہر میں وہ خواب بیچتا رہا
حدود ریگزار میں سراب بیچتا رہا

فاروق احمد فاروق کی شاعری کے مطالعے سے ان کی زبان اور لفظیات ہمیں بہت متاثر کرتے ہیں۔ آپ الفاظ کے انتخاب اور دروبست پر خاص توجہ صرف کرتے ہیں۔

فاروق احمد فاروق کی تخلیقی صلاحیتوں کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے زاہد مختار لکھتے ہیں:

''فاروق احمد فاروق کی شاعری میں ایک گہرائی ہے اور ان کے اندر موجیں مارتے ایک جنوں کا عکس ہے۔ فاروق احمد فاروق اس طرحدار عکس کو صفحہ قرطاس پر لانے میں تخلیقی اور لسانی باریکیوں سے لبریز کئی رنگ زیر قلم لاتے ہیں۔ جن کی اپنی ایک الگ نزاکت بھی ہے اور علامتی خوشبو بھی۔''

پونچھ کا علاقہ اُردو شعر و ادب کے حوالے سے ریاست کا زرخیز ترین علاقہ رہا ہے۔ یہاں کے ادبی ماحول نے فن کاروں اور قلم کاروں کی ایک کہکشاں پیدا کی ہے۔ اسی محفل کا ایک نیا ستارہ علمدار عدم ہے۔ علمدار عدم اُردو شاعری میں صنف غزل سے خاصی دلچسپی رکھتے ہیں اور اسی میں اپنے جذبات اور تجربات کو پیش کرتے رہتے ہیں۔ ان کا کلام ریاست اور بیرون ریاست کے اخبارات اور رسائل میں چھپنے کے علاوہ کتابی صورت میں 'آگہی کا سفر' کے نام سے بھی شائع ہوا ہے۔

علمدار عدم نئی فکر کے شاعر ہیں۔ وہ اپنے تجربات اور احساسات کو پیش کرنے کا ایک انوکھا انداز رکھتے ہیں۔ عدم اپنے عہد کے حالات وواقعات اور مشکلات ومسائل کو اپنے تجربات کے پیش نظر اشعار میں سموتے ہیں۔ ان کا انداز بیان نیا اور تازہ ہے۔ اسلوب میں سادگی ہے۔ بلکہ سادگی، سلاست اور روانی ان کے کلام کی خاص خوبیاں ہیں۔ وہ عصر حاضر کے انسان کی نفسیات اس کی سوچ اور فکر سے واقف ہیں۔ ان کی غزل نئی نسل کی سوچ وفکر کی ترجمانی کرتی ہے۔ علمدار عدم کی غزل ان کی ذات کا بھی انکشاف کرتی ہے۔ ان کی غزلیں ان کے اندرونی جذبات کی آئینہ دار ہیں۔ اس حوالے سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

میں گمراہی کے جوں ہی ذائقے تلاش کروں
میرے درون میں آئے ہے زلزلہ جیسے
ٹھہر گئے ہیں جنوں کی ہر ایک سرحد پر
کہ آگہی کا ہمیں انتظار کرنا ہے

علمدار عدم ایک امن پسند اور ہمدرد انسان ہیں۔ دور رفتہ کے انسان کی مادیت پسندی، نفسانفسی، ہما ہمی، مذہبی تعصب اور دوسرے اہم مسائل کے متعلق علمدار عدم ایک مثبت سوچ رکھتے ہیں۔ وہ آپس میں بھائی چارے اور مذہبی رواداری کے حامی ہیں۔ جس کی نمائندگی وہ اپنے کلام سے کرتے ہیں۔ اس طرح کے موضوعات کو پیش کرنے کے لیے علمدار عدم شعری محاسن اور دیگر فنی لوازمات کا بھی خاص خیال رکھتے ہیں۔ وہ اپنے وقت کے حالات کو فنی چابکدستی کے ساتھ شعری پیرہن عطا کرتے ہیں۔ علمدار عدم اپنی ذات اور کائنات کے اسرار ورموز کو قلم کی زبان سے کچھ اس انداز میں پیش کرتے ہیں۔

اس میں الفاظ ومعنی کے سب رنگ تھے
پھر بھی روٹھا رہا شاعری کا بدن
وفا، احساس، ہمدردی، محبت
نئے بازار کا سودا نہیں ہے
یہ اور بات کہ اب راستہ ملے نہ ملے
سفر تو پھر بھی ہمیں اختیار کرنا ہے

سلیم ساغر نئی نسل کے شعرا کی صف میں اپنی خلاقانہ ذہانت کے بل پر اہم مقام رکھتے ہیں۔ گزشتہ دو ڈھائی دہائیوں سے ریاستی سطح پر نمودار ہونے والے نئے شعرا میں سلیم ساغر نے اپنی تازہ کار شعری تخلیقات سے ادبی حلقوں کو بڑی حد تک متاثر کیا ہے۔ ساغر نے اپنے اظہارات کے لیے فنی تلازموں سے کام لے کر اپنی انفرادیت کو قائم رکھنے میں از حد محنت سے کام لیا ہے۔ موصوف کے شعری مجموعے 'انتظار اور سہی' میں ایسے تجربے پائے جاتے ہیں جو فنی اور فکری لحاظ سے کافی توانا ہیں۔ جو اردو غزل کے سرمائے میں خوشگوار اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ سلیم ساغر کی شاعری ان کی ذات کی آئینہ دار ہے۔ وہ اپنے اندرون کی روداد شعری پیرائے میں منفرد اسلوب میں پیش کرتے ہیں۔

ایک انجانا تخیل، ایک ان دیکھا سا خواب
محو حسرت ہے تمنا خواب کی تعبیر میں
جو اپنا ہو نہ سکا وہ کسی کا کیا ہوگا؟
حصار ذات سے باہر میں صبح وشام رہا
یہ ابتدا ہے انوکھی، یہ انتہا ہے عجب
شعور ذات کا سارا ہی سلسلہ ہے عجب

سلیم ساغر کے کلام میں عشقیہ موضوعات پر مشتمل اشعار کی تعداد بھی خاصی ہے۔ ساغر عشق اور دل لگی کی باتوں کا اظہار اپنے مخصوص انداز سے کرتے ہیں۔ محبوب کی کج روی، ہجر کی صعوبتیں اور وصل کی لذتیں وغیرہ جیسے معاملات ساغر نے جا بہ جا پیش کیے ہیں۔ انھوں نے بے وفائی کے تیر کھانے کے باوجود بھی وفا کا دامن تھامے رکھا۔ ان کی شاعری میں ہجر و جدائی کا عجیب ماحول پایا جاتا ہے۔

ان کی نظروں میں محبت ہے لبوں پر شکوے
بات شیریں ہے مگر تلخیِ تمہید کے ساتھ
نہ اس نے بات کی ایسی نہ کچھ سوال کیا
کہے بغیر ہی ظاہر مگر ملال کیا
وصال و ہجر کے موسم پروئے شعروں میں
ہر ایک رُت کو غزل کیوں نہ خوشگوار کرے

سلیم ساغر کی غزلیہ شاعری نئے لب و لہجے اور طرز احساس سے لبریز ہے۔ انھوں نے عشق ومحبت کے مخصوص احساسات اور جذبات کے علاوہ عصری حالات وحادثات کی تصویر کشی بھی کی ہے۔ ساغر کی غزلوں میں جذبات کی صداقت و شدت، احساس کی تازگی وشائستگی، طرز اظہار کی ندرت و جدت جیسی صفات کا اظہار بر ملا پایا جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں روانی اور سلاست کے علاوہ موسیقی، نغمگی اور سوز وگداز بھی بہ درجہ اتم موجود ہیں۔

شیخ خالد کرار ریاست جموں وکشمیر کی جدید تر نسل کے غزل گو شعرا میں ایک نمایاں مقام حاصل کر چکے ہیں۔ خالد کرار نے قلیل عرصے کے اندر ہی اپنی ذہنی، فکری اور فنی صلاحیتوں سے ہر ذی حس قاری کو متاثر کیا ہے۔ آپ لکھنے کے ساتھ ساتھ اردو کے منجھے ہوئے استادوں کے کلام کو پڑھتے رہتے ہیں جس سے آپ کے فن میں پختگی کے نمونے نظر آتے ہیں۔ خالد اپنے جذبات کو الفاظ کی خوب صورت نشست کے ساتھ نظم و غزل اور افسانوی وغیر افسانوی اصناف میں پیش کرتے ہیں۔ آپ کی بیش تر کاوشیں ملکی اور ریاستی سطح کے اعلیٰ رسائل وجرائد میں شائع ہوتی ہیں۔ خالد نے ابتدا ہی سے شاعری کا دامن مضبوطی سے پکڑا تھا جو ہنوز جاری ہے۔ آپ کو شاعری سے بے حد لگاؤ ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ مختصر وقت کے اندر ہی آپ نے تین شعری مجموعے محبوبانِ شاعری کی نذر کیے ہیں۔ 'آنگن آنگن پت جھڑ'، 'سوا نیزے پہ سورج' اور 'ورود' آپ کے قلم کے تراشیدہ شعری مجموعے ہیں۔

خالد جدید ذہن وشعور کے شاعر ہیں۔ ان کی غزل عصری حسیت کی آگہی کا خوبصورت احاطہ کرتی ہے۔ انھوں نے روح عصر کے متفرق موضوعات کو مخصوص لفظیات سے شعری سانچوں میں ڈھالا ہے۔ وہ اپنے

ریاست جموں و کشمیر میں اردو غزل کسی بھی دوسری ریاست کے مقابلے میں کہیں زیادہ توازن اور تازہ کاری کے ساتھ نئی بلندیاں چھو رہی ہے..... یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ جموں و کشمیر کے اردو غزل گو شاعروں نے غزل کی روح سے انحراف نہیں کیا ہے اور اپنی غزلوں میں ارضیت اور عصریت کی محسوس یا نا محسوس اثر پذیری کے باوجود غزل کی شعریات کے مطابق انسانی جذبات و احساسات اور احوال و حوادث کا ہی اظہار نئی جمالیاتی در و بست کے ساتھ کیا ہے۔

تجربات، مشاہدات اور محسوسات کو جدید فکری میلانات کے تحت منفرد لہجے میں بیان کرتے ہیں۔ خالد کرار کی غزلوں میں تازگی اور شگفتگی کا احساس جابہ جا ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے شعری اظہار کے لیے مروجہ موضوعات اور لفظیات کو نئے اسالیب اور نئے معنوں میں پیش کیا ہے۔ جس میں ان کی انفرادی حیثیت جھلکتی ہے۔ اس حوالے سے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہماری ذات مسلسل سفر میں ہے اب بھی
ہمارا خود سے کوئی رابطہ نہیں ٹکتا
شعور آگہی کے فلسفے میں جلتا ہوں
میں اپنے ساتھ اسی رابطے میں جلتا ہوں
دشت ویرانیوں میں ہے آباد
شہر میں کوبہ کو تماشا ہے
سارے آثار سب امکان بدل جاتے ہیں
لفظ رہ جاتے ہیں پیمان بدل جاتے ہیں

خالد کرار جدید تر غزل کے تازہ بہ تازہ اور نو بہ نو موضوعات کو فنی، فکری اور لسانی لوازمات کی منفرد پاسداری کے ساتھ بیان کرنے کے ہنر سے بہرہ ور ہیں۔ وہ صنف غزل کی فنی اور ہیئتی باریکیوں پر اچھی دستگاہ رکھتے ہیں۔ وہ اپنے جذبات اور تجربات کو ایک مخصوص اسلوب میں پیش کرتے ہیں جو بالکل ان کا اپنا ہے۔

خالد کرار کی شاعرانہ ذہانت اور فطانت کا اعتراف اُردو کے نامور ناقدین شمس الرحمٰن فاروقی، حامدی کاشمیری، قدوس جاوید، حقانی القاسمی، ڈاکٹر شہناز نبی، فرید پربتی، وغیرہ نے خوبصورت انداز اور الفاظ میں کیا ہے جو ان کے روشن مستقبل کی ضمانت کے لیے کافی ہے۔

غلام نبی غافل بھی ریاست کے تازہ کار شاعر ہیں۔ اردو غزل میں وہ اپنے مخصوص لب و لہجے سے موجودہ دور کے ان تمام حالات کو پیش کرتے ہیں جن کا تعلق ہمارے سماج سے روز بہ روز گہرا ہوتا جارہا ہے۔ غلام نبی غافل نے انسانی رشتوں کی بے معنویت اور ذاتی درد و کرب کو کافی سنجیدگی سے پیش کیا ہے۔ آپ اردو غزل کے فنی و فکری پہلوؤں سے بھی پوری آگہی رکھتے ہیں۔ چند اشعار نمونے کے طور پر پیش ہیں۔

ضمیر و خوفِ خدا کی باتیں حدودِ دیر و حرم سے باہر
قدیم انسان جدیدیت میں تمہاری ممکن گزر نہیں
قدم مریخ پر ہے جسم کا اور روح کہتی ہے
نہیں آتی کوئی صورت نظر سیراب ہونے کی
روح کی تشنہ لبی کو مان لو مرگ حیات
زندگی کا نام لکھ لو جابجا تشنہ لبی
فنا کی دسترس میں ہے نظارگی کا بانکپن
نہ جلوہ گہ میں وہ طالب نہ وہ نظر نگاہ میں

غضنفر علی شہباز جدید ترین نسل کے شاعر ہیں۔ ان کے یہاں احساسات اور مشاہدات کا انوکھا برتاؤ دیکھنے کو ملتا ہے۔ شہباز کے کلام میں غزل کے بنیادی موضوع عشق کے متفرق پہلوؤں کی عکاسی ہوئی ہے۔ شہباز نے اپنے عشقیہ جذبات اور احساسات زبان کی سادگی اور برجستگی سے بہت خوب صورت انداز میں پیش کیے ہیں۔ ان کے کلام میں بھی دیگر نو آموز شعرا کی طرح حسن و خوبصورتی، حزن و یاس، فراق و وصال، یاد و امید، تڑپ و بے قراری وغیرہ جیسے معاملات عشق کی کارفرمائی جابہ جا محسوس کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

قید و رسن میں تب بھی بند تھے عشق والے
حق بات کہنے والے اس دن بھی دار ڈھونڈیں
تری فرقتوں کی دلبر کوئی انتہا تو ہوگی
تو بتا عروسِ خلوت بنے غم گسار کب تک
ہم ان سے شکایت کر نہ سکے
ہم وصل کی چاہت کر نہ سکے

مذکورہ شعرا کے علاوہ جو شعرا آج کل ریاست جموں و کشمیر میں غزل کی آبیاری میں مصروف ہیں، ان میں سہیل مہدی، روف راحت، امتیاز نسیم ہاشمی، لیاقت نیر، محتشم احتشام، اقبال صدیقی، ع۔ع عارف، سبط رضا، یاسین سمبلی، اطہر بشیر اور شاد سجاد وغیرہ کے نام قابل قدر ہیں۔ یہ تمام حضرات تواتر سے لکھنے میں مگن ہیں۔ یہاں پر میں مذکورہ شعرا کا نمونہ کلام نقل کرتا ہوں جس سے ان کی تخلیقی بصیرت اور فکری آگہی کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

نقوشِ ہستی بگاڑ کر دیکھوں
پردۂ جان کو پھاڑ کر دیکھوں

(سہیل مہدی)

آتے ہیں وہی خواب نگاہوں میں ہماری
ہم خوف کا منظر وہ بلا بھول گئے تھے

(رؤف راحت)

فقیرِ شہر ہوں ہاتھوں میں لڑ کھڑاتا ہوا
چراغِ جان ہے وہ بھی بجھا رہی ہے ہوا

(امتیاز نسیم ہاشمی)

عظمتِ زندگی وہ کیا سمجھے
جو غمِ زندگی سے ہار گیا

(لیاقت نیر)

آئینے لے کر چلا ہوں پتھروں کے شہر میں
ڈھونڈنے اک گھر چلا ہوں بے گھروں کے شہر میں

(محتشم احتشام)

بس انتظار میں ہی ساری رات ختم ہوئی
امید و یاس کی اک کائنات ختم ہوئی

(اطہر بشیر)

آوارگی یہ رات میں اور یہ چاند اکیلا
اب سوچتے ہیں یہ کہ کہاں کون جائے گا

(شاد سجاد)

ریاست جموں و کشمیر میں اردو غزل کو فنی و فکری، لسانی و ہیئتی، اسلوبیاتی اور جمالیاتی بنیادوں پر نئی بلندیوں سے آشکار کرانے میں مذکورہ شعرا کے علاوہ بھی سیکڑوں نئے شعرا اس کام میں مصروف ہیں جو کہ ریاست میں اردو غزل کے امکانات اور اس کے مستقبل کی واضح دلیل ہے۔ ریاستی سطح پر اردو غزل کی پیش رفت میں کلاسیکی، ترقی پسند، جدیدیت اور مابعد جدیدیت جیسی اہم تحریکات و رجحانات کی اثر آفرینی کے علاوہ ارضی اور ثقافتی عناصر اور یہاں کے سیاسی اور سماجی حالات و واقعات کو بھی برتا گیا ہے۔ پروفیسر قدوس جاوید اس تناظر میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ریاست جموں و کشمیر میں اردو غزل کسی بھی دوسری ریاست کے مقابلے میں کہیں زیادہ توازن اور تازہ کاری کے ساتھ نئی بلندیاں چھو رہی ہے..... یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ جموں و کشمیر کے اردو غزل گو شاعروں نے غزل کی روح سے انحراف نہیں کیا ہے اور اپنی غزلوں میں ارضیت اور عصریت کی محسوس یا نا محسوس اثر پذیری کے باوجود غزل کی شعریات کے مطابق انسانی جذبات و احساسات اور احوال و حوادث کا ہی اظہار نئی جمالیاتی در و بست کے ساتھ کیا ہے۔"

■

Dr Mushtaq Aahmad Ganai
P/O:KakaporaPulwama Kashmir 192304
Mob:7006402409
Email:mushtaqalamphd87@gmail.com

ایک قدم کا فاصلہ

وسیم فرحت

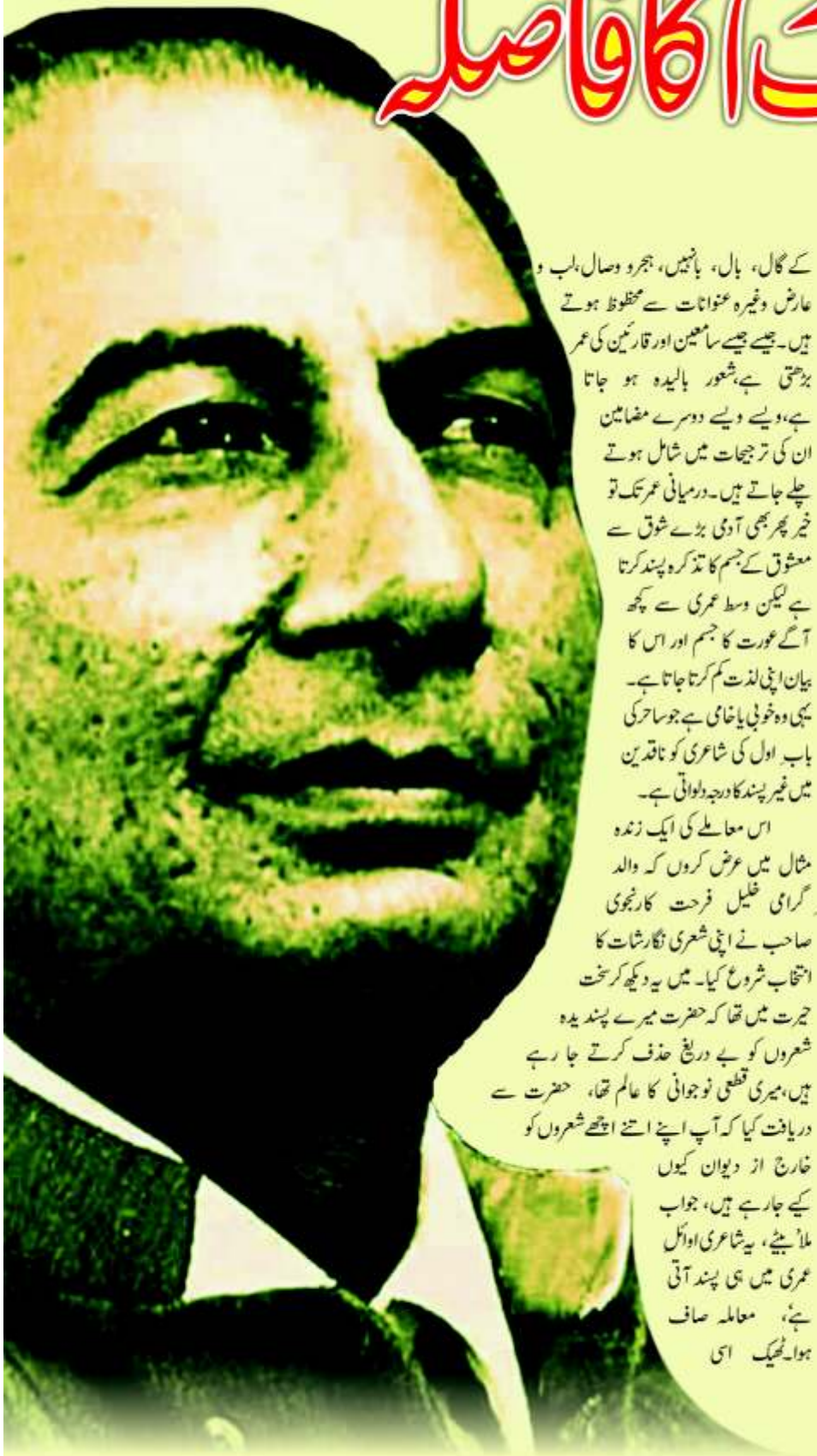

ظ۔انصاری مرحوم نے ساحر کے متعلق بڑی 'پیاری' رائے دی ہے کہ ''ساحر کی علمی اور فلمی شاعری میں ایک قدم کا فاصلہ ہے۔''میں نے مناسب سمجھا کہ اسی 'ایک قدم کے فاصلے' کو اپنے مضمون کا عنوان بنایا جائے کہ اس ایک قدم کو میں نے محسوس بھی کیا ہے اور والد گرامی مرحوم خلیل فرحت کارنجوی کے توسط سے اس کا گواہ بھی رہا ہوں۔یہی وہ ایک قدم کا فاصلہ ہے جو ان کی علمی زندگی میں بھی رہا اور بے دریغ عرض کروں کہ عملی زندگی میں بھی دیکھا گیا، بھوگا گیا۔انہی دو ضمنی عنوان پر مضمون ملاحظہ فرمائیں۔

علمی فاصلہ

پیش تر اس کے کہ میں 'ایک قدم کا فاصلہ' طے کروں، ساحر کی شاعری کے متعلق کچھ خیالات کا اظہار کرتا چلوں۔ساحر کی شاعری کو ہم تین ابواب میں تقسیم کر سکتے ہیں۔(یہ وضاحت بھی ضروری خیال کرتا ہوں کہ مذکورہ تینوں ہی ابواب میں ترقی پسند نظریہ کارفرما رہا ہے) اول باب تو وہ ہے جسے بعض ناقدین ادب 'ایک مخصوص عمر کی شاعری' سے معنون کرتے ہیں۔دوم وہ کہ جو ہر عہد کے، ہر عمر کے پیمانوں پر کھری اترتی ہے، جسے ساحر کی لازوالیت کہا جائے گا اور سوم وہ جو سنیما کے لیے لکھی گئی ہے۔اول اور سوم باب بعضے ٹکراؤ کا شکار بھی ہوتا رہا ہے۔ان تین ابوب کو کچھ تفصیل سے ملاحظہ فرمائیں۔

باب اول: مخصوص عمر کی شاعری

ساحر کی شاعری کا وہ حصہ جہاں ساحر کسی قطعی نوجوان شاعر کی طرح فکر کرتے ہیں، انداز بیاں بھی جہاں نوعمری کا مظاہرہ کرتا ہو، ایسی شاعری مخصوص عمر کی شاعری کہی جا سکتی ہے۔ایام جوانی میں عوام تو خیر جانے دیجیے، خود شاعر بھی ایک خاص زاویے سے سوچتا ہے۔اس کی فکر کے دائرے محدود ہوتے ہیں، بیش تر تغزل کا معاملہ رہا کرتا ہے۔یہی وہ خاص عمر ہے کہ جہاں آدمی معشوق کے گالوں اور بالوں کی شان میں قصیدہ خوانی کرتا ہے، سننے اور پڑھنے والے حضرات بھی ایک خاص عمر تک محبوب کے گال، بال، بانہیں، ہجر و وصال، لب و عارض وغیرہ عنوانات سے محظوظ ہوتے ہیں۔جیسے جیسے سامعین اور قارئین کی عمر بڑھتی ہے، شعور بالیدہ ہو جاتا ہے، ویسے ویسے دوسرے مضامین ان کی ترجیحات میں شامل ہوتے چلے جاتے ہیں۔درمیانی عمر تک تو خیر پھر بھی آدمی بڑے شوق سے معشوق کے جسم کا تذکرہ پسند کرتا ہے لیکن وسط عمری سے کچھ آگے عورت کا جسم اور اس کا بیان اپنی لذت کم کرتا جاتا ہے۔یہی وہ خوبی یا خامی ہے جو ساحر کی باب اول کی شاعری کو ناقدین میں غیر پسند کا درجہ دلواتی ہے۔

اس معاملے کی ایک زندہ مثال میں عرض کروں کہ والد گرامی خلیل فرحت کارنجوی صاحب نے اپنی شعری نگارشات کا انتخاب شروع کیا۔میں یہ دیکھ کر سخت حیرت میں تھا کہ حضرت میرے پسندیدہ شعروں کو بے دریغ حذف کرتے جا رہے ہیں، میری قطعی نوجوانی کا عالم تھا، حضرت سے دریافت کیا کہ آپ اپنے اتنے اچھے شعروں کو خارج از دیوان کیوں کیے جا رہے ہیں، جواب ملا 'بیٹے، یہ شاعری اوائل عمری میں ہی پسند آتی ہے'، معاملہ صاف ہوا۔ٹھیک اسی

طرح خود مجھے اپنی ابتدائی شاعری میں وہ کیف محسوس نہیں ہوتا جو اس وقت لہک لہک کر پڑھنے میں مجھے اور سامعین کو محسوس ہوتا تھا۔ یہ ایک ایسی نفسیاتی حقیقت ہے کہ جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ 'تلخیاں' میں اسی قماش کی بیش تر امثلہ ملاحظہ کی جاسکتی ہیں ۔

ترا گداز بدن، تیری نیم باز آنکھیں
انہی حسین خیالوں میں محو ہو رہتا

باب دوم: ساحر کی لازوالیت

یقین جانیے کہ سینما کا شدید اثر اگر چہ نہ بھی ہوتا تو 'باب دوم' کی شاعری ساحر کو ادب میں زندہ رکھنے کے لیے کافی تھی۔ اس نہج کی شاعری میں تفکر کا کینوا س خاصہ وسیع ہے۔ بلکہ کہیں کہیں کمیون ازم کے ڈھانچے سے بھی آگے بہت آگے بڑھ کر سوچا گیا ہے۔ جہاں غم جہاں کو غم دلبر پر مقدم جانا گیا ہے، جہاں اسوی ایشن کے مینی فیسٹو کے علاوہ عالم انسانیت کا کرب شاعر اپنے اندر محسوس کرتا ہے، اور پھر اس کرب سے جو شاعری منصۂ شہود پر آتی ہے، وہ ساحر کی لازوالیت پر دال ہوتی ہے۔ اس سلسلے کی چند مثالیں ملاحظہ کریں۔

سعی بقائے شوکت اسکندری کی خیر
ماحول خشت بار میں شیشہ گری کی خیر
غریب شہر کے تن پہ لباس باقی ہے
امیر شہر کے ارماں ابھی کہاں نکلے

اور اب آخر میں اس مضمون کے اول حصے کا لب لباب۔ وہی 'ایک قدم کا فاصلہ'۔ روسی ادیب و ناولسٹ فیوڈر ڈاسٹایوفسکی کے شاہکار ناول 'کرائم اینڈ پنشمینٹ' پر مشتمل رمیش سہگل کے 1958 میں آئے سنیما 'پھر صبح ہوگی' کے نغمہ نگار ساحر تھے۔ اس سنیما کا ایک دوگانا 'پھر نہ کیجے مری گستاخ نگاہی کا گلہ'، اس گیت کا پہلا شعر ملاحظہ کریں۔

ہیرو کہتا ہے۔

پھر نہ کیجے مری گستاخ نگاہی کا گلہ
دیکھیے آپ نے پھر پیار سے دیکھا مجھ کو

جواباً ہیروئن کہتی ہے ۔

میں کہاں تک نہ نگاہوں کو پلٹنے دیتی
آپ کے دل نے کئی بار پکارا مجھ کو

اس گیت کے متعلق والد مرحوم خلیل فرحت کارنجوی صاحب نے ساحر لدھیانوی کو خط لکھا کہ ''ایک ہی شاعر کے تخلیق کردہ گیت کے دو شعر، اول شعر 'پھر نہ کیجے مری...'' معیار کے اعتبار سے عرش بریں تک جا لگا اور اسی شاعر کا دوسرا شعر 'میں کہاں تک نہ...' بہ اعتبار معیار تحت الثریٰ میں جا گھسا، ایک ہی گیت کے دو شعروں میں اتنا بڑا تفاوت کیسے ممکن ہو سکتا ہے''، اس استفسار کے جواب میں ساحر فرماتے ہیں کہ ''پھر نہ کیجے مری گستاخ نگاہی کا گلہ' والا شعر میرے دیوان 'تلخیاں' سے ماخوذ ہے اور اس کے بعد والا شعر 'میں کہاں تک نہ نگاہوں کو پلٹنے دیتی' سنیما کے لیے لکھا گیا''۔ (مکتوب ساحر بنام خلیل فرحت کارنجوی محررہ 8 نومبر 1960، مذکورہ خط 'مکتوبات ساحر' سہ ماہی اردو ساحر نمبر میں شامل ہے) غرض کہ اول شعر آمد اور دوم آورد کا نتیجہ ہے۔ ہر چند کہ ساحر کا اول الذکر شعر 'پھر نہ کیجیے مری گستاخ نگاہی کا گلہ' دراصل مولانا حسرت موہانی سے مستفید محسوس ہوتا ہے۔ حسرت نے کہا تھا کہ ۔

ہم نہ کہتے تھے بناوٹ ہے یہ سارا غصہ
ہنس کے لو، پھر وہ انھوں نے ہمیں دیکھا، دیکھو

یہ ساحر کا سنیما میں ابتدائی زمانہ تھا۔ اور اس وقت تک ساحر کی علمی اور فلمی شاعری میں زمین و آسماں کا فرق قارئین محسوس کر سکتے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ اس دور تک ساحر اپنی تخلیقیت سنیما میں منتقل نہ کر پائے تھے۔ اور ظ۔ انصاری والا 'ایک قدم' ابھی کئی قدموں پر محیط تھا۔

یہ ایک زندہ حقیقت ہے کہ ساحر کے عہد میں ہندوستانی سنیما بجائے خود زبردست اشتراکیت پسند رہا۔ بڑے بڑے ہدایت کار کمیون ازم کی رو میں بہہ رہے تھے، حتیٰ کہ اداکار، کہانی کار، نغمہ نگار، مکالمہ نگار بھی خود کو اشتراکیت سے دور نہ رکھ پائے تھے۔ گرودت، بلراج ساہنی، سنیل دت، ستیہ جیت رے، بمل رائے و دیگر حضرات ساحر کے ہم قبیلہ رہے۔ ساحر کے گیتوں میں بیش تر شاعری ان کے شعری مجموعوں سے مشتق ہے۔ بعضے لفظوں کے ہیر پھیر سے اور بعضے بجنسہٖ۔ شعری مجموعے سے سنیما کی یہی ترسیل 'ایک قدم کا فاصلہ' ہے۔ ملاحظہ کریں

'تلخیاں' میں شامل نظم 'چکلے'

یہ کوچے یہ نیلام گھر دلکشی کے
یہ لٹتے ہوئے کارواں زندگی کے
کہاں ہیں، کہاں ہیں، محافظ خودی کے
ثنا خوان تقدیس مشرق کہاں ہیں؟

دس بند پر مشتمل نظم کا ٹیپ کا بند 'ایک قدم کا فاصلہ' طے کرتے ہوئے یہ شکل اختیار کرتا ہے کہ ''جنھیں ناز ہے ہند پر وہ کہاں ہیں'' اور اس نظم کے چھ بند سنیما ''پیاسا'' میں شامل کیے جاتے ہیں۔ مزید ان چھ بندوں میں بھی فارسیت آمیز الفاظ کی تشکیل میں ترمیم کی جاتی ہے۔ 'تلخیاں' میں شامل غزل 'تنگ آ چکے ہیں کشمکش زندگی سے ہم'، یہی غزل کچھ شعروں کے اضافے سے 'پیاسا' میں شامل کی گئی۔ اسی مجموعے میں شامل چھ بند کی نظم ''کبھی کبھی'' جب سنیما میں شامل کی جاتی ہے تو نظم کا مکمل تفہیم بدل جاتا ہے۔ سنیما میں شامل چار بند کا گیت محض خانہ پوری ہو کر رہ جاتا ہے۔ 'تلخیاں' والی 'کبھی کبھی' کا تسلسل، روانی اور نفس مضمون کا ستیاناس کر ساحر نے محض 'سیٹ' کی ضرورت پوری کی ہے، جس کا ادب سے کوئی تعلق نہیں۔ یہاں مجھے بے ساختہ میرزا عبدالقادر بیدل یاد آ گئے۔

بی رفع کجی مشکل بود از طبع کج طینت
بزور سیل نتواں راست کردن قالب پل را

(سیلاب کے زور سے پل کے قالب کو سیدھا نہیں کیا جا سکتا)

نظم 'خوبصورت موڑ' چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں' کو بغیر یک لفظی تصرف کے ساحر نے سنیما میں شامل کر لیا اور ایک شاہکار کو واقعی شاہکار کا درجہ مل گیا۔ 'آؤ کہ کوئی خواب بنیں' میں شامل ساحر کی ایک عمدہ غزل 'دیکھا ہے زندگی کو کچھ اتنے قریب سے'، اس غزل کے مطلع کو ساحر نے ایک گیت کے مکھڑے کے طور پر استعمال کیا۔ گیت میں مابقیہ اشعار خالص سنیما کے لیے لکھے گئے ہیں۔ اسی مجموعے سے ''میں پل دو پل کا شاعر ہوں' نظم کچھ تفریط کے ساتھ سنیما میں لی گئی۔

> یہ ایک زندہ حقیقت ہے کہ ساحر کے عہد میں ہندوستانی سنیما بجائے خود زبردست اشتراکیت پسند رہا۔ بڑے بڑے ہدایت کار کمیون ازم کی رو میں بہہ رہے تھے۔ حتیٰ کہ اداکار، کہانی کار، نغمہ نگار، مکالمہ نگار بھی خود کو اشتراکیت سے دور نہ رکھ پائے تھے۔ گرودت، بلراج ساہنی، سنیل دت، ستیہ جیت رے، بمل رائے و دیگر حضرات ساحر کے ہم قبیلہ رہے۔ ساحر کے گیتوں میں بیش تر شاعری ان کے شعری مجموعوں سے مشتق ہے۔ بعضے لفظوں کے ہیر پھیر سے اور بعضے بجنسہٖ۔ شعری مجموعے سے سنیما کی یہی ترسیل 'ایک قدم کا فاصلہ' ہے۔

ایسی کئی ایک مثالیں یہاں دی جا سکتی ہیں کہ جنھیں 'ایک قدم کا فاصلہ' سے موسوم کیا جائے۔ لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہ ہوگا کہ ساحر نے کلیتاً سنیما کے لیے لکھی گئی شاعری میں ایک خاص مزاج کو برقرار رکھا۔ سطحی نغموں میں بھی ادبیت کی چاشنی ضرور مل جاتی ہے۔ اپنے دیوان سے شعری نگارشات کو ایک قدم کے فاصلے سے سنیما میں پرو دینا بھی ساحر ہی کا کمال ہے۔ امریکی فلسفی جان ہاسپرس نے کہا تھا کہ ''اپنے اعمال سے ہم صرف دوسرے لوگوں پر اثر انداز نہیں ہوتے بلکہ فطرت کے وقوعات کا رخ بھی بدل دیتے ہیں'' (این انٹروڈکشن ٹو فلاسوفیکل اینالائسیس، یونیورسٹی آف کیلیفورنیہ پریس 1956، ص نمبر 498) مذکورہ بالا بیان کے عین مطابق ساحر نے اپنے 'عمل' سے وقوعاتِ فطرت کا رخ بدل دیا۔ ان ہی کی کوششوں سے ریڈیو پر نغمہ نگاران کے نام پڑھے جانے لگے، گیت لکھنے کے بعد دُھن بنائی جانے لگی، یہ جادو بلا شبہ کوئی ساحر ہی کر سکتا تھا۔

عملی فاصلہ

زہد را من آشنائی دادہ ام با عاشقی
ورنہ عمرے ہر دورا باہم نفاق افتادہ بود
(شبلی نعمانی)

مضمون کے دوسرے حصے کی جانب بڑھتے ہیں، یہاں بھی ساحر اور مدِ مقابل میں ہمیشہ ایک قدم کا فاصلہ رہا۔ ساحر کے معاشقوں کا حساب رکھیں تو 'یکے می رود دیگر آید بجائے' کے عین مصداق امرکول، پریم چودھری، سدھا ملہوترا، لتا منگیشکر، ہاجرہ مسرور اور پھر امرتا پریتم۔ ساحر مسلسل ناکامیوں سے سرفراز ہوتے رہے اور ہر مرتبہ 'اے۔ ایچ۔ ساحر اور ساحر لدھیانوی' نیز 'ساحر لدھیانوی اور معاشقے کی کامیابی' میں یہی 'ایک قدم کا فاصلہ' مانع رہا۔ مذکورہ بالا معاشقوں میں سب سے زیادہ طویل، مشہور یا بدنام معاشقہ امرتا پریتم والا رہا۔

ساحر لدھیانوی اور امرتا پریتم کی محبت کہنے کی بجائے میں اسے 'امرتا کی محبت' کہنا زیادہ مناسب سمجھتا ہوں۔ خود ساحر ہی کے لفظوں میں۔

تم مجھے بھول بھی جاؤ تو یہ حق ہے تم کو
میری بات اور ہے میں نے تو محبت کی ہے

یہ امرتا کی ہی محبت تھی جس نے تادمِ آخر اپنی یک طرفہ محبت کو کم نہ ہونے دیا۔ جنون کی حد تک محبت کرنا، دنیا و مافیہا کی فکروں سے آزاد فنکارہ کا شیوہ بن گیا۔ محبت اور اس کے برملا اور بے تامل اظہار میں امرتا کو دنیا کی قید و بند سے کبھی کسی زمانے میں کوئی فرق نہ پڑا۔ امرتا کور سے امرتا پریتم (1936 تا 1960) کے اس سفر میں ریل گاڑی کی زنجیر بظاہر تو امرتا نے کھینچی لیکن اس کے پسِ پردہ ہاتھ ساحر لدھیانوی کا ہی رہا۔ اپنی 24 سالہ ازدواجی زندگی کو سان پر رکھ کر امرتا پریتم نے عشق کی معراج حاصل کی۔ تاہم یہ معراج بھی یک طرفگی کا ہی شکار رہی۔ اور ایسے عالم میں کہ جہاں 'خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ' کی سی کیفیت ہو، وہاں عشق کی نیرنگی بھی قابلِ دید ہوتی ہے۔ ساحر محبت تو کرتے تھے لیکن اظہارِ محبت اور تکمیلِ محبت کے قائل نہ ہو پائے۔ اس کے برعکس ساحر کے عشق میں سرشار امرتا جس شدت سے محبت کرتی تھیں اسی شدت سے بہ بانگِ دہل اس کے اظہار میں بھی عار محسوس نہ کی۔ چنداں امثلہ ملاحظہ فرمائیں:

''دل کی تہوں میں سب سے پہلا درد جس کے چہرے کی تابانی میں دیکھا، وہ اس مذہب کا تھا، جس مذہب کے لوگوں کے برتن بھی اچھوت قرار دیے جاتے تھے۔ یہی چہرہ تھا جو میرے اندر کے انسان کو اتنا فراخ بنا گیا کہ ہندوستان کی تقسیم کے وقت، تقسیم کے ہاتھوں تباہ ہو کر بھی، دونوں مذاہب کے ظلم، بنا کسی رعایت کے یا جانبداریت کے تحریر کر سکی۔ یہ چہرہ نہ ہوتا تو 'پنجر' ناول کی تقدیر جانے کیا ہوتی۔ بیس اکیس برس کی تھی، جب قیاسی چہرہ اس زمیں پر دیکھا تھا، یہ 'شئ' کی مانند روز آگ میں نہانے والی حالت تھی۔ یہاں تک کہ 1957 میں جب اکادمی کا ایوارڈ ملا، فون پر خبر سنتے ہی سر سے پاؤں تک میں تاپ میں جھلس گئی۔ خدایا! یہ سنہیڑے میں نے کسی انعام کے لیے تو نہ لکھے تھے۔ جس کے لیے لکھے تھے اس نے نہ پڑھے۔ اب کل عالم بھی پڑھ لے تو مجھ کو کیا۔ اس روز شام کے وقت ایک پریس نے رپورٹر بھیجا فوٹو گرافر بھی، وہ جب تصویر لینے لگا، اس نے کاغذ اور قلم کے ذریعے وہ لمحہ گرفت میں لینا چاہا جو کسی نظم کے وقت تصنیف ہوتا ہے۔ میں نے سامنے میز پر کاغذ رکھا اور ہاتھ میں قلم پکڑ کر نظم لکھنے کی بجائے،، ایک بے خودی کے عالم میں اس کا نام لکھنے لگ گئی۔ جس کے لیے سنہیڑے لکھے تھے۔ ساحر۔ ساحر۔ ساحر۔ سارا کاغذ بھر گیا۔ پریس کے لوگ چلے گئے تو میں اکیلی بیٹھی کو ہوش سی لوٹی۔ صبح کو اخبار میں تصویر نکلے گی تو میز کے کاغذ پر یہ ساحر۔ ساحر کی گردان... اوخدایا! مجنوں کے لیلیٰ لیلیٰ پکارنے والی حالت میں نے اس روز اپنے جسم پت بتائی۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ کیمرے کا فوکس میرے ہاتھ کے اوپر تھا، کاغذ پر نہیں، اس لیے دوسرے دن کے اخبار میں کاغذ پر سے کچھ نہیں پڑھا جا سکتا تھا۔ (کچھ نہیں پڑھا جا سکتا تھا، اس بات کی تسلی کے بعد ایک درد بھی اس میں شامل ہو گیا۔ کاغذ خالی دکھائی دیتا ہے۔ لیکن خدا جانتا ہے کہ یہ خالی نہیں تھا)۔ ساحر کو میں تھوڑا 'اشو' ناول میں لکھا، پھر 'ایک سی انیتا' میں اور پھر 'دلی دیا گلیاں' میں ساگر کے روپ میں۔ نظمیں کئی لکھی تھیں، سنہیڑے سب سے طویل نظم، چیتر نام کی ساری نظمیں اور ایک آخری نظم 'آگ دی ایہہ بات ہے' تو ہے ایہہ بات پائی سی' لکھ کر لگا۔ کہ اب چودہ برس کا بن باس کاٹ کر آزاد ہو گئی تھی۔ لیکن بیتے ہوئے سال۔ تن پر پہنے کپڑے ایسے نہیں ہوتے۔ یہ جسم کے تل بن جاتے ہیں۔ گو زبان سے کچھ نہیں کہتے، جسم پر چپ چاپ پڑے رہتے ہیں۔ بلغاریہ کے جنوب کی طرف 'دارنا' کے مقام پر ٹھہری ہوئی تھی جس کے ایک طرف سمندر تھا، ایک طرف جنگل، ایک طرف پہاڑ۔ وہاں ایک شب یوں لگا جیسے سمندر کی جانب سے ایک کشتی آئی ہو، اور کشتی میں سے کوئی اتر کر، دریچے کی راہ سے۔ سالم کا سالم۔ میرے ہوٹل کے کمرے میں آ گیا ہو۔ ہوش و بے خودی مل سی گئیں۔ اس رات نظم لکھی تھی۔

'تیریاں یاداں بہت دیر ہوئی جلاوطن ہوئیاں۔''

(امرتا پریتم کی خود نوشت 'رسیدی ٹکٹ' مطبوعہ مکتبہ، اردو ادب، لاہوری گیٹ، لاہور 1976 ص نمبر 25-24)

اس میں کیا شبہ ہو سکتا ہے کہ 'ساحر لدھیانوی' یہ نام امرتا کے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا۔ وہ جس قدر محبت میں ڈوبی ساحر کی طرف بڑھتیں، ساحر اتنی ہی سبک رفتاری سے پیچھے ہو لیتے۔ یہ معاملہ روزِ اول سے تادمِ آخر چلتا رہا۔ مزید فرماتی ہیں:

''(دوسری بار۔ اس قسم کا موقع اس وقت دیکھا تھا، جب ایک دن ساحر آیا تو اس کو ہلکا سا بخار تھا۔ اس کے گلے میں درد تھا۔ سانس کھنچا کھنچا تھا۔ اس روز اس کے گلے اور چھاتی پر وکس ملی تھی، کتنی دیر ملتی رہی تھی۔ اور لگا تھا۔ یوں پاؤں کے بل کھڑی، میں پوروں سے، انگلیوں سے اور ہتھیلیوں کے ساتھ، اس کی چھاتی کو ہولے ہولے ملتی ہوئی ساری عمر بتا سکتی ہوں۔ میرے بیچ کی، خالص عورت، کو اس پل دنیا کے کسی قلم کاغذ کی ضرورت نہیں تھی۔'' (رسیدی ٹکٹ، بحوالہ بالا، ص نمبر 32)

یہاں بھی ہم امرتا پریتم کے والہانہ اور بے باکانہ عشق کی خوبصورت تصویر ملاحظہ کرتے ہیں۔ جہاں امرتا کے مزاج میں ٹھہراؤ تھا، وہیں ساحر بلا کے شوخ و چنچل واقع ہوئے تھے۔ بقول شاعر لکھنوی۔

تو نہیں نیند سہی، نیند نہیں موت سہی
کوئی آ جائے شبِ غم کا مقدر بن کے

اسی ذیل میں آگے امرتا رقم طراز ہیں:

''1960: یہ سال میری زندگی کا سب سے اداس سال تھا۔ زندگی کے کیلنڈروں سے پھٹے ہوئے ورق کی طرح۔ دل نے گھر کی دہلیزوں سے باہر قدم رکھ لیا تھا، لیکن سامنے کوئی راستہ نہ تھا، اس لیے گھبرا کے کانپنے لگا تھا۔ ساحر کو بمبئی فون کرنے کے لیے فون کے پاس گئی تھی کہ عجیب اتفاق ہوا تھا۔ اس روز کے بلٹز میں تصویر بھی تھی اور خبر بھی کہ ساحر کو زندگی کی اک نئی محبت مل گئی ہے، ہاتھ فون کے ڈائل سے کچھ انچ پرے، خلا میں کھڑے رہ گئے۔'' ('رسیدی ٹکٹ' بحوالہ بالا، ص نمبر 39)

یہاں مراد سدھا ملہوترا سے ہے۔ کوئی عجب نہ تھا کہ یہ تصویر بھی سچی تھی اور بلٹز میں چھپی خبر بھی سچی۔ لیکن امرتا کے عشق کو ابھی دوام ملنا باقی تھا لہٰذا سدھا ملہوترا کے ساتھ ساحر کچھ زیادہ دن نباہ نہ کر سکے۔ اور پھر بقول خلیل فرحت مرحوم:

اٹھیے فرحت پھر کسی مہوش پہ ڈورے ڈالیے
فطرتاً ہر ماہ وش دل کا برا ہوتا نہیں

امرتا مزید گویا ہوتی ہیں:

''ملک کی تقسیم سے پہلے تک۔ میرے پاس ایک چیز جو سنبھال سنبھال کر رکھا کرتی تھی۔ یہ ساحر کی نظم 'تاج محل' تھی جو اس نے فریم کروا کر مجھے دی تھی۔ لیکن ملک کی تقسیم کے بعد جو کچھ میرے پاس آہستہ آہستہ جمع ہوا ہے۔ آج اپنی الماری کا اندرونی خانہ ٹٹولنے لگی ہوں۔ تو دبے ہوئے خزانے ایسا معلوم ہوا ہے۔ ایک، ٹالسٹائی کی قبر سے لایا ہوا پتا ہے اور ایک کاغذ کا گول ٹکڑا۔ جس کے ایک طرف چھپا ہوا ہے۔ 'ایشین رائٹرز کانفرس' اور دوسری طرف ہاتھ سے لکھا ہوا ہے۔ ساحر لدھیانوی۔ یہ کانفرنس کے موقع کا بیج ہے جو کانفرس میں شامل ہر ادیب کو ملا تھا۔ میں نے اپنے نام کا اپنے کوٹ پر لگایا ہوا تھا اور ساحر نے اپنے نام کا اپنے کوٹ پر کہ ساحر نے اپنے والا اتار کر میرے کوٹ پر لگا دیا اور میرے والا اپنے کوٹ پر لگا لیا۔ اور آج وہ کاغذ کا ٹکڑا، ٹالسٹائی کی قبر سے لائے ہوئے پتے کے ساتھ پڑا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے۔ گویا یہ بھی میں نے ایک پتے کی طرح اپنے ہاتھ سے اپنی قبر پر سے توڑا ہو۔'' ('رسیدی ٹکٹ' بحوالہ بالا، ص نمبر 76-75)

ساحر کا اپنے نام کا بیج امرتا کے کوٹ پر لگا دینا اس بات کی طرف تو اشارہ کرتا ہے کہ ساحر بھی امرتا کے عشق میں گرفتار تھے تاہم تاہم محض عشق تک ہی رہا بلکہ مشروط عشق تک۔ اور جہاں تک نام کا تعلق ہے، بقول شمیم فرحت صاحب۔

ہمارے نام سے تم کو پکارتے ہوں گے
تمھارے نام سے ہم کو پکارنے والے

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ امرتا پریتم پنجابی ادب کی ایک مایہ ناز ادیبہ ہیں تاہم اس سے بھی کون انکار کرے کہ امرتا کو عالمی بلکہ آفاقی شہرت ساحر کے نام سے وابستگی ہی نے دلوائی۔

''ایک دفعہ ایک اردو مشاعرے پر لوگ ساحر سے آٹوگراف لے رہے تھے۔ کچھ لوگ منتشر ہوئے تو میں نے ہنس کر ہاتھ کی ہتھیلی اس کے آگے کر دی اور کہا: 'آٹوگراف'! ساحر نے ہاتھ میں پکڑے پین کی سیاہی اپنے انگوٹھے پر لگا کر وہ انگوٹھا میری ہتھیلی پر لگا دیا جیسے میری ہتھیلی کے کاغذ پر دستخط کر دیے۔ اس میرے کاغذ کی کیا عبارت تھی جس کے اوپر اس نے دستخط کیے، یہ سب ہواؤں کے حوالے ہے یہ عبارت نہ کبھی اس نے پڑھی، نہ زندگی نے، اسی لیے کہہ سکتی ہوں، ساحر ایک خیال تھا۔ ہوا میں چمکتا ہوا، شاید میرے اپنے ہی خیالوں کا ایک جادو۔'' ('رسیدی ٹکٹ' بحوالہ بالا، ص نمبر 84)

''سینتیس سال لمبی ایک تسلی ہے، جس کا نام اوتار ہے۔ یہی دوست ہے جو آج بھی میرے منہ سے ساحر کی بیماری کا حال سن کر بمبئی گئی تو اس ہسپتال تک بھی پہنچ گئی، جہاں ساحر تھا۔ جا کر اس کے سینے پر سر رکھ کر رو پڑی۔ اس کی پیشانی چومی اور رو کر اس کا حال دریافت کرتی رہی۔ میرے پاس آئی تو کہنے لگی۔ 'گئی تھی، اس کے سینے پر سر رکھا تو محسوس ہوا، یہ میں نہیں، تو ہے۔ تیری جگہ گئی تھی، تو بن کر!'۔ یہ دوستی کی کیسی بلندیاں ہیں، کبھی کبھی میری اپنی آنکھیں بھی چندھیا جاتی ہیں''۔

('رسیدی ٹکٹ' بحوالہ بالا، ص نمبر 124)

مندرجہ بالا اقتباسات کی شمولیت، بادی النظر میں بے جا اضافہ قرار پا سکتی ہے، تاہم مذکورہ مواد ساحر اور امرتا کے تعلق باہمی کی تفہیم کے لیے از حد ضروری ہے۔ امرتا پریتم کی 178 صفحات پر مشتمل خود نوشت 'رسیدی ٹکٹ' میں ساحر کا ذکر صرف متذکرہ بالا اقتباسات میں ہی شامل رہا ہے۔ لہٰذا قاری گرچہ محض 'رسیدی ٹکٹ' کے حوالے سے امرتا کے تعلق خاطر کو جاننے کا خواہش مند ہو تو مندرجہ بالا رشحات نہایت مفید ثابت ہوں گے۔ 'رسیدی ٹکٹ' کے منظر نامے کو ہم گرچہ 'تصویر کا ایک رخ' قرار دیں تو ساحر کی جانب سے 'تصویر کا دوسرا رخ' قطعی طور پر دھندلا اور لایعنی سا معلوم پڑتا ہے۔ تاہم یہ تو لازماً ہو گیا کہ دنیائے ادب کو ساحر امرتا کی ایک لازوال عشقیہ داستان میسر آ گئی۔

اوپر تحریر کردہ نکات سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ساحر اور امرتا پریتم کے معاملاتِ عشق میں ساحر کی جانب سے خود سپردگی کا عالم کچھ کم کم ہی رہا۔ جب کہ امرتا کی اولین ازدواجی زندگی (1936 تا 1960) کے دوران بھی امرتا پر ساحر چھائے رہے اور پھر امروز کے ساتھ والی قطعی مطابقتی دور میں بھی ساحر لدھیانوی کسی آسیب کی طرح امرتا پر اثر انداز رہے۔ لیکن یہاں بھی ساحر امرتا کے عشق کی معراج سے ایک قدم کے فاصلے پر ہی کھڑے کھڑے اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔

بقول معین احسن جذبی۔

اے موجِ بلا ان کو بھی ذرا، دو چار تھپیڑے ہلکے سے
کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے، طوفاں کا نظارہ کرتے ہیں

غرض کہ ساحر لدھیانوی کی علمی اور عملی دونوں ہی زندگیوں میں 'ایک قدم کا فاصلہ' نمایاں طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہی وہ ایک قدم کا فاصلہ ہے جو انھیں ترقی پسندوں کے ہجوم میں سب سے زیادہ پرکشش شاعر کا درجہ دلواتا ہے۔

■

Waseem Farhat (Alig)
Editor : Sah Mahi 'Urdu'
Amrawati (MS)

'سینتیس سال لمبی ایک تسلی ہے، جس کا نام اوتار ہے۔ یہی دوست ہے جو آج بھی میرے منہ سے ساحر کی بیماری کا حال سن کر بمبئی گئی تو اس ہسپتال تک بھی پہنچ گئی، جہاں ساحر تھا۔ جا کر اس کے سینے پر سر رکھ کر رو پڑی۔ اس کی پیشانی چومی اور رو کر اس کا حال دریافت کرتی رہی۔ میرے پاس آئی تو کہنے لگی۔ 'گئی تھی، اس کے سینے پر سر رکھا تو محسوس ہوا، یہ میں نہیں، تو ہے۔ تیری جگہ گئی تھی، تو بن کر!'۔ یہ دوستی کی کیسی بلندیاں ہیں، کبھی کبھی میری اپنی آنکھیں بھی چندھیا جاتی ہیں'

حسان الہند
مولانا احمد رضا خاں

محمد یٰسین

مولانا احمد رضا خاں نے شاعری کے تمام اصناف میں باکمال شاعری کی ہے۔ آپ کی شاعری میں تغزل کا رنگ زیادہ گہرا نظر آتا ہے۔ غزل کے انداز میں حمد، نعت، منقبت، قصیدہ وغیرہ خوب خوب کہا۔ علاوہ ازیں مثنوی، قطعات، رباعیات میں طبع آزمائی بھی کی ہے۔ مولانا کی قادرالکلامی کو دیکھ کر دنیائے اردو ادب کے بڑے بڑے علما، شعرا، ماہرین انگشت بدنداں ہیں۔ ان کے اشعار اور دوسرے شعرا کے اشعار میں تھوڑا موازنہ کرتے ہیں۔

شکیل بدایونی کا ایک شعر ہے جس میں استعارے کا استعمال ہے۔

اے میرے ماہ کامل پھر آشکار ہوجا
اُکتا گئی طبیعت یاروں کی روشنی ہے

شاعر نے یہاں اپنی محبوبہ کے لیے اصل معنی ترک کر کے 'ماہ کامل' کے مجازی معنی کا استعمال کیا ہے اپنی معشوقہ کے لیے۔ وہیں احمد رضا خاں کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں استعاروں کو زندگی کا سکون و آرام بتایا ہے۔

آنکھیں ٹھنڈی ہوں جگر تازے ہوں جانیں سیراب
سچے سورج وہ دل آرا ہے اجالا تیرا

نعتیں بانٹتا جس سمت و ذی شان گیا
ساتھ ہی منشیِ رحمت کا قلمدان گیا

واللہ جو مل جائے میرے گل کا پسینہ
مانگے نہ کبھی عطر نہ پھر چاہئے دلہن پھول

اٹھا دو پردہ دکھا دو چہرہ کہ نور باری حجاب میں ہے
زمانہ تاریک ہو رہا ہے کہ مہر کب سے نقاب میں ہے

کعبہ کے بدر الدجی تم پہ کروڑوں درود
طیبہ کے شمس الضحیٰ تم پہ کروڑوں درود

اب یہاں تشبیہ کے کچھ اشعار موازنے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ میر تقی میر کا مشہور زمانہ شعر ہے۔

نازکی ان کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی ایک گلاب کی سی ہے

شاعر نے بڑے فنکارانہ انداز میں اپنے محبوب کے ہونٹ کو گلاب کی پنکھڑی سے تشبیہ دی ہے۔

احمد رضا خاں اپنے محبوب کی شان میں کیا لاجواب اشعار کہے ہیں: ملاحظہ ہوں۔ جس میں نبی کریمؐ کے نازک اور مبارک ہونٹوں کی سچی تصویر پیش کی ہے۔

پتلی پتلی گل قدس کی پتیاں
ان لبوں کی نزاکت پہ لاکھوں سلام

ماہر چاند پوری کا ایک شعر ہے۔

چاند سے چہرے میں بکھری ہے وہ زلف عنبریں
رات کیوں ہے آج اتنی دل ربا معلوم ہے

شاعر نے اس شعر میں اپنے محبوبہ کے چہرے کو چاند سے مشابہت کی ہے احمد رضا لکھتے ہیں۔

دل کرو ٹھنڈا میرا وہ کف پا چاند سا
سینے پہ رکھ دو ذرا تم پہ کروڑوں درود

ان اشعار میں احمد رضا خاں اپنے محبوب یعنی محمد رسول اللہؐ کے تلوؤں کی مثال چاند سے دی ہے۔

ریش خوش معتدل مرہم ریش دل
ہالۂ ماہ ندرت پہ لاکھوں سلام

احمد رضا خاں نے نبی کریمؐ کے چہرۂ مبارک اور داڑھی شریف کو ہالۂ ماہ یعنی چاند کے اردگرد جو کنڈل ہوتا ہے اس سے تشبیہ دی ہے بہت ہی خوبصورت انداز میں تصویر کشی کی ہے۔

صنعت مبالغہ میں اردو شعرا نے تو ایک سے بڑھ کر ایک شعر کہے ہیں یعنی حد سے مبالغہ کرنا اسی ضمن میں امیر مینائی کا شعر ہے۔

ہنس پڑے آپ تو بجلی چمکی
بال کھولے تو گھٹا لوٹ آئی

لیکن مولانا نے ایسے جو اشعار کہے ہیں اس میں مبالغے کی کوئی بات ہی نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کی جو شان قرآن میں بیان کی ہے اس کو انھوں نے شعری پیرائے میں بڑی فنکاری سے پرو دیا ہے۔

اے رضا خود صاحب قرآن ہے مداح حضور
تجھ سے کب ممکن ہے پھر مدحت رسول اللہ کی

ہماری اردو شاعری میں صنعت اقتباس کا بھی استعمال کچھ شاعروں نے کیا ہے یعنی اپنے شعر میں قرآن مجید کا ایک ٹکڑا لے کر مصرعے کو مکمل کرتے ہیں۔ آیئے غالب کے دو مصرعے دیکھتے ہیں اور غالباً ایسے اشعار صرف دو ہی ہیں۔

دھوپ کی تابش آگ کی گرمی
وقنا ربنا عذاب النار

جاں مطرب ترانہ ھل من مزید ہے
لب پر وہ سنج زمزمۂ الاماں نہیں

آیئے علامہ اقبال کے کچھ اشعار پیش کرتے ہیں۔

رنگ او ادنیٰ میں رنگین ہو کے اے ذوق طلب
کوئی کہتا تھا کہ لطف ما خلقنا اور ہے

زندگی از دھر و دھر از زندگی ست
لا تسبو االدھر فرمان نبی ست

کس کی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے تھے
منہ کے بل گر کے ھو اللہ احد کہتے تھے

چشم اقدام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعت شان رفعنا لک ذکرک دیکھے

علامہ اقبال کے علاوہ اردو کے بہت سے شعرا نے صنعتِ اقتباس کا استعمال اپنے اپنے اشعار میں اپنی فنی صلاحیت سے کیا ہے لیکن احمد رضا خاں کے کلام میں صنعتِ اقتباس کی موجودگی اتنی کثرت سے پائی جاتی ہیں کہ اس کو ایک مضمون میں بیان کرنا مشکل ہے کچھ اشعار مثال کے طور پر آیئے دیکھتے ہیں۔

ورفعنا لک ذکرک کا ہے سایہ تجھ پر
بول بالا ہے ترا ذکر ہے اونچا تیرا

غنچے مایوحیٰ کے جو چٹکے دنی کے باغ میں
بلبل سدرہ تک ان کی بو سے بھی محرم نہیں

فاذا فرغت فانصب یہ ملا ہے تم کو منصب
جو گدا بنا چکے اب اٹھو وقت بخشش کرو قسمت عطایا

مژگان کی صفیں چار ہیں، دو ابرو ہیں
والفجر کے پہلو میں لیال عشر

دیکھنے والوں نے کچھ دیکھا نہ بھالا نور کا
من رای کیسا ؟ یہ آئینہ دکھا یا نور کا

ک گیسوہ دہن ابرو آنکھیں ع ص
کہیعٓص ان کا چہرہ ہے نور کا

صنعتِ تضاد میں بھی احمد رضا خاں کا کوئی جواب نہیں۔اس صنعت میں ان کے ہزاروں اشعار ہیں ان کو یہاں پیش کر پانا بہت مشکل ہے۔ کچھ اہم اشعار ہم ضرور نقل کریں گے اور ساتھ میں اکابرین اردو کے شاعروں کے اشعار بھی مثال کے طور پر تحریر کریں گے جس سے احمد رضا خاں کی وصف کی توضیح و موازنہ بھی ہو جائے گا۔

مرزا اسد اللہ خاں غالب کا شعر ہے۔

فرش سے تا عرش، واں طوفاں تھا موج رنگ کا
یا زمین سے آسمان تک سوختن کا باب تھا

اس شعر میں فرش و عرش کا تضاد دکھایا گیا ہے۔

اکبرالٰہ آبادی کا شعر ہے۔

نگاہ ناز بتاں پر نثار دل کو کیا
زمانہ دیکھ کے دشمن سے دوستی کر لی

یہاں پر دوستی اور دشمنی ایک دوسرے کے ضد میں شعری پیرائے میں لایا گیا۔

اصغر گونڈوی کا شعر ہے۔

اس عالم ہستی میں نہ مرنا ہے نہ جینا ہے
تو نے کبھی دیکھا نہیں، مستوں کی نظر سے

اس میں مرنا اور جینا دو متضاد کو پیش کیا گیا ہے۔

فیض احمد فیض کا شعر ہے۔

وصل کی شب تھی تو کس درجہ سبک گزری تھی
ہجر کی شب ہے تو کیا سخت گراں ٹھہری ہے

اس شعر میں وصل کی ضد ہجر، سبک کی ضد گراں اور 'تھی' کی ضد 'ہے' ہے۔

جگر مرادآبادی کا شعر ہے۔

خدا جانے محبت کون سی منزل کو کہتے ہیں
نہ جس کی ابتدا ہی ہے، نہ جس کی انتہا ہی ہے

اس شعر میں ابتدا اور انتہا دو متضاد الفاظ ہیں۔

احمد رضا خاں کے اشعار کو دیکھتے ہیں کہ صنعت تضاد کو بڑی فنی خوبیوں و صلاحیتوں سے اردو شعری پیرائے کو مزیّن و آراستہ کیا ہے۔

بڑھ چلی تیری ضیا اندھیر عالم سے گھٹا
کھل گیا گیسو ترا، رحمت کا بادل گھر گیا

نہ آسمان کو یوں سر کشیدہ ہونا تھا
حضور خاک مدینہ خمیدہ ہونا تھا

نار و دوزخ کو چمن کر دے بہار عارض
ظلمت حشر کو دن کر دے نہار عارض

کبھی خاک پر پڑا ہے، سر چرخ زیر پا ہے
کبھی پیش در کھڑا ہے۔ سر بندگی جھکایا

ہلکا ہے اگر ہمارا پلّہ
بھاری ہی ہے تیرا وقار آقا

صنعتِ تلمیح کے کچھ اشعار کا موازنہ کرتے ہیں:

مرزا اسد اللہ خاں غالب کا شعر ہے۔

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوار زنداں ہو گئیں

فانی بدایونی کا شعر ہے۔

طور نے جل کر ہزاروں طور پیدا کر دیے
ذرہ ذرہ میرے دل کی خاک کا دل ہو گیا

مولانا احمد رضا خاں کے اشعار دیکھتے ہیں جس میں صنعت تلمیح بڑی فنکاری سے پیش کی گئی ہے۔

تیری مرضی پا گیا، سورج پھرا الٹے قدم
تیری انگلی اٹھ گئی مہ کا کلیجا چر گیا

اس شعر میں جناب علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نماز عصر قضا کو ادا کرنے کے لیے حضور اقدسؐ نے سورج کو واپس ہونے کا حکم دیا تھا اسی واقعے کو اس شعر میں بحسن خوبی پیش کیا ہے۔

اپنے مولیٰ کی ہے بس شان عظیم
جانور بھی کریں جن کی تعظیم
سنگ کرتے ہیں ادب سے تسلیم
پیڑ سجدے میں گرا کرتے ہیں

اس مصرعے میں جانوروں کے سجدے اور سنگریزوں کے آقا علیہ السلام پر درود و کلمہ شہادت اور مصرعۂ ثانی میں معجزۂ شق القمر یعنی چاند کے دو ٹکڑے ہونے کے معجزہ کی طرف اشارہ ہے۔

حسن تعلیل کے کچھ اشعار دیکھتے ہیں۔

مرزا غالب کا شعر ہے۔

میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستان کھل گیا
بلبلیں سن کر میرے نالے غزل خواں ہو گئیں

فیض احمد فیض کا شعر ہے۔

رنگ پیراہن کا، خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسم گل ہے تمھارے بام پر آنے کا نام

مولانا احمد رضا خاں کے اشعار میں حسن تعلیل کا کس فنی صلاحیتوں سے استعمال کیا گیا ہے وہ لائق ستائش ہے۔

خم ہو گئی پشت فلک اس طعن زمین سے
سن ہم پہ مدینہ ہے وہ رتبہ ہے ہمارا

چمن طیبہ میں سنبل جو سنوارے گیسو
حور بڑھ کر شکن ناز پہ وارے گیسو

رخ انور کی تجلی جو قمر نے دیکھی
رہ گیا بوسہ دہ نقش کف پا ہو کر

مولانا احمد رضا خاں نے سبھی اجزائے ترکیبی میں شعر کہے ہیں یہاں پر سبھی ترکیبوں کا ذکر کر پانا بہت مشکل ہے۔ شاعری کی شاید ہی کوئی ایسی صنعت ہو جس کو انھوں نے کلام آراستہ نہ کیا ہو۔ جب کہ اردو ادب کے صفِ اول کے شاعر کہلانے والے نامور شاعروں کے دیوان اردو شاعری کی بہت سی صنعتوں سے محروم ہیں۔ آپ کی تمام شاعری کا جائزہ لینے میں اہل ادب تامل نہ کرتے اور فن و ادب کے کمال کے ترازو میں رضا کے اشعار اور دیگر شعرائے اردو ادب کے اشعار کا موازنہ کرتے لیکن ایسا نہیں ہوا اہل ادب نے تنگ نظری اور تعصب پذیر ذہنیت کا ثبوت دیا فن و ادب سے وابستگی رکھنے والے با صلاحیت اور دانش ور طبقے کو بھی طوطا چشمی کا مرض لگ گیا جو عدل قائم کرنے میں ناکام رہے اردو ادب میں ایک عظیم سخن ور کو نظر انداز کیا گیا۔ کاش ایسا نہ ہوتا تو اہل اردو ادب رضا کے کلام کو بطور مثال پیش کرتے۔ جس نے تمام صنعتوں میں اشعار کہہ کر فن شاعری کو سر بلندی عطا کی ہے۔ جس کا اعتراف کرنا پڑے گا۔

چمک تجھ سے پاتے ہیں سب پانے والے
میرا دل بھی چمکا دے چمکانے والے
تو زندہ ہے واللہ تو زندہ ہے واللہ
میری چشم عالم سے چھپ جانے والے

بگڑا جاتا ہے کھیل میرا
آقا آقا سنوار آقا

■

Dr. Mohammad Yaseen
A-380, G.T.B, Nagar Kareli
Allahabad-211016, Mob: 9336084416

غلام حسین

بلند پایہ ہستی
اختر بستوی

آزادی کے بعد جب اردو زبان پر افتاد آن پڑی تو ایسی ناگفتہ بہ صورت حال میں برگزیدہ اساتذۂ کرام نے ہی اس شکستہ کشتی کی ناخدائی کی۔ اس کے تحفظ و ترویج اور معیار و وقار کو برقرار رکھنے میں انھیں حضرات نے اپنا خون جگر صرف کیا۔ جسے محبان اردو کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ اس کار عظیم میں گورکھپور یونیورسٹی کا شعبۂ اردو بھی شریک و سہیم ہے۔ یہ شعبہ اپنی ابتدا سے ہی اہل علم اور اہل قلم سے معمور رہا ہے۔ ڈاکٹر اختر بستوی کا شمار انھیں اساتذہ میں ہوتا ہے۔ ان کی ولادت 10 اگست 1940 کو ضلع بستی میں مردم خیز علاقہ کے ایک معتبر اور مودب خانوادے میں جناب اصغر علی صدیقی کے یہاں ہوئی۔ جہاں اردو تہذیب و تمدن کا بول بالا تھا۔ ان کا اصل نام محمد اختر علی صدیقی ہے جو ادبی دنیا میں اختر بستوی کے نام سے مشہور ہوئے۔ آزادی سے قبل اردو تعلیم کی زبان عام تھی۔ چنانچہ ان کی ابتدائی تعلیم اردو میں ہوئی ان کے والد کا انتقال کم سنی میں طالب علمی ہی کے زمانے میں ہو گیا تھا۔ انھوں نے نا مساعد حالات کی پروا کیے بغیر تعلیم و تعلّم کا سلسلہ جاری رکھا۔ تعلیم کی منزل اول ہی میں ماحول نے انھیں ''با ادب با نصیب، بے ادب بے نصیب'' کا سبق سکھا دیا تھا۔ انھوں نے ضلع بستی (یو پی) کے خیر انٹر کالج میں تعلیم حاصل کی اور وہیں اپنے حسن اخلاق اور ذہانت سے معلّم مقرر ہو گئے اور علامہ اقبال کے اس شعر کو نصب العین بنا کر ترقی کے منازل طے کرتے رہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اختر بستوی صاحب کے یار غار ابن صاحب نے جن کی دوستی بچپن سے دم واپسیں تک قائم رہی ان کے سانحۂ ارتحال پر اپنی یادوں کو اس طرح تازہ کیا ہے:

''مرحوم اختر بستوی اوائل عمری سے ہی ایک پر عزم انسان تھے۔ ان کے اندر کچھ کرنے، کچھ بننے کی لگن بچپن سے ہی تھی۔ انھوں نے اپنے عزائم کو عملی شکل دینے کے لیے اردو ادب کا میدان چنا۔ تقریباً 12 سال کی عمر میں ماہنامہ 'کھلونا' دہلی کے کہانی کے مقابلے میں ان کی انعام یافتہ کہانی چھپنے سے ان کا جو ادبی سفر شروع ہوا تھا وہ وقت کے ساتھ ہندو پاک کے تمام ادبی رسائل کی ضرورت بن گیا۔'' (ماہنامہ، گلابی کرن، اختر بستوی نمبر، ص 58، جولائی 1999)

مشق سخن کے ابتدائی دور میں ہی آپ کا یہ شعر مقبول و معروف ہوا۔

آساں نہیں انصاف کی زنجیر ہلانا
دنیا کو جہانگیر کا انصاف نہ سمجھو

اس وقت خیر انٹر کالج کی بڑی شہرت تھی۔ اس کالج میں طلبا کو داخلہ ملنا ہی باعث افتخار ہوتا تھا۔ اساتذہ کی توقیر کا کیا کہنا مقبول صاحب (پرنسپل) کا رعب و رتبہ بستی شہر تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ اطراف و جوانب میں ان کی شہرت کا ڈنکا بجتا تھا۔ وہ مسلم اور غیر مسلم میں یکساں مقبول و محترم تھے۔ ایسا ہی پروقار ادارہ اختر صاحب کا میدان عمل تھا۔ پڑھتے پڑھاتے وہ شہرت کی بلندیوں پر چڑھتے گئے اور ایک دن اردو ادب کے درخشاں ستارے بن گئے۔ دوران ملازمت پرائیویٹ طور پر اعلیٰ تعلیم کی ڈگریاں حاصل کیں۔ انھوں نے تاہل کی زندگی اختیار نہیں کی مگر ان ذمے داریوں کو نبھانا اپنا فرض اولیں سمجھا جو والد کے انتقال پر قدرت نے بڑے ہونے کے ناتے ان کے کاندھوں پر ڈال دی تھی۔ وہ ذمے داریوں کے ساتھ ساتھ ادبی اور سماجی خدمات میں پیش پیش رہے۔ گھر کے بندوبست کو بڑے سلیقے سے نبھایا۔ والدہ کی خدمت اور چھوٹے بھائی بہنوں کی کفالت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ انھوں نے اپنی شادی تو نہیں کی مگر بے شمار جوڑوں کو رشتۂ ازدواج میں باندھنے کے لیے ثالث کا بخوبی نبھایا۔ بستی میں وہ فعال و با اقبال تھے۔ ان کی رئیسانہ ٹھاٹھ باٹ تھی۔ خیر کالج چند قدم ہی کی دوری پر تھا جہاں وہ پیدل سردیوں میں چھتری لگا کر جاتے تھے۔ عموماً وہ شام میں چھڑی لے کر ٹہلنے نکلتے تھے۔ دوست احباب سے ملتے ہنومان پرساد جگر کے دواخانے میں ان کی نشست ہوتی۔ کبھی کبھار دریاخاں محلّہ میں واقع قاضی عدیل عباسی صاحب کے دولت خانے پر حاضری دیتے۔ اپنے ذاتی مطالعہ، محنت پیہم اور ذہانت سے ایک دن خیر انٹر کالج میں انگلش کے لکچرر مقرر ہو گئے مگر وہ ستاروں سے آگے بھی اور جہاں دیکھنے کے متمنی تھے۔ لہٰذا اردو ادب میں بھی ایم اے کیا اور پروفیسر محمود الٰہی صاحب کی نگرانی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ موصوف اردو شعر و ادب کے جوہری تھے چنانچہ انھوں نے اس ہیرے کو پہچاننے میں دیر نہیں کی اور گورکھپور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں انھیں شامل کر لیا۔ یونیورسٹی میں تقرر ہونے سے ان کے وقار میں اضافہ ہوتا گیا۔

اختر صاحب دوست احباب اور عزیز و اقارب کے

معاملے میں بڑے خوش نصیب تھے۔ان کے دوستوں کی طویل فہرست تھی جو پورے ملک میں پھیلے ہوئے تھے۔ اردو کے شعرا و ادبا اور اساتذہ سے ان کے مخلصانہ روابط تھے۔ان کی خوشی اور غمی میں برابر کے شریک ہوتے۔ان کی دوستی بے لوث تھی اور دشمنی بے ضرر۔اگر مقامی شعرا سے معاصرانہ چشمک ہو بھی جاتی تو اس میں کدورت کا شائبہ نہیں ہوتا۔اردو تحریک اور تحریر سے جو بھی حضرات وابستہ ہوتے وہ ان کے شیدائی ہوتے۔گورکھپور سے سیکڑوں کلومیٹر کی دوری پر واقع چنئی میں براجمان علیم صبا نویدی جو اردو زبان و ادب کے مربی و محافظ ہیں۔ہر سال وہ اپنی نوع بہ نوع تخلیقات سے تشنگان اردو ادب کی پیاس بجھاتے ہیں۔ان سے ان کی بڑی قربت تھی۔وہ فقط دوستی کرنا ہی نہیں جانتے تھے بلکہ اسے نبھانا بھی جانتے تھے۔ان کے بچپن کی دوستی تاحیات قائم رہی۔ان کے دوستوں میں جناب ارشد عباسی صاحب (پسر قاضی عدیل عباسی صاحب) کی انسیت آج بھی قائم ہے جب بھی اختر صاحب کا ذکر آتا ہے تو وہ آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔ منظور احمد ادیب نے دیگر دوستوں کی دوستی کو اپنے ایک شعر میں اس طرح پرویا ہے۔

ارشد،تحفظ،ابن و معروف دم بخود
ایسا رفیق جملہ رفیقاں چلا گیا

وہ ایک اچھے استاد کے ساتھ ساتھ ایک سعادت مند شاگرد بھی تھے بقول دیگر استاد تو بہت ملتے ہیں لیکن شاگرد بہت مشکل سے ملتے ہیں۔وہ ایسے شاگرد تھے جو اپنے استاد کے احترام میں بے مثال تھے وہ اکثر اپنے اساتذہ کا ذکر خیر کرتے۔خصوصاً مقبول صاحب (پرنسپل) خیر انٹر کالج اور پروفیسر محمود الٰہی صاحب سے انھیں از حد عقیدت تھی۔ وہ اپنے بزرگوں کے کارناموں کو محفوظ کرنا اور اسے منظر عام پر لانا اپنا فرض عین سمجھتے تھے۔اس سیاق میں انھوں نے مجاہد آزادی اور مربی اردو قاضی محمد عدیل عباسی کے سیاسی اور صحافتی کارناموں کو اجاگر کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔سب سے پہلے انھوں نے بستی سے شائع ہونے والے ہفتہ وار اخبار 'بستی کی آواز' کا قاضی عدیل عباسی نمبر بڑے اہتمام سے نکالا جس میں مشاہیر ادب کے مضامین شامل کیے اس کے بعد ''کردار کے غازی قاضی عدیل عباسی'' بھی مرتب کی پھر اسی موضوع پر انھوں نے ایک مونوگراف بھی سپرد قلم کیا جسے ساہتیہ اکادمی نے شائع کیا اور اس مونوگراف پر یوپی اردو اکادمی نے انھیں انعام سے نوازا۔

ڈاکٹر اختر بستوی نے گورکھپور یونیورسٹی میں آنے سے پہلے ہی اردو ادب میں نمایاں مقام بنا لیا تھا۔بحیثیت شاعر وہ معروف ہو چکے تھے۔دو طویل نظموں کے مجموعے 'نغمۂ شب' اور 'بحر بے کراں' نیز قطعات کا مجموعہ 'پیکر خیال' منظر عام پر آچکے تھے۔اس کے علاوہ برصغیر کے معیاری رسائل اور جرائد میں ان کے کلام بکثرت شائع ہوتے تھے۔جب وہ اپنا مجموعہ کلام شائع کراتے تو اس پر کسی معروف ہستی سے ہی پیش لفظ لکھواتے۔اپنے پہلے مجموعہ کلام کا پیش لفظ انھوں نے فلم اداکار دلیپ کمار سے لکھوایا تھا۔اور جب 1989 میں نظموں کا مجموعہ 'اپنے سائے کے سوا' شائع کروایا تھا تو نامور شاعر کیفی اعظمی سے پیش لفظ لکھوایا۔انھوں نے ان کی سحر آفریں ادبی شخصیت کا احاطہ اس انداز میں کیا:

''میں حیران ہوں کہ ڈاکٹر اختر بستوی کی ہشت پہلو شخصیت کا مطالعہ کس رخ سے شروع کروں۔وہ ایک فصیح و بلیغ خطیب ہیں۔وہ شگفتہ اور شاداب نثر لکھتے ہیں۔وہ بہت ہی کامیاب مترجم ہیں۔طویل نظمیں لکھنے میں انھیں استادانہ مہارت حاصل ہے۔اختر انصاری اور نریش کمار شاد کے بعد سب سے اچھے قطعات 'پیکر خیال' اختر بستوی نے لکھے ہیں وہ تالیف و تدوین کا ایک خاص سلیقہ رکھتے ہیں۔ان کی تنقیدی اور تحقیقی نظر بھی معتبر ہے۔''

آگے کیفی صاحب نے 'اپنے سائے کے سوا' کے محاسن اس طرح بیان کیے ہیں:

ڈاکٹر اختر بستوی نے گورکھپور یونیورسٹی میں آنے سے پہلے ہی اردو ادب میں نمایاں مقام بنا لیا تھا۔بحیثیت شاعر وہ معروف ہو چکے تھے۔دو طویل نظموں کے مجموعے 'نغمۂ شب' اور 'بحر بے کراں' نیز قطعات کا مجموعہ 'پیکر خیال' منظر عام پر آچکے تھے۔

''یہ سب نظمیں، نظم کے فن پر پوری اترتی ہیں۔ آج کل ہماری زبان میں جو چیزیں لکھی جارہی ہیں وہ یا تو مختصر مثنویاں ہوتی ہیں یا غزل مسلسل وہ نظمیں نہیں ہوتی ہیں۔ اختر صاحب کی یہ نظمیں خیال کی اکائیاں ہیں۔ آپ کو کسی بھی نظم میں نہ خیال کی تکرار ملے گی نہ لفظوں اور ترکیبوں کی غیر ضروری کثرت۔''

(پیش لفظ: اپنے سائے کے سوا، ص نمبر 6-5)

اختر صاحب کی نظمیں فن کی کسوٹی پر کھری اترتی ہیں۔ان کی نظمیں جمالیاتی حس اور روحانی مسرت کی آئینہ دار ہیں۔ان کی نظموں میں غزل کی جلوۂ صدرنگی، قطعات اور رباعیات کی فلسفیانہ گیرائی موجود ہے۔علامہ اقبال کی طرح وہ فلسفۂ خودی کے شاعر ہیں۔ان کے مشاہدے اور مطالعے میں عمل کے جذب و انجذاب کی کیفیت بھرپور ملتی ہے۔نظم 'آشوب دور آہن' میں عصری آگہی کو چند مصرعوں میں کس ہنرمندی سے سمیٹ لیا ہے۔

رقص ہر جانب مشینی بھوت کا
حکمرانی ہر طرف فولاد کی
اجتماعی زندگی کا شور و شر
روح ہر سو مضطرب افراد کی
آرزوئیں زیر دام روز گار
خواہشوں پر غلبہ فکر معاش
دور آہن میں سکوں کی جستجو
دوپہر میں اپنے سائے کی تلاش

انھوں نے زندگی کا عمیق مطالعہ کیا ہے۔حاصل زندگی کو انھوں نے نظم 'تگ و دو' کے چند مصرعوں میں بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔

عمر بھر میں دہر کے صحرا میں سرگرداں رہا
جلوہ ہائے کائنات و زیست کا خواہاں رہا
روز و شب پھرتا رہا لے کر میں قلب ناصبور
پا سکا اب تک نہ لیکن ایک بھی جلوے کا نور
وائے ناکامی نہ میرا غنچہ دل کھل سکا
اپنے سائے کے سوا کچھ بھی نہ مجھ کو مل سکا

اختر صاحب کو فلسفہ و حکمت سے فطری مناسبت تھی احساس برتری اور احساس کمتری پر اکثر مباحثے ہوتے رہتے ہیں۔انھوں نے بھی اس حکیمانہ و فلسفیانہ موضوع کو اپنے کلام میں جگہ دی ہے۔وہ 'احساس برتری' کو موضوع بناتے ہوئے فرماتے ہیں۔

جب بھی ہوا یہ خوف مرے دل میں جاگزیں
چھوٹا نہ میرے دوست سمجھ لیں مجھے کہیں
فوراً میں نے ایسی نکالی کوئی سبیل
احباب کو ملے مری عظمت کی اک دلیل

اکثر سخنوری کو سہارا بنا لیا
شاعر کی حیثیت سے فضیلت جتا دیا
کہتے ہیں سچ ہی فطرتِ انساں کے جوہری
احساس برتری بھی ہے احساس کمتری

ڈاکٹر اختر بستوی کے محبِ مکرم ابن صاحب نے ان کے پس از مرگ ایک مجموعہ کلام 'غزالاں تم تو واقف ہو' مرتب کر کے بستی سے شائع کروایا ہے۔

اختر بستوی صاحب شگفتہ نثار تھے۔ طنزیہ و مزاحیہ مضامین لکھا کرتے تھے۔ ان کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ 'ٹیڑھے نشانے' شائع ہو چکا ہے۔ انگریزی ڈرامہ سے اردو میں 'شہر سے دور' ان کی ترجمہ نگاری کا بین ثبوت ہے اور جب وہ یونیورسٹی کی ملازمت میں آئے تو انھوں نے نثر میں اپنے قلم کا لوہا منوایا۔ تالیف و تدوین اور تنقید و تحقیق کے میدان میں خامہ فرسائی کی 'سخن جو ہر' بڑی عرق ریزی سے پر مغز مقدمہ کے ساتھ مرتب کیا۔ قاضی عدیل عباسی صاحب پر مونو گراف لکھا۔ مختلف موضوعات پر متعدد مضامین لکھے طنزیہ اور مزاحیہ ادب سے انھیں خاصا شغف تھا۔ وہ اس ادب کے نشیب و فراز، فن و تکنیک سے بخوبی واقف تھے۔ عالمی ادب پر ان کی گہری نظر تھی۔ وہ اپنی عمیق بصیرت کے پیش نظر طنز و مزاح کی فنی باریکیوں کی تفہیم و تعریف اس طرح کرتے ہیں:

''مزاح کا ایک قریبی ساتھی بھی ہے جسے طنز کہتے ہیں۔ طنز و مزاح میں کچھ اس قسم کا تعلق ہے جیسا کہ طالب علم اور کلاس روم میں ہوتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ کلاس روم کے بغیر بھی طالب علم ہو سکتے ہیں اور یہ بھی درست ہے کہ طنز کے بغیر بھی مزاح ممکن ہے لیکن جس طرح تعلیم کے ماہرین کلاس روم کی افادیت سے انکار نہیں کر سکتے اسی طرح اچھے مزاح نگار طنز کے قائل ہوتے ہیں۔ احمد جمال پاشا بنیادی طور پر مزاح نگار ہیں لیکن وہ طنز کے استعمال سے بخوبی واقف ہیں۔''

(نیا دور، یاد رفتگاں نمبر، 1988، ص نمبر 197)

اختر صاحب، احمد جمال پاشا کی شگفتہ تحریروں کے شیدائی تھے اور انھیں ان سے بے پناہ انسیت تھی۔ ان کے فکر اسلوب اور کمالات کا اعتراف انھوں نے بڑے دل نشیں انداز میں کیا ہے:

''جس طرح بعض بادل یکا یک افق کے کسی گوشے سے سر ابھارتے ہیں اور پلک جھپکتے میں سارے آسمان پر چھا جاتے ہیں اسی طرح اہل قلم بھی اچانک دنیائے ادب میں نمودار ہوتے ہیں لیکن دیکھتے ہی دیکھتے معروف ہو جاتے ہیں۔ اردو کے ناقابل فراموش مزاح نگار احمد جمال پاشا کا شمار ایسے ہی قلم کاروں میں کیا جا سکتا ہے۔ وہ انتہائی چونکانے والے انداز میں رسائل کے صفحات پر ابھرے اور پھر کچھ ایسی جادو کی چھڑی گھمائی کہ چند ہی سال میں ان کی شہرت کے ڈنکے بجنے لگے۔ اس اعتبار سے پاشا کو طنز و مزاح کی مملکت کا جولیس سیزر کہا جا سکتا ہے۔ جس نے دعویٰ کیا تھا۔ میں آیا، میں نے دیکھا، میں نے فتح کر لیا۔ (نیا دور، یاد رفتگاں نمبر، 1988، ص نمبر 194)

پڑھنا لکھنا اختر صاحب کا اوڑھنا بچھونا اور مقصد حیات تھا۔ انھوں نے اپنے ارد گرد پڑھنے لکھنے کا خوش گوار ما حول بنا رکھا تھا۔ گورکھپور آنے کے بعد انھیں اردو کی خدمت کا سنہرا موقع ملا اس سے ان کی تخلیقی صلاحیت کو مزید تقویت ملی۔

اختر صاحب کا تحقیقی مقالہ سیکولرزم اور اردو شاعری بھی منظر عام پر آ چکا ہے۔ اس کے علاوہ رسائل اور جرائد میں تحقیقی و تنقیدی مضامین اتنے شائع ہو چکے ہیں کہ ان کا ایک ضخیم مجموعہ شائع کیا جا سکتا ہے۔ اہل علم کا خیال ہے کہ ان کی اصل دولت ان کے شاگرد ہوتے ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ استاد اپنے شاگرد سے پہچانے جاتے ہیں اس ضمن میں اختر صاحب کا اقبال بلند تھا۔ وہ ہر دل عزیز استاذ تھے ان کے کامیاب شاگردوں کی ایک لمبی فہرست ہے جن میں ڈاکٹر، انجینئر، آئی اے ایس، پی سی ایس افسران، سیاستداں، شاعر، ادیب، معلم، تاجر، کلرک وغیرہ سبھی تو ہیں۔ انھوں نے درس و تدریس کو ایک مقدس پیشہ سمجھا اور تعلیم کے میدان میں ایک دیانت دار استاد کا کردار ادا کیا۔ اپنی قابلیت، محنت، ذہانت اور علمیت کی بنا پر وہ جس زمین پر رہے آسماں بن کر رہے۔ اختر صاحب کا کلاس بارونق اور باحیات ہوا کرتا تھا۔ وہ تفہیم و تشریح بڑے مدلل انداز میں کرتے اور ہمیشہ طلبا کی کردار سازی اور ذہنی بیداری پر زور دیتے تھے۔ وہ علامہ اقبال کے اس شعر کا درس اکثر دیتے۔

بے محنت پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شرر تیشہ سے ہے خانہ فرہاد

وہ اپنے شاگردوں سے بے پناہ شفقت کرتے تھے اور شاگرد بھی ان کا از حد احترام کرتے۔ وہ کلاس میں کسی بھی موضوع پر برجستہ بولنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ تحریر و تقریر میں انھیں یکساں قدرت حاصل تھی۔ ان کی گل افشانی گفتار اتنی پر کشش ہوتی کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی۔ بے شک قدرت نے انھیں لسانی طلاقت و حلاوت بخشی تھی۔ ان کی خرد افروز اور فکر انگیز گفتار سے وسیع المطالعہ کا انداز ہوتا تھا۔ یونیورسٹیوں میں اساتذہ کا تحقیقی کام ایک اہم فریضہ ہے اس میدان میں طلبا کی ترغیب و تشویق بھی اہم ہے۔ اس امر میں وہی اساتذہ عہدہ برآ ہو سکتے ہیں جنھوں نے بحر علم کی شناوری اور دشت علم کی سیاحی میں عمر گزاری ہو۔ بے شک ان کے تبحر علمی سے ریسرچ اسکالروں نے استفادہ کیا ہے۔ ان کی نگرانی میں متعدد کامیاب مقالے لکھے گئے جن میں زیادہ تر شائع ہوئے اور انھیں پسندیدہ نظروں سے دیکھا گیا ہے۔ ان کی نگرانی میں تحقیقی مقالہ لکھنے والوں میں ڈاکٹر شفیق اعظمی، ڈاکٹر درخشاں تاجور، ڈاکٹر خورشید عالم، ڈاکٹر محمد اشرف، ڈاکٹر سیما فاروقی، ڈاکٹر بشریٰ بانو، ڈاکٹر فوزیہ بانو، ڈاکٹر زیبا محمود اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے نام قابل ذکر ہیں۔ وہ ریسرچ اسکالروں سے خوب محنت کرواتے اور خود بھی محنت کرتے۔ ریسرچ اسکالر کو اپنے سامنے بٹھا کر ان کے مقالے لفظ بالفظ اور جملہ بہ جملہ دیکھتے۔ تحریر کے رموز و نکات سمجھاتے۔ اس سے اسکالر کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا۔ ان کی خدمت کا شرف جنھیں حاصل ہوا وہ باکمال ہو گئے اور لکھنے پڑھنے کا ذوق و شوق بیدار ہوا۔ آج بھی ان کے شاگردوں کی تحریروں میں روانی ہے۔ ڈاکٹر شفیق اعظمی کا شمار دور حاضر کے معتبر شاعروں اور نقادوں میں ہوتا ہے۔ ان کا شعری مجموعہ اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ منظر عام پر آ چکا ہے۔ اس وقت بھی ان کا قلم رواں اور دواں ہے۔ انھوں نے اپنے ریسرچ اسکالروں کو از حد متاثر کیا ہے۔ تشویق و تحریر کا حوصلہ بخشا۔ آج بھی وہ حوصلہ مندی ان طالب علموں میں برقرار ہے۔ ڈاکٹر درخشاں تاجور اردو ادب کی بیش بہا خدمات انجام دے رہی ہیں اور آزادی میں اردو شاعری کی خدمات کو منظر عام پر لا رہی ہیں۔ یہ آپ کی تربیت کا ثمرہ ہے کہ ڈاکٹر اشرف گورکھپوری، ڈاکٹر ذاکر حسین اور ڈاکٹر زیبا محمود جیسے قلم کار ان اپنے قلم کا جوہر دکھا رہے اور ناموس اردو کی پاسداری کر رہے ہیں۔

پڑھنا لکھنا اختر صاحب کا اوڑھنا بچھونا اور مقصد حیات تھا۔ انھوں نے اپنے ارد گرد پڑھنے لکھنے کا خوش گوار ما حول بنا رکھا تھا۔ گورکھپور آنے کے بعد انھیں اردو کی خدمت کا سنہرا موقع ملا اس سے ان کی تخلیقی صلاحیت

کو مزید تقویت ملی۔ گورکھپور شہر کی ادبی فضا نے انھیں اور نکھارا... جوہر صاحب کا تحت، بندوق کی دکان، اشتراک کا دفتر، قاضی پور خورد کی گلفشاں بلڈنگ، حکیم ابوالکلام کا مطب اور نامور پروفیسر حضرات کی رہائش گاہیں تھیں جہاں ادبی گفتگو اور محاربہ آرائی بھی ہوتی تھی۔ یہ ادبی فضا چشمک کی سہی مگر ان ادبی سرگرمیوں سے مثبت افعال بھی وقوع پذیر ہوئے۔ مشاعروں، مباحثوں، تحریروں اور تقریروں میں سرگرمی آئی۔ روز نامہ اور ہفتہ وار اخبار کا اجرا عمل میں آیا گویا اس شہر کے شعرا و ادبا کو مشق و مہارت کا موقع میسر آیا۔ اختر صاحب گورکھپور کی ادبی ہنگامہ آرائیوں سے بظاہر بیگانہ تھے مگر بہ باطن اس سے متاثر تھے اور متاثر بھی کرتے تھے۔ اس سے اختر صاحب کی تحریروں اور تقریروں میں مزید روانی اور جولانی آئی۔ بین الاقوامی سطح پر شعرا اساتذہ سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ جہاں سے بھی اردو کے رسائل و جرائد نکلتے ان کے مدیروں سے براہ راست تعلق رکھتے۔ اردو کا کوئی رسالہ اور جریدہ خواہ وہ سرکاری یا غیر سرکاری، معیاری یا غیر معیاری ہو۔ ان کی دست رس سے باہر نہیں تھے۔ وہ ان رسالوں کے خریدار ہوتے۔ ان کے لیے اپنے کلام و مضامین بھیجتے۔ انھوں نے اپنی تنخواہ کا کچھ حصہ کتب و رسائل اور خط و کتابت کے لیے مختص کر رکھا تھا۔ وہ بے شمار خط لکھتے دراصل خط کا جواب لکھنا وہ اپنا اخلاقی فریضہ سمجھتے تھے۔ اس معاملے میں وہ خورد و کلاں میں امتیاز نہیں برتتے تھے۔ روزانہ کثیر تعداد میں ان کے پاس خطوط و رسائل آتے تھے۔ جس دن ڈاک کم ہوتی تو اس دن وہ ملول خاطر نظر آتے۔ ایسے رسائل جن میں ان کے کلام یا مضمون شائع ہوتے اسے دیکھ کر وہ باغ باغ ہو جاتے۔ مشاعروں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروگراموں کی مبالغہ آمیز روداد سے سامعین کو متحیر کرتے اور وہ اختر صاحب کی خوبیٔ قسمت پر ناز کرتے۔ انھیں اخبار کی سرخیوں میں رہنے کی تہہ دار خواہشیں رہتیں۔ حیرت تو اس وقت ہوئی جب ان پر دل کا دورہ پڑا اور وہ ہاسپٹلائیزڈ ہوئے، صبح کے وقت انھیں کچھ افاقہ ہوا تو تیمارداروں سے دریافت کیا کہ کتنے اخباروں میں میری بیماری کی خبر شائع ہوئی ہے؟ قرب و جوار کے مشاعروں سے لے کر خلیجی مشاعروں میں شرکت کرتے۔ وہ نظامت کرتے اور اپنا کلام بھی بڑے مؤثر انداز میں پڑھتے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے بھی ان کی وابستگی تھی۔ غرضیکہ اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج میں اہم کردار ادا کر رہے تھے۔ اختر صاحب کی شخصیت اردو تہذیب و تمدن کی آئینہ دار تھی۔ اودھ کی تہذیب کا ان پر گہرا اثر تھا۔ نفاست اور سلیقہ ان کی فطرت میں شامل تھا۔ جمالیات ان کی شخصیت کا خاصہ تھی۔ ان میں نسائی جمالیات کی حسرتی کیفیت بدرجۂ اتم تھی۔ وہ اپنے ڈرائنگ روم میں کسی نہ کسی فلمی دنیا کی خوبصورت تصویر آویزاں کرتے۔ وہ بے شمار اردو اور انگریزی کی میگزین منگواتے جس کے ٹائٹل کور پر نسائی تو بہ شکن تصویر ہوتی۔

ان کا وضع قطع، بود و باش، نشست و برخاست، گفت و شنید سب شاعرانہ تھا۔ بظاہر ان کی زندگی قلندرانہ تھی مگر وہ بھی انسان تھے۔ خواہشوں کا خواب ان کے یہاں بھی تھا۔ ان کی تعبیر کے لیے وہ لاٹری کا ٹکٹ تک خریدتے۔ وضع داری اور روا داری ان کی زندگی کا خاصہ تھی۔ ان کی زندگی شاعرانہ مبالغہ آرائی سے آراستہ تھی۔ اس کی عکاسی ان کی روزمرہ کی زندگی اور دیگر جہات کے ہر زاویے سے ہوتی تھی۔ وہ واقعات اور کیفیات پر مبالغے کی ملمع کاری کے عادی تھے۔ ان کی مبالغہ آرائی مضرت رساں نہیں ہوتی تھی۔ وہ فقط زیب داستاں کے لیے ہوتی تھی مگر بذات خود اختر صاحب کو اس رویے سے بہت نقصان پہنچا۔ اس سے ان کی زندگی معتدل نہیں رہ گئی تھی۔ انھوں نے یہی رویہ اپنی صحت اور زندگی کے ساتھ برتا۔ چھینک آنے پر وہ سرجن سے تفتیش کرتے مگر بڑی سے بڑی بیماری کو وہ یوں ہی نظر انداز کر دیتے تھے۔ دل کا دورہ پڑا ان کا کچھ نہیں بگڑا دل کے آپریشن کے بعد وہ خوش و خرم تھے لیکن ایک معمولی سی پھنسی ان کی موت کا سبب بن گئی اور 58 برس کی عمر میں 10 جون 1998 کو جبکہ وہ اپنی سبکدوشی کی منزل سے چند قدم کی دوری پر کھڑے تھے، رحلت فرما گئے۔ کچھ سال قبل ہی موت پر انھوں نے عمدہ نظم تخلیق کی تھی جس میں حیات سراب اور موت حقیقت بن کر ابھری ہے جس سے بشر کو مفر نہیں۔

زندگی کو ایک جوئے کی طرح کھیلا عمر بھر
اور کوئی بازی کسی منزل پہ بھی ہارا نہیں
داؤں جتنے بھی لگائے سب میں کچھ پاتا گیا
کیا ہوا کرتا ہے کھونا، یہ کبھی جانا نہیں
مل گیا آخر میں لیکن ایک ایسا بھی حریف
حیف جس سے ہار بیٹھا خود میں نے اپنا وجود
چال کچھ ایسی چلی اس نے کہ سب کچھ لٹ گیا
ہو گیا سارا اثاثہ ہست سے پل بھر میں بود

جب بھی کوئی اہل علم و ادب اختر صاحب کے حسن سلوک، پر وقار تخلیقی و تنقیدی تحاریر، دانشورانہ تقاریر، تدریسی کارگزاریوں جیسے زریں کارناموں کا محاکمہ کرے گا تو ان کی دل آویز ادبی شخصیت کا معترف ہو جائے گا۔ بے شک اردو ادب ان کی تخلیق سے معمور ہے۔ معتبر ناقد نسیم اعظمی نے اردو ادب میں ان کے مقام کا محاکمہ اس طرح کیا ہے:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ہشت پہلو شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک اچھے خطیب، عمدہ نثر نگار اور کامیاب مترجم کی حیثیت سے پورے ہندستان میں جانے پہچانے جاتے ہیں لیکن ان کی فکری و فنی صلاحیتیں زیادہ تر شعری تخلیقات ہی کی طرف مائل تھیں اور اس سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ موصوف کے چار شعری مجموعہ کلام ہیں۔''

(ماہنامہ، گلابی کرن، اختر بستوی نمبر، ص 63، جولائی 1999)

اختر صاحب کے سانحۂ ارتحال پر نامور ناظم مشاعرہ عمر قریشی صاحب نے مرحوم کی ذات، صفات اور کمالات کو یاد کر کے یوں گریہ کناں ہیں۔

دانشوری و علم کا دفتر کہیں جسے
ایک روشن کو ماہ منور کہیں جسے
سینے میں علم و فن کے گہر ہائے تابدار
افکار نو بہ نو کا سمندر کہیں جسے
شعر و سخن کی دنیا میں ایک نام سر بلند
اہل قلم، ادیب و سخنور کہیں جسے
خوشیوں کی اک حیات جسے لے گئی قضا
اختر کی موت، مرگ گل تر کہیں جسے

Dr. Ghulam Husain
Head, Dept. of Urdu
Govt. Madho College
Ujjain - 456001 (MP)
Mob.:09893853183

عظیم راہی

قمر اقبال

قرض مٹی کا چکانے کے لیے زندہ ہوں

یادش بخیر! بات 1977 کی ہے جب میں گورنمنٹ کالج اورنگ آباد میں پی یو سی سائنس کا طالب علم تھا۔ اس وقت میں بڈی لین میں رہا کرتا تھا۔ پڑھنے لکھنے کا شوق تو بچپن سے ہی تھا۔ چھٹی جماعت میں اسکول کے نصاب میں شامل نظموں کے خلاصے لکھے۔ میٹرک تک پہنچتے پہنچتے مختلف موضوعات' جو اسکول میں اساتذہ دیا کرتے تھے اُن مضامین کے لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ کالج میں داخل ہونے پر باقاعدہ افسانہ نگاری کا آغاز ہوا۔ ان دنوں عزیز خسرو (مرحوم) کے برادر خورد عبدالحمید میرے خاص دوست اور کلاس فیلو تھے۔ ہماری دوستی بہت گہری تھی۔ اکثر حمید کے ساتھ بڈی لین میں واقع دفتر 'اورنگ آباد ٹائمز' جانے کا اتفاق ہوتا اور پھر حمید کے گھر، جو اس وقت اپسرا کینٹن کے عقب میں سول ہاسپٹل کے احاطے میں واقع تھا وہاں ہماری بیٹھک رہا کرتی تھی۔ ایک دن حمید نے قمر اقبال مرحوم سے میرا تعارف کروایا۔ انتہائی خوبرو، صحت مند اور بڑی متاثر کن شخصیت کو میں بس دیکھتا رہ گیا اور پھر ان کی بے حد نرم و ملائم لہجے میں گفتگو کے سحر میں کھو گیا۔ حمید نے بعد میں انھیں بتایا کہ 'میرے یہ دوست ہیں اور محمد عظیم الدین راہی کے نام سے افسانہ لکھتے ہیں۔' یہ سن کر وہ بہت خوش ہوئے۔ بڑے تپاک سے ملے اور نہایت گرمجوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے، خواہش ظاہر کی کہ میں اپنے افسانے اشاعت کی غرض سے اورنگ آباد ٹائمز میں دیا کروں۔ پھر کیا تھا اندھا کیا مانگے اور کیا چاہے۔ اورنگ آباد ٹائمز میں میرے افسانوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

پہلا افسانہ 'نفرت کا جنم' کے عنوان سے 22 جنوری 1978 کی اشاعت میں ادبی صفحہ 'رفتارِ ادب' میں بڑے اہتمام سے شائع ہوا اور یہیں سے قمر اقبال کی شفقتوں کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ اب تو تقریباً روزانہ حمید کے ساتھ میری ان سے ملاقات ہوتی۔ وہ مجھے مفید مشوروں سے نوازتے، صحیح رہنمائی کرتے اور مناسب حوصلہ افزائی کرتے رہتے، جس کے نتیجے میں میرے لکھنے پڑھنے کے شوق کو جلا ملی۔ اس ادبی ماحول نے میرے ذوق و شوق کو صحیح سمت اور رفتار عطا کی اور میں خوب لکھنے لگا اور پھر یوں ہوا کہ ہر ہفتے میرے افسانے، تو کبھی منی افسانے ادبی صفحہ 'رفتارِ ادب' کی زینت بنتے گئے، جس سے کچھ لوگوں کو شکایتیں بھی ہوئیں۔ لیکن قمر اقبال بدستور مجھے اسی اہتمام سے مسلسل چھاپتے رہے اور یوں مجھے ان سے قریب آنے کا موقع ملا۔ ان کی شاعری سے بھی دلچسپی پیدا ہوئی۔ شاعری سے دلچسپی پر یاد آیا کہ شروع شروع میں' مَیں خود بھی شعر اور نظمیں کہتا تھا۔ ایک بار میں نے جمشید پور کے فساد کے پس منظر میں لکھی اپنی نظم سنائی ؎

شہر فولاد اب پگھلتا ہے — خون انسان کا بن کر آب
اب وہاں یوں بہتا ہے — جیسے ساری چیزیں سستی ہو
بس ایک لہو ہی انسان کا سستا ہے — شہر فولاد اب پگھلتا ہے

نظم سن کر تعریف تو کی لیکن مشورہ دیا کہ ''شاعری کے چکر میں مت پڑو، نثر ہی تمہارے لیے بہتر ہے۔'' قمر اقبال کے ہم عصر شاعر رؤف انجم کے لفظوں میں ''بات میں وزن ہو تو اسے پیش کرنے کے لیے' کسی اور وزن کی ضرورت نہیں'' لہٰذا قمر اقبال کے مشورے میں مجھے وزن نظر آیا اور میں پابند شاعری سے باز آ گیا۔ یوں ان کی مناسب رہنمائی اور حوصلہ افزائی سے اپنے ادبی سفر پر آگے بڑھنے لگا۔

1980 کے بعد ان کے توسط سے دفتر 'اورنگ آباد ٹائمز' میں دیگر ادیبوں اور شاعروں سے ملاقات کے مواقع حاصل ہوئے، جن میں نورالحسنین، عارف خورشید، قاضی رئیس اور وحید کلیم کے ساتھ فاروق شمیم (جو اس وقت دفتر میں بطور خوشنویس برسرِ کار تھے) شامل تھے۔ اور یوں اچھا خاصا ادبی ماحول میسر آ گیا جو مجھ جیسے مبتدی کے لیے کسی سائبان سے کم نہ تھا۔ ان سینئر اور ادبی دوستوں کے علاوہ بھی قمر اقبال سے ملنے دیگر ادیب و شاعر وہاں آتے تو حمید کے توسط سے ان سے بھی ملاقات ہو جاتی۔ 1982 میں سرکاری ملازمت اختیار کرنے کے بعد وہاں جانا میرا معمول بن گیا۔ اپنی پہلی شفٹ

کی ڈیوٹی پوری ہونے کے بعد دفتر 'اورنگ آباد ٹائمز' کی نچلی منزل پر حمید کی 'ٹائمز ٹریڈرس' کی دکان میری بیٹھک بن گئی۔ اکثر سہ پہر میں جب وہاں پہنچتا قمر اقبال دفتر سے نکلنے کی تیاری میں رہتے۔ بڑے تپاک اور محبت سے ملتے۔ ادھر اُدھر کی باتیں ہوتیں اور وہ کچھ بتائے بغیر اپنے شغل کی طرف روانہ ہو جاتے۔ لیکن انھوں نے مجھے کبھی اس بات کا احساس نہیں ہونے دیا۔ یہ ان کے مزاج کی بڑی اعلیٰ ظرفی تھی۔

قمر اقبال نہایت وجیہہ، صحت مند پٹھان تھے۔ لیکن گفتگو اس قدر نرم لہجے میں کرتے کہ سامنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا اور ہر وقت زیر لب مسکراہٹ رہتی۔ میں نے انھیں ہمیشہ مسکراتے دیکھا اور غصے میں کبھی نہیں دیکھا ہاں! کبھی کبھار اگر کسی بات پر غصہ آ بھی جاتا تو سرخ و سپید چہرہ اس قدر سرخ ہو جاتا کہ انھیں اس حالت میں دیکھ کر پھر کسی میں آنکھ ملانے کی ہمت نہیں ہوتی اور ان کی خاموشی ہی غصے کا جواز بن جاتی۔ لیکن ایسا بہت کم ہوتا۔ ویسے بھی وہ بہت کم بات کرنے کے عادی تھے۔ زیادہ تر مسکراہٹ سے کام چلاتے اور تفصیل میں جانے کے بجائے پوری بات اختصار میں کہنے کا انھیں ملکہ حاصل تھا۔ اکثر میں چائے کا اصرار کرتا تو کبھی کبھار پاشا بھائی کے ہوٹل میں جو اس وقت دفتر سے بہت قریب تھا آ جاتے۔ چائے پیتے اور فوری دفتر کی سمت نکل پڑتے اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتے۔ 'اداریہ'، 'بات سے بات' اور 'ہزل' لکھنا ان کے معمول میں شامل تھا۔ اس کے علاوہ کچھ اہم خبروں کا تجزیہ وغیرہ بھی لکھتے کیوں کہ اس اخبار کے اندرونی صفحات کی ترتیب ان ہی کے ذمے تھی۔ جب ادبی احباب کے ساتھ روز بروز میرا ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ اکثر مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی تو پھر کوئی نہ کوئی موضوع ان کے ہاتھ آ جاتا جو ان کے ٹیبل ورک کے اہم کام میں بیحد کام آتا۔ یعنی فوراً اس موضوع پر ہزل ہو جاتی۔ ہفتے میں اکثر دو ایک بار کسی نہ کسی احباب پر یا پھر مجھ پر ہزل ہو جاتی یا پھر ہزل کے کسی شعر پر لطیف انداز میں میری طرف اشارہ ہو جاتا۔ اکثر احباب ان کو میرے بارے میں کوئی بات کہہ دیتے یا کوئی نکتہ اور Hint دے دیتے، ان کو تحریک مل جاتی اور فوراً ہزل نازل ہو جاتی۔ میں کبھی جز بز ہوتا تو کبھی خوش ہو جاتا کہ چلو قمر صاحب کی ہزل کا موضوع یعنی روئے سخن آج میری طرف ہے۔ انھوں نے اس طرح مجھ پر کئی ہزلیں کہیں جو ان کی محبتوں کا بین ثبوت ہے۔ ویسے اکثر احباب کو وہ اپنی ہزلوں کا موضوع بناتے لیکن اس معاملے میں وہ مجھ پر کچھ زیادہ مہربان تھے۔

اس بات پر ایسا ہی ایک واقعہ اس وقت مجھے یاد آ رہا ہے کہ میری پہلی کتاب کی کتابت عزیز کاتب کے ذریعے عارف خورشید کی نگرانی میں ہوئی تھی، اس کتاب کی چھپائی کے بعد چند کاپیاں ان کے گھر پر رکھی ہوئی تھی، اس وقت عارف خورشید کا مکان کٹ کٹ گیٹ کے قریب تھا اور 1985 سے میری رہائش بھی روشن گیٹ کے علاقے میں ہو گئی تھی۔ ان دنوں، ان کی بکریوں کی تجارت خوب چل رہی تھی۔ اتفاق سے ایک بکری نے میری اس کتاب کو شاید روٹی سمجھ کر منہ لگایا اور سونگھ کر چھوڑ دیا۔ عارف خورشید نے یہ منظر دیکھا اور یہ بات قمر اقبال کو بتائی اور کیا کہا مجھے پتہ نہیں۔ دوسرے ہی دن اورنگ آباد ٹائمز میں 'بکری اور کتاب' کے عنوان سے ایک عمدہ ہزل شامل تھی۔ قمر اقبال کی ہزلوں کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنی ہزلوں کے عنوان دیا کرتے تھے۔ جس سے پڑھنے والوں کا اشتیاق اور بڑھ جاتا تھا۔ اُن کی ہزلوں کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اکثر لوگ اسی وجہ سے اخبار خرید کر پڑھتے تھے۔ اس طرح نئے نئے موضوعات انھیں احباب سے ملا کرتے تھے اور یوں خوب ہزلیں ہو جایا کرتی تھی جو ان کے دفتری کام کا اہم حصہ بھی تھا۔

قمر اقبال ہمیشہ ہی نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے' ان کی مناسب رہنمائی کرتے، مفید مشوروں سے نوازتے، ساتھ ہی پکی سیاہی میں نام چھپوانے کے بجائے مطالعہ اور محنت پر توجہ دلاتے، لکھنے کی مشق اور شاعری میں مسلسل ریاض کرنے کی تلقین کرتے اور یوں حوصلہ بڑھاتے رہتے۔ اس بات سے سب واقف ہیں کہ علم و ادب کے گہوارہ اور شاعری کے شہر اورنگ آباد نے کئی قابل ذکر شاعر پیدا کیے لیکن قمر اقبال کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے خود کئی شاعر پیدا کیے۔ میری مراد، اپنے حسن سلوک اور مخلصانہ رویے کے سبب انھوں نے اپنے شاگردوں کی ایک اچھی خاصی ٹیم تیار کر دی اور شاعری کا بڑا سازگار ماحول پیدا کیا تھا۔ اس وقت کے نئی نسل کے کئی ابھرتے شاعروں میں موجود صلاحیتوں کی پہچان اور ان کے اندر چھپے امکانات کو روشن کرنے میں بھی انھوں نے ایک اہم رول ادا کیا' اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میری پہلی پسند رہی ہے۔ جتنے شعر مجھے قمر اقبال کے آج یاد ہیں شاید اتنے کسی اور شاعر کے نہیں ہیں۔ حالانکہ یہ میری کمزوری رہی ہے کہ اکثر اشعار مجھے پوری صحت کے ساتھ یاد نہیں رہتے ہیں۔ اس سلسلے کی ایک خاص بات یہ بھی قابل ذکر لگتی ہے کہ قمر صاحب نے کسی نجی محفل میں مجھے اپنے شعر نہیں سنائے۔ نہ ہی کبھی ایسا اتفاق ہوا اور مشاعروں میں بھی وہ کبھی کبھار ہی شریک ہوتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے شعروں کو گنگنانے کی میری عادت شاید ان سے میری قربت اور ایک جذباتی لگاؤ اور بے پناہ محبتوں کا نتیجہ ہے کہ ان کی شاعری ہمیشہ میرے مطالعے میں رہی اور میرے ذہن میں گونجتی رہی۔ 'موم کا شہر' اور 'تتلیاں' کا اکثر آموختہ ہو جاتا ہے۔ ان کے ایسے چند اشعار جو مجھے ازبر ہیں پیش کر رہا ہوں۔ ملاحظہ کیجیے۔

اس نے کچھ پہلے ہواؤں کو ہدایت دی ہے
شمع کی پھر انھیں ہاتھوں میں امانت دی ہے

گھروں میں آ سکیں مکتب سے بچے
کم از کم شہر میں تب تک امان رکھ

لمس اس ہاتھ کا بچوں کی ہنسی ماں کی دعا
یہ جو تحفے ہیں فقط گھر سے ملا کرتے ہیں

مر گیا زہر کا وہ اک ہی پیالہ پی کر
ہم کو اک دن نہ ملے زہر تو زندہ نہ رہیں

ملے وہ شخص تو کیوں آج ہم کو پہچانے
کہ کل کے ساتھ ہی رشتے تمام کل کے گئے

مانا جھلس گئیں مرے ہاتھوں کی انگلیاں
آندھی کی زد سے میں نے دیا تو بچا لیا

راکھ ہونے پر بھی شعلوں کی دعا کی ہم نے
آگ دیکھی جو کہیں دل میں چھپا لی ہم نے

خوشبو کو ہوا راز میں رکھتی نہیں لیکن
اکثر ترے آنے کی خبر تک نہیں ہوتی

خودکشی چپکے سے کرنے نہیں دیتے مجھ کو
چند چہرے ہیں جو مرنے نہیں دیتے مجھ کو

لوگ جینے کے غرض مند بہت ہیں لیکن
میں مسیحا کو بچانے کے لیے زندہ ہوں

اک بات جو کتاب مقدس میں درج ہے
آثار سب وہی ہیں قیامت کو کیا ہوا

چند ثلاثیاں دیکھیے۔

تھے عجب کرب و اضطراب میں ہم
خود کو لفظوں میں منتقل کر کے
سو گئے چین سے کتاب میں ہم

یاد ہے وہ فساد کا منظر
رو رہی تھی گلی میں اک بچی
اپنی گڑیا کو گود میں لے کر

وہ پڑوسی جو ملک ہوتے ہیں
ان کے بچھڑے ہوئے سبھی رشتے
سرحدوں سے لپٹ کے روتے ہیں

رہ کے خاموش خود کو سمجھا لے
غم کسی کو بھی حادثے کا نہیں
سب ہیں تفصیل پوچھنے والے

قمر اقبال کی شاعری پڑھ کر آپ یقیناً لطف اندوز ہوئے ہوں گے۔ اُن کے پاس ایسے اشعار بھی بہت ہیں جو زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ چلیے شاعری سے پھر اُن کی ہمہ جہت شخصیت کی سمت آگے بڑھتے ہیں۔

اورنگ آباد ٹائمز کے دفتر روزانہ جانے آنے سے اور نیچے کے حصے میں حمید کی ٹائمز ٹریڈرس کی دکان میں بیٹھک کے سبب دفتر کے پورے اسٹاف سے قریب ہو گیا تھا۔ عزیز بھائی بھی مجھے اپنے چھوٹے بھائی کی طرح ہی عزیز رکھتے تھے اور کبھی بڑی محبت سے پیش آتے تھے اور ان سب سے ایک رشتہ سا بن گیا تھا اور رفتہ رفتہ جیسے میں بھی دفتر کا ایک فرد بن گیا تھا۔ ایک عرصے تک اکثر ملنے جلنے والے یہی سمجھتے تھے کہ میں بھی وہیں کام کرتا ہوں۔ ان سب کی انسیت اور اپنائیت نے مجھے وہاں کا اسیر بنا دیا تھا جہاں قمر اقبال کی وجہ سے ایک اچھا خاصا ادبی گروپ ان کے اردگرد رہتا تھا۔ انھوں نے اپنے حُسنِ سلوک سے اس حلقے کو اور وسیع بنا دیا تھا۔

جب میرے افسانے اور دیگر تخلیقات بڑی تعداد میں اور تواتر سے چھپنے لگیں تو کچھ یار لوگوں نے اسے تعلقات کا شاخسانہ قرار دیا اور کچھ احباب نے یہ بھی کہا کہ مقامی اخبار میں مسلسل چھپتے رہنا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ تم کنویں کے مینڈک بن کر رہ جاؤ گے۔ اس بات کا مجھ پر اتنا اثر ہوا کہ پھر میں نے دیگر شہروں کے بڑے اخبارات کو افسانے بھجوانے شروع کیے۔ اورنگ آباد ٹائمز کے ایکس چینج میں جو اخبارات دفتر آیا کرتے تھے ان میں میرے افسانے چھپنے لگے۔ اس کی اطلاع قمر صاحب بڑے خوش ہو کر دیتے اور وہاں جانے پر اخبار میرے سامنے رکھ دیتے۔ اس طرح انھوں نے میرا حوصلہ مزید بڑھایا اب میں نے رسائل و جرائد کو افسانے، منی افسانے بھیجنا شروع کر دیا۔ (یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اسی دور میں جوگندر پال نے منی افسانے کو افسانچہ کا خوبصورت اور خالص اردو نام عطا کیا اور پھر منی افسانہ افسانچہ کے نام سے موسوم ہو کر عالمگیر شہرت کا حامل ہوا۔) جس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور مناسب پذیرائی کے ساتھ مزید حوصلہ بلند ہوا اور میں کمرشیل سرکاری پرچوں اور پھر خالص ادبی رسالوں میں بھی چھپنے لگا۔ (جن میں آج کل، ایوان اردو، شاعر، بیسویں صدی، استعارہ وغیرہ بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔) اس سلسلے میں اورنگ آباد ٹائمز اور قمر اقبال میرے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی سبب میرا ادبی حلقہ بھی وسیع تر ہوتا گیا اور ادبی احباب کے ساتھ غیر شعوری طور پر مسابقتی دور شروع ہوا، جس نے میرے لکھنے پڑھنے کے شوق کو جنون دیا۔ میری محنت رنگ لائی۔ میری مقبولیت میں اضافہ ہوتا ہو گیا اور مقامی حد سے میں ملکی سطح پر اپنی پہچان بنانے میں کامیاب ہوا۔ شدت سے لکھنے اور کثرت سے چھپنے کے سبب میرے دو مجموعے ایک افسانوں کا دوسرا منی افسانوں کا تیار ہو گیا اور 1986 میں منی افسانوں کا پہلا مجموعہ 'پھول کے آنسو' کے نام سے ترتیب دیا جو 1987 میں مالیگاؤں سے چھپ کر منظرِ عام پر آیا۔ جس کی رسم رونمائی ممتاز افسانہ نگار قاضی مشتاق احمد کے ہاتھوں انجام پائی اور مہمانِ خصوصی کے طور پر قاضی سلیم شریک محفل تھے۔ اس تقریب میں نورالحسنین نے میرا خاکہ اڑایا' یعنی خاکہ پڑھ کر سنایا۔ جسے بے حد داد ملی اور خاکے کا یہ جملہ بطور خاص کہیں نہ کہیں آج بھی کوڈ ہوتا رہتا ہے کہ ''جس عمر میں نوجوان شادی کر کے دلہن لاتے ہیں عظیم راہی کتاب چھپوا کر لائے ہیں۔'' اس پر کسی منچلے نے یہ بھی کہا کہ نکاح تو ایک قاضی پڑھاتا ہے مگر یہاں دو دو قاضی صاحبان موجود ہیں۔ شاید کتاب کی رونمائی اور نکاح کے ایجاب و قبول میں یہی فرق ہوتا ہو۔ یہ تقریب رسم اجرا 17 اکتوبر 1987 کو انجام پائی تھی۔ اس دن قمر اقبال نے 'رفتارِ ادب' کا پورا ایک صفحہ میرے لیے مختص کر دیا تھا۔ جس میں قاضی مشتاق احمد اور نذیر فتح پوری کے مضامین کے علاوہ قمر اقبال کا مختصر مگر جامع ادارتی نوعیت کا محبتوں سے لبریز مضمون ''خدا ترے جنوں کا سلسلہ دراز کرے'' کے عنوان سے شامل تھا۔ اس طرح میرا پہلا گوشہ میرے لکھنے کے ابتدائی دور میں قمر اقبال نے شائع کر کے میری بے حد حوصلہ افزائی کی اور بذاتِ خود تقریب میں شرکت کے لیے نوکھنڈہ محل وقت مقررہ پر تشریف لائے جہاں یہ پروگرام منعقد تھا۔ لیکن پروگرام شروع ہونے میں تاخیر ہو گئی تھی تو احباب کے پاس یہ میسج رکھ دیا تھا کہ ''عظیم سے کہنا کہ میں مبارکباد دینے آیا تھا۔'' یہ ان کی اعلیٰ ظرفی اور ایک بڑے فنکار کے بڑے پن کی دلیل ہے۔ جو اب دیکھنے نہیں ملتی۔ یہ بات مجھے تا عمر یاد رہے گی کہ بڑا فنکار کیسا ہوتا ہے۔ یونان کے عظیم مفکر ہومر کے قول کے مطابق 'اچھا انسان ہی اچھا فنکار ہوتا ہے' اور اس قول پر قمر اقبال کی شخصیت، باوجود چند بشری تقاضوں اور فطری کمزوریوں کے پوری اترتی ہے۔

ان کی محبتوں کے کئی سلسلے اس وقت مجھے یاد آ رہے ہیں لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ کس بات کا ذکر کروں اور کس محبت کا تذکرہ کروں اور وہ کون سی بات کہوں اور سناؤں کہ جس سے سرپرستی کی چھاؤں کا احساس میرے لیے اور سوا ہو جائے۔ میرے والد کے انتقال کے وقت بھی انھوں نے بڑا دلاسہ دیا تھا اور ایک بزرگ کی حیثیت سے اس موقع پر بڑی تسلی دے کر میری ہمت بندھائی تھی۔ زندگی کے تئیں ذمے داریوں کا احساس دلایا تھا۔ مالیگاؤں سے اورنگ آباد ٹائمز کے تحت 'شامنامہ' کے اجرا کے موقع پر بھی بڑی محبتوں سے نوازا تھا۔ حالانکہ یہاں ان کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ پہلی بار یہاں وہ دل کے مریض بنے تھے۔ لیکن بڑے ہمت والے آدمی تھے۔ واپسی پر ایسے ہشاش بشاش لوٹے کہ پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ بیمار بھی ہوئے تھے اور سفر کی پوری روداد طویل ہزلیہ نظم کی شکل میں دوسرے دن اخبار میں نمایاں طور پر شائع ہوئی تھی، جس میں انھوں نے قاضی سلیم کے قافیے پر راہی عظیم کو ملا کر ایک بار پھر اپنی محبتوں کا ثبوت دیا تھا۔ گو کہ یہ شعر ہزلیہ تھے لیکن ان کے اندرون محبتوں کا خزینہ تھا۔ قربتوں کا وسیلہ تھا اور خلوص کا نذرانہ تھا۔ میں وقتی طور پر ناراض ہو کر اس بات پر خوش بھی ہوا تھا۔ اور ایک بار پھر یار دوستوں میں، میں موضوع بھی بنا تھا اور شاید اسی لیے کسی نے کہا کہ 'عظیم راہی کو مقبولیت بہت ملی ہے۔' لیکن یار لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ مقبولیت کی قیمت بھی بہت چکانی پڑتی ہے اور اس مقبولیت میں میری محنتوں اور جذبۂ جنوں کے ساتھ قمر اقبال جیسے کئی سینئر دوستوں کی ڈھیر ساری محبتیں اور بزرگوں کی دعائیں بھی شامل حال رہی ہیں۔

قمر اقبال کی زندگی میں کئی نشیب و فراز آئے۔ کھنڈوہ میں قیام کے دوران وہاں ان کی شاعری کا عروج، مشاعروں کی سرگرمیاں اور پھر ان کی ملازمت کا سلسلہ شروع ہوا۔ ناندیڑ میں ایک عرصے تک سکونت رہی اور پھر ملازمت کی قید و بند کو چھوڑ کر اپنی آزاد طبیعت کے باعث آزادی کی زندگی گزار کر اپنے شہر خجستہ بنیاد اورنگ آباد آ گئے اور یہاں آ کر اورنگ آباد ٹائمز میں کام شروع کیا اور یوں ان کا صحافت سے رشتہ جڑ گیا جہاں آخر تک اس روزنامہ سے جڑے رہے۔ صحافت کی ذمے داریوں کی وجہ سے ان کی تخلیقی سرگرمیوں میں کمی بیشی بھی آتی رہی لیکن انھوں نے صحافت کے رشتے سے جڑ کر شاعری اور علم و ادب کے سلسلے کو برقرار رکھنے میں بڑی کامیابی حاصل کی کہ صحافت تو اچھے اچھے فنکاروں کی تخلیقی صلاحیتوں کو کھا جاتی ہے۔ شاید اسی لیے وہ اپنے قمر اقبال

بننے کے بارے میں کہتے ہیں کہ

اپنے ہی نگر کی گلیوں میں جب غیروں جیسا حال ہوا
اقبال محمد خان سے کوئی اک روز قمر اقبال ہوا

دراصل اپنوں سے غیروں جیسا سلوک، رشتوں کی سرد مہری اور سماج کی بے مروتی نے انھیں یہ کہنے پر مجبور کیا اور طبیعت کی حساسیت نے انھیں فنکار بنا دیا۔ بقول ڈاکٹر ارتکاز افضل: ''متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے ہر فرد کی طرح قمر اقبال کے ذاتی حالات اور سماجی مسائل کو ان کی تخلیقی حسیت کی تہذیب میں بڑا دخل ہے۔ ان کی شاعری کی جڑیں کسی مجرد یا بے معنی لفظی نظام سے نہیں پھوٹتیں یا یہ محض ایک لفظی گورکھ دھندا نہیں بلکہ زندگی کے دل گداز اور ٹھوس تجربات کا نچوڑ ہے۔'' (موم کا شہر، ص6) غزل میں انھوں نے اپنا رنگ پیدا کرنے، اپنے فن کے لہو میں کئی سورج اتارے اور غزل کو ایک نیا لہجہ دے کر ادب کو نئی زندگی دی۔ دیکھیے۔

اتارے ہیں لہو میں کتنے سورج غزل کا رنگ تب آیا غزل میں
غزل کو اک نیا لہجہ دیا ہے غزل نے مجھ کو لیکن کیا دیا ہے

لیکن ادب نے انھیں کیا دیا ہے اس کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

مردہ ادب کو دی ہے نئی زندگی قمر بیمار خود پڑے تو دوا کو ترس گئے

لیکن اس کرب کے باوجود وہ قلم کی اہمیت اور اُس کی حرمت کو خوب سمجھتے تھے۔ شاید اسی لیے کہا کہ

دنیا تھی ایک طرف تو قلم دوسری طرف میں نے بڑھا کے ہاتھ قلم کو اٹھا لیا

اس طرح قمر اقبال جو ہمہ گیر شہرت کے حامل شاعر تھے۔ غزل میں ان کا لہجہ رومانی ہونے کے ساتھ زندگی کے تمام تر تجربوں کو سمیٹ کر ان سے جڑ کر جس عمدگی سے انھوں نے ان موضوعات کو اپنی شاعری میں جس سلیقے سے برتا وہ ان ہی کا حصہ رہا ہے۔ غزلیں ہو یا ثلاثی، یہاں تک کہ ہزلوں میں بھی ان کا اپنا ایک الگ انداز تھا جو پڑھنے والے کو متاثر کرتا ہے جو ان کی انفرادیت ہے۔ اُن کی شخصیت کی تمکنت کو اُن کی شاعری میں بھی دیکھا جاسکتا ہے جو شاید اُن کو اپنے محبوب سے ملا تھا۔

ملا تھا وہ قمر کو تمکنت سے اسی انداز سے آیا غزل میں

لہٰذا ان کی غزلیہ شاعری جس قدر متاثر کن ہے اسی قدر اُن کی ہزلیہ شاعری بھی قاری کو متوجہ کرتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان کی شاعری زندگی کے تجربوں سے مزین اور عصری حسیت سے معمور ہے۔ میرے نزدیک سچی شاعری کی یہی پہچان ہے۔ بشر نواز کے لفظوں میں ''قمر اقبال کا لہجہ نرم رواں اور متوازن ہے اور یہ ان کے سچے شاعر ہونے کی دلیل ہے کہ انھوں نے کسی مروجہ فیشن کی ریس میں اسے تبدیل نہیں کیا اور اپنی بات کہنے کا سلیقہ بھی تثلیثات ہوں یا نظمیں، غزلیں سبھی میں قمر اقبال کا لہجہ پہچانا جاسکتا ہے اور یہ بات کئی شعرا کو برسوں کے ریاض کے بعد بھی نصیب نہیں ہوتی۔'' (ص16)

قاضی سلیم نے ان کی شاعری میں موجود عصری حسیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:

''قمر اقبال وقت کی ریزہ ریزہ پھسلتی ریت کو ایک لمحے کے لیے سہی اپنی مٹھی میں تھام کر دکھا سکتا ہے، لوگو! یہ تمہارے عصر کی سچائی ہے، کل تم اسے پہچان بھی نہ پاؤ گے۔ اس لیے یہ نقش جو میری فکر و نظر کے عدسوں نے ریکارڈ کیا ہے اسے پڑھو، یہ تم کو اپنی پہچان میں ممد و مددگار رہوں گے۔'' (تتلیاں) ان تمام خوبیوں کے سبب اُن کی شاعری آج بھی ویسی ہی تازہ لگتی ہے جب انھوں نے اپنی شعری کائنات آباد کی تھی یہ شاعری اب بھی پڑھنے والوں کے دلوں پر راج کرتی ہے اور ان کی کمی کا احساس دلاتی رہتی ہے۔ شاید اسی لیے کبھی انھوں نے کہا تھا۔

قمر اقبال ان کی محبتوں اور نوازشوں کے کئی سلسلے جو 'ان کی یاد کے بادل بن کر ایک عرصے سے میرے ذہن و دل کے آسمان پر چھائے ہوئے ہیں ، مگر جذبات کی آندھی میں چاہتے ہوئے بھی میں ان سے نکل نہیں پایا ہوں۔اس دنیائے فانی سے انہیں اچانک رخصت ہوئے تقریباً تین دہائیاں بیت گئی ہیں لیکن آج بھی ان کی یادیں دل و دماغ پر اسی طرح چھائی ہوئی ہیں کہ میں محبتوں کے ان حصاروں سے نکلنے کی کوششوں میں مزید اُن میں گھرتا جاتا ہوں۔

نام پر رونے والے ہماری قمر ہیں ابھی چند احباب اس شہر میں

لیکن اس تخلیقی سفر کی تفصیل میں کسی اور وقت کے لیے اٹھائے رکھتا ہوں کہ فی الحال میرا موضوع ان سے میری وہ ملاقاتیں، قربتیں وہ باتیں اور محبتیں ہیں اور اسی بے پناہ جذباتی لگاؤ اور قربتوں کے سبب، میں ایک طویل عرصے سے ان پر قلم اٹھانے سے قاصر رہا ہوں۔ حالانکہ قربتوں کے اس رشتے اور رفاقتوں کے سلسلے کا عرصہ صرف ایک دہائی پر مشتمل ہے یعنی 1978 سے 1988 تک، جبکہ ان کی جدائی کو آج تقریباً 30/برس ہو چکے ہیں لیکن ان کی یاد آج بھی میرے دل میں اسی طرح برقرار ہے۔ محبتوں کا جذبہ ویسے ہی موجزن ہے اور ان کی موت کا غم پہلے دن کی طرح تازہ ہے کہ رحلت سے ایک روز قبل میرا افسانہ 'کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے' شائع ہوا تھا۔ دوسرے دن کی اشاعت میں ان کے مستقل کالم 'بات سے بات' میں انھوں نے بڑا اچھا کمینٹ کیا تھا وہ محبت میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ لیکن وہ جملہ اب مجھے یاد نہیں رہا۔ مختصر یوں کہ قمر اقبال میرے ادبی سفر میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

قمر اقبال ان کی محبتوں اور نوازشوں کے کئی سلسلے جو 'ان کی یاد کے بادل بن کر ایک عرصے سے میرے ذہن و دل کے آسمان پر چھائے ہوئے ہیں، مگر جذبات کی آندھی میں چاہتے ہوئے بھی میں ان سے نکل نہیں پایا ہوں۔ اس دنیائے فانی سے انھیں اچانک رخصت ہوئے تقریباً تین دہائیاں بیت گئی ہیں لیکن آج بھی ان کی یادیں دل و دماغ پر اسی طرح چھائی ہوئی ہیں کہ میں محبتوں کے ان حصاروں سے نکلنے کی کوششوں میں مزید اُن میں گھرتا جاتا ہوں۔ آج بڑی ہمت سے، اپنے ان آدھے ادھورے خیالات کو کسی طرح یکجا کرنے کی اپنی سی سعی کی ہے کہ اب بھی میرے ذہن کے نہاں خانوں میں ان کی وہ ساری باتیں اسی طرح محفوظ اور تروتازہ ہیں۔ ان کی یاد آتے ہی دل میں اب بھی ایک کسک سی اٹھتی ہے۔ کاش، ان کی زندگی کچھ اور طویل ہوجاتی تو آج دنیائے ادب کے افق پر قمر کی چمک دمک کچھ الگ ہی ہوتی اور قمر اقبال کی شاعری کا روشن قمر کچھ الگ ہی انداز میں تابناک ہوتا، روشنیاں پھیلاتا اور ضیا پاشیاں کرتا۔ لیکن یہ روشنی بھی کیا کم ہے کہ ہم تمام اہل ادب آج تک انھیں یاد کرتے ہیں اور تاعمر یاد کرتے رہیں گے کہ وہ ہماری یادوں میں ہمیشہ زندہ و تابندہ رہیں گے۔

بقول خود قمر اقبال۔

خود کی خاطر نہ زمانے کے لیے زندہ ہوں
قرض مٹی کا چکانے کے لیے زندہ ہوں

■

Dr. Azeem Rahi
Karim Colony
Roshangate
Aurangabad-431001

اردو ادب و صحافت کے امام
افتخار امام صدیقی

شمع اختر کاظمی

ماضی سے عہد حاضر تک اردو کے بے شمار ادبی و نیم ادبی رسائل و جرائد شائع ہوئے لیکن تجزیہ نگاروں اور علم و ادب کے پارکھیوں نے پہلے آگرہ اور پھر ممبئی سے نکلنے والا رسالہ ماہنامہ 'شاعر' کو ادبی رسالوں کا سرتاج ہی نہیں قافلۂ سالار کہا۔ 'شاعر' کو یہ افتخار حاصل ہے کہ ہر دور میں اسے ممتاز و مقتدر اہل قلم کا تعاون حاصل رہا، بلکہ اردو ادب کے قابل قدر قلم کاروں نے اپنی تخلیقات کے شاعر میں شائع ہونے پر فخر محسوس کیا۔

شاعر کے تاحال ایڈیٹر افتخار امام احمد صدیقی 16 ستمبر 1947 کو آگرہ میں پیدا ہوئے اور طویل علالت کے بعد 4 اپریل 2021 کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ وہ ایک ایسے گھرانے کے چشم و چراغ تھے جو نہ صرف شعر و ادب کا شیدائی بلکہ شعرا و ادبا کا قدر دان، منکسر المزاج، مہمان نواز اور انتہائی مہذب بھی ہے۔ اپنے والد محترم اعجاز صدیقی کی رحلت کے بعد تاجدار احتشام صدیقی کے ایما پر رسالہ شاعر کی باگ ڈور افتخار امام صدیقی نے سنبھالی۔ غالباً یہ مارچ 1978 کا زمانہ تھا۔ ادبی رسالے کے مسائل اور اس کا کرب ان پر ظاہر تھا پھر بھی اپنے اسلاف کی ادبی وراثت کو زندہ رکھنے کی خاطر بہت ساری قربانیاں دیں۔ شاعر جیسے تاریخ ساز رسالے کو ایک تاریخی تسلسل سے ہم کنار رکھا۔ خرابی صحت کے باوجود اردو زبان کے کسی رسالے یا مجلے کی طویل مدتی اشاعت، ادبی صحافت کے چیلنج میدان میں لالہ و گل کھلانے کے مترادف ہے۔

ایک متحرک و متنوع شخصیت کا نام افتخار امام صدیقی تھا جن کی ذات بہت سارے اوصاف کی جامع خوبیوں کی حامل تھی۔ صحافتی، علمی، ادبی ہر میدان میں ایک انفرادی مقام رکھتے تھے۔ باکمال شاعر و صحافی ہی نہیں باوصف انسان بھی تھے۔ جن کا ذہن و قلم ہمہ دم تر و تازہ رہا۔ وہ اپنی فطری ذہانت کے ساتھ اپنے چاہنے والوں پر خلوص پسند مشوروں کے لعل و گہر لٹاتے۔ 'شاعری' ادب و صحافت کی روشنائی سے انسانیت کی راہ اجالنے والے افتخار امام جنھیں رب العالمین نے کمال خوبیوں سے نوازا تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی برسوں کنج تنہائی میں گزار دی، جس گھر میں شعور کی آنکھیں کھولی وہاں ہر طرف شعر و سخن کے چرچے تھے، شعرا و ادبا کی آمد و رفت تھی، ادبی محفلوں کی دھوم اور طبیعت میں خداداد شعری صلاحیت تھی، یہی وجہ ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ممبئی اور پھر عالمی مشاعرے کے ایک مقبول ترین غزل گو شاعروں کی صف میں شمار کیے جانے لگے۔ ان کے کلام میں غیر صالح خیالات و جذبات کا کہیں گذر نہیں۔ قربان جایئے کہ بڑھتی ہوئی عمر اور نقاہت کے باوجود تخلیقی قوتوں میں کوئی فرق پڑا نہ یادداشت میں بلکہ حافظہ غضب کا رہا۔ شاعری ذاتی تجربات و ذہنی کیفیات کی دین رہی وہ عالمگیر سطح پر عام انسانوں کے مسائل اور مقتدر جماعت کے کارناموں سے بھی واقف تھے۔

ایسا نہ ہو کہ خواب ہی ہو جائے آدمی
آبادیوں میں پھیلتے جنگل کو روکیے

جب افکار کے دریچے کھلتے تو لفظیات کی تلاش اور جملوں کے دروبست انھیں حیران نہیں کرتے۔ نئے اچھوتے لفظ اور جملے خلق کرتے۔ ایسی ایک دنیا ان کے سوچ کینوس میں آباد تھی اس کا بھلا مشاہدہ رسالہ شاعر کے ہر شمارے میں کیا جا سکتا ہے۔ کسی فنکار، انشا پرداز کی شخصیت و کردار اور اس کے کارناموں کا اختصار نویسی کے ساتھ لفظوں کی جادو بیانی سے ایسا مرقع تراشتے کہ قلم کار پردۂ خفا سے کاغذ پر اتر آتا۔ محسوس یہ ہوتا گویا چند جملوں میں تخلیق کار کو اس کی فنی خوبیوں اور کارناموں کے حوالے سے قاری کے روبرو کر دیا گیا ہو۔ ایسی تحریری تصویر کشی سے ان کے باریک بین، گوہر شناس اور بصیرت افروز نقد و نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔

افتخار امام صدیقی کی طبیعت میں کمال بے نیازی کا عنصر تھا۔ تمکین و تمکنت کے جذبے سے نہاں علم و انکساری بھی دامن گیر تھی لیکن مزاج میں نہ خودسری اور نہ درشتی تھی وہ پرخلوص، مشفقانہ احترام کے جذبے سے نہال تھے۔ کرب تھا تو برسوں کی بے کراں تنہائی کا، وہ ہمیشہ رجائیت پسند رہے۔ ہزار ہا کرب آزار و تنہائی کے نئے چراغوں کی باتی بڑھاتے، ان کے ظاہر و باطن میں کوئی فرق نہ تھا۔ نیک طینت، شریف النفس، خوش فکری اور نرم خوئی ان کے کردار و افکار کو اونچا بناتی تھی۔ کبھی کبھی گفتگو کے دوران خاموشی کا لمحہ طویل ہو جاتا یہ بیماری کا تقاضہ تھا یا فطرت کا خاصہ، پتہ نہیں۔ یہ فرض کفایہ مانی بھائی (ناظر نعمان صدیقی) ادا کرتے۔ ایک محفل پسند شاعر کی ایسی اتھاہ خاموشی میں پنہاں صبر ان کے کرب کو سمجھنے پر دلالت کرتا ہے۔ وہ علم و ادب کے سفیر تھے۔ اپنا کرب اپنے سینے میں سمیٹے ادب کے قاری کو ادب فہمی اور ادب نوازی کے ہزار ہا طریقے بتاتے رہے۔ زندگی میں ماندگی کے کئی موڑ آئے مگر مثبت انداز فکر اور حوصلے سے سب کا رخ موڑ دیا۔ حادثے انھیں آزماتے رہے اور عارضے اپنا شکار بناتے رہے۔ یہاں تک کہ بصارت اور سماعت تھک گئیں۔ مطالعے کی خاطر بلوری شیشے کا سہارا لیتے، جسم کی ہڈیاں خستہ جاں ہو چکی تھیں۔ ہمہ وقت بھائی مانی سائے کی طرح ساتھ رہتے۔ بقول مانی بھائی۔ ''ہم تو اب زرد پتے ہیں کب جھڑ جائیں پتہ نہیں، مگر یا اللہ مجھے افتخار کے بعد اٹھانا میرے بعد ان کا کیا ہوگا...؟ یہ ایک بھائی کی اپنے بھائی کے لیے ایسی دردمندی کہ جس میں محبت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر پنہاں تھا۔ اپنا گھر بار، بیوی بچے، کہیں آنا جانا وہ سب کچھ بھائی افتخار کی دیکھ ریکھ پر قربان کر بیٹھے تھے۔

افتخار امام صدیقی نے اپنی معذوری کو ہمیشہ مثبت انداز میں قبول کیا۔ کبھی شکوہ سنج نہ رہے۔ برسوں گوشہ نشینی کا کرب جھیلا پھر بھی انسان دوستی کا فریضہ ادا کیا۔ ٹرین حادثے میں زخمی ہوئے اور پھر لگاتار کوئی نہ کوئی افتاد انھیں آزماتی رہی۔ دو دہائیوں سے زائد عرصہ وہ صاحب فراش رہے۔ پے در پے عارضے کا حملہ مگر واللہ کیا ذات

رب پر توکل کامل، ہمہ وقت ان کا دماغ منصوبے ترتیب دیتا، جدت پسندی شاعر کے ہر شمارے میں دیکھی جاسکتی تھی۔ ادبی اختراع اور یادداشت کی درستگی پر سخت حیرت کہ اس لاغر و ناتواں جسم کا دماغ اتنا توانا... آخر یہ ناتواں جسم کس قدر بوجھ برداشت کرتا، حافظہ اور حوصلہ جسم و جاں سے مطابقت بھی نہیں رکھتے تھے۔ اپنے ایک شعر میں انھوں نے درست ہی کہا۔

کون ہے کس کی دعاؤں کی چھاؤں میں
چل رہی ہے سانس تلواروں کے بیچ

مرحوم کی حمد و نعت، سلام و منقبت جیسی تقدیسی شاعری اپنی پوری تابانی کے ساتھ دین فطرت سے مستعار نظر آتی ہے۔ حتی کہ نظموں اور غزلوں میں بھی ان کے پاکیزہ خیالات، معاشرے و سماج کی فکرمندی، انسانیت و اقدار کے زوال کا درد اور فطرت کا عکس ان میں نظر آتا ہے۔ انھوں نے امریکہ، کینیڈا، لندن، پاکستان اور خلیجی ممالک کے مشاعروں میں شرکت کی۔ ان کے دو شعری مجموعے 'چاند غزل' اور 'یہ شاعری نہیں ہے' زیر ترتیب تھے۔ حمد اور نعت کی بھی دو کتابیں ترتیب دے چکے تھے۔ افتخار صاحب کی غزلوں کو اپنی آواز سے سجانے والوں میں چترا سنگھ، جگجیت سنگھ، چندن داس، پنکج اداس اور سدھا ملہوترا ہیں۔

مستقل علالت اور کمزوری کے باوجود وہ بستر ہی سے ماہنامہ شاعر کی ادارتی ذمے داری کو ادا کر رہے تھے۔ شاعر کے متعدد خصوصی شمارے شائع ہوئے جس نے ادبی رسالوں میں اپنی منفرد پہچان بنائی۔ اردو کی نئی بستیوں کے قلم کاروں کو متعارف کرانے میں اہم رول ادا کیا۔ زندگی کے آخری ایام تک تقریباً سو قلم کاروں سے تحریری انٹرویو لیے، باصلاحیت خواتین کی ادب کی راہ تک رہنمائی کی اور شاعر کے صفحات ان کے اعتراف ذات میں پیش کیے۔ شاعر ان کی ادارت میں مارچ 1978 سے تا حال بلا ناغہ اسی آن بان اور شان سے جاری ہے جس طرح ان کے والد مرحوم اعجاز صدیقی اور دادا سیماب اکبرآبادی نے جاری رکھا تھا۔ رسالہ شاعر کا طرۂ امتیاز یہ بھی ہے کہ اس میں خالص ادبی و لسانی مواد کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔ ادبی نظریات، ترجیحات و تبادلۂ خیال ترسیل کا ذریعہ بنتے ہیں جو اپنے عہد کے لسانی رجحانات اور افکار و مزاج کا عکاس ہوتے ہیں۔

شاعر کے ایک قدیم شمارے میں کائنات، آدمی، نظریہ اور زندگی کے عنوان سے تحریر کردہ اداریے اس بات کی توثیق کرتے ہیں کہ نثر نگاری کے فن میں بھی انہیں مہارت حاصل تھی۔ ایک خود ساختہ مشن کے ذریعے نئے قلم کاروں کو دعوت فکر دیتے رہے ہیں۔ شاعر کے اداریے میں وہ لکھتے ہیں۔

''سوال یہ ہے کہ کیا نظریے کے بغیر ادب تخلیق نہیں ہوسکتا...؟ سوال یہ بھی ہے کہ نظریے کے بغیر زندگی بسر کی جاسکتی ہے کہ نہیں...؟ مگر میں فکرمند ہوں نئی نسل کے لیے جو ترقی پسندی یا جدیدیت کے الجھاؤ میں پڑے بغیر ادب تخلیق کرنا چاہتی ہے یا ادب تخلیق کر رہی ہے۔ دراصل نظریہ یا رجحان جو بھی کہہ لیں، اس نے قلم کار اور قاری دونوں ہی کا مزاج خراب کر دیا ہے۔ ترقی پسندوں نے اپنا ادب اور جدیدیوں نے اپنا ادب دونوں ہی نے انتہا پسندی کی بھی انتہا کر دی۔ نظریہ مذہبی ہو یا مادی، نظریہ ساز بھول جاتے ہیں کہ ان کے اختیار میں کچھ بھی نہیں۔ نا ابتدا کی خبر ہے نا انتہا معلوم سانسوں کا شور اور اپنے ہونے کا تھوڑا بہت ادراک اور اپنے آس پاس کو ٹھیک ٹھاک رکھنے کی خواہش اور خواہش کی تعمیر، ارتقا پذیر دنیا میں کوئی بھی آئیڈیالوجی بہت دور تک نہیں جاتی، اپنا اچھا برا کردار ادا کرتی ہے، یا تو ختم ہوجاتی ہے یا پھر شکل بدل لیتی ہے۔ شب و روز کے تسلسل میں چلتے پھرتے آدمی کی بنیادی جبلتیں مر تو نہیں گئیں۔ ایک دوسرے سے خوفزدہ آدمی سرحدوں سے باہر کب آیا ہے...؟ ہاں اتنا شائستہ ضرور ہوگیا ہے کہ بہت پہلے پتھروں سے اپنا دفاع کرتا تھا۔ بیسویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے اس نے جدید مہلک ہتھیار بنا لیے ہیں۔ آدمی کے بنیادی مسائل اپنی جگہ ہیں اور اس کی ساری تگ و دو اسی کے لیے ہیں۔ کوئی پل کوئی لمحہ ایسا نہیں جس نے آدمی کو اپنی بنیادی ضرورتوں سے بے نیاز کر دیا ہو۔ طاقت، اقتدار اور تحفظ کسی بھی نظریے کا تصور اور نفاذ ان کے بغیر ممکن نہیں۔ نظریوں کی تاریخ تو یہی بتاتی ہے کسی بھی نظریے کے اچھے برے اثرات تو مرتب ہوتے ہیں، کسی عالمی سماج کی تشکیل و تعمیر کا خواب دیکھنے کی عملی صورتوں میں اختلاف بھی شامل ہوتا رہتا ہے۔ یہ ایک فطری عمل ہے۔ اس کی نفسیاتی و جمالیاتی سطحیں بھی اپنا دفاع کرتی رہتی ہیں۔

اردو میں نقاد و دانشور یہ تو بتا رہے ہیں کہ عالمی سطح پر جدید فکری صورت حال کیا ہے۔ سیاسی، سماجی، علمی اور ادبی سطح پر نظریوں کو اب کس طرح دیکھا جا رہا ہے۔ وہ باخبر تو ہیں اور بضد بھی کہ جو اطلاعات وہ فراہم کر رہے ہیں انہیں تسلیم کیا جائے۔ لیکن چونکہ ان کا اپنا کوئی فکری نظام نہیں ہے۔ لہٰذا نئی نسل یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ اسے اب بھی ترقی پسند نظریے کے تحت اپنا ادب تخلیق کرنا ہے یا پھر جدیدیت یا مابعد جدیدیت کے رجحان کو اپناتے ہوئے اپنا تخلیقی نظام قائم کرنا ہے۔ مگر ایک تیسری صورتحال بھی ابھر رہی ہے۔ (تیسری دنیا نہیں) اور وہ یہ کہ بغیر کسی نظریاتی وابستگی کے آزادانہ طور پر ادب تخلیق کیا جائے۔ تمام نظریوں کی کسی مشترک فکری اساس کے بغیر۔

تخلیقی ذہن، نظریوں کا پابند نہیں ہوتا، اگر وہ بڑا اور سچا فن کار ہے تو اپنا نظریہ خود پیش کرتا ہے۔ وہ نظریوں سے سچ کو اخذ کرتا ہے اور اسی کا آزادانہ اظہار کرتا ہے۔ خاموشی کو لفظ دیتا ہے، لفظوں میں اپنی آواز رکھتا اور یہ آواز سفر کرتی ہے۔ اس آواز کی روح جتنی توانا ہوگی، آواز باقی رہے گی، روشن رہے گی، عہد بہ عہد سفر کرے گی اور ہر عہد کو منور کرے گی۔

فن کار چاہے جس آئیڈیالوجی سے وابستہ ہو اسے سچ بولنا ہے' سچ لکھنا ہے وہ اپنے فکری رویوں سے فن پارے کو جیتا ہے اور اجتماعی آئیڈیالوجی کو سنوارتا ہے' نا کہ نظریے کا مبلغ بن جاتا ہے۔ اردو میں مبلغ و مقلد بہت ہوئے ہیں مگر جنوئن یا جینئس فنکاروں کی کمی رہی ہے۔ سچا فنکار قطعی آزاد مزاج ہوتا ہے وہ کہیں ٹھہرنا پسند نہیں کرتا کھلی آنکھوں اور کشادہ ذہن سے دیکھتا اور سوچتا ہے۔ اپنے آپ میں جذب کرتا رہتا ہے۔ ہم عصر اردو ادب میں فلسفۂ جمالیات اور تنقید کے دبستانوں کی اہمیت اپنی جگہ لیکن تخلیقی ذہن بہر حال ان دبستانوں میں قید نہیں ہوتا وہ ان میں رچ بس جاتا ہے اور پھر ان سے ابھر جاتا ہے۔ ساری کوششیں اسی کے لیے ہونی چاہئیں جو عموماً ہوتی نہیں ہیں۔ کیونکہ نئے قلم کاروں کو گمراہ کرنے والی تنقیدی تحریریں اپنا کام بھی کرتی رہتی ہیں۔ آج بھی یہی ہو رہا ہے۔

مگر نئے قلم کاروں کو نہ صرف یہ کہ اپنے عہد کو پوری طرح محسوس کرنا ہے بلکہ آنے والے زمانوں کی دھمک کو بھی سننے کی سعی پیہم کرنا ہے۔ نظریہ چاہے سیاسی ہو سماجی یا مذہبی، انتہا پسندی سے بچتے ہوئے اس سے استفادہ کرنے اور ادب و فنون میں اس کے مناسب نفوذ کا شعور پیدا کرنا چاہیے۔ میں مذہب کو برا نہیں سمجھتا مگر ان کے خلاف ہوں جو مذہب کی گفتگو کرنے والوں کو بنیاد پرست کہتے ہیں۔ نظریوں کی زندگی یا موت کی بحث میں مذہب زیر بحث آنا چاہیے مگر وہ مذہب نہیں جو سیاسی ہو۔''

افتخار امام صدیقی کی مقبولیت اور عظمت کا راز دراصل ان کی صلاحیتوں اور بے پایاں فکر و فن میں پوشیدہ ہے۔ گو کہ وہ ایک منفرد لب و لہجے کے جدت پسند شاعر تھے لیکن انھیں اداریہ نگاری میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ اردو میں اداریہ نگاری کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ یہ مشکل فن ایک بیدار متنوع ذہن چاہتا ہے۔ اداریے کے مطالعے سے حالات حاضرہ سے لے کر ادب، تاریخ، فلسفہ، طنز و مزاح سب کچھ صحافی کے قلم کی زد پر رہتا ہے اور جن کے پاس بے پناہ مدیرانہ صلاحیتیں، ادب و شاعری تینوں جوہر موجود ہوں تو ان کی زبان اور ذہن میں خلاقانہ شان پیدا

ہوجاتی ہے تب اداریہ دل و دماغ کی تربیت کا فریضہ ادا کرتا ہے، ادبی مسائل کی گرہ کشائی کرتا ہے ادب کے کھوکھلے پن کو اجاگر کرتا ہے اور ادب کی صالح اور دیرپا قدروں کے فروغ میں حصہ لیتا ہے۔ رسائل و جرائد کے اداریے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ کن قدروں کا پاس دار ہے۔ اس کا مزاج کیسا ہے۔ افتخار امام صدیقی کے اداریے ہمیشہ منفرد، نئے موضوعات و ادبی مسائل پر اپنا اشارتاً نہیں بلکہ واضح طور پر اپنا مدعا بیان کرتے، کسی خاص نظریے اور موضوع کے تحت تحریر کیے جانے والے اداریے عصری حسیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ انھوں نے مدیرانہ، مدبرانہ اور شاعرانہ زبان میں بسا اوقات حق اداریہ ادا کیا۔ مختصر اور جامع اداریے بھی تحریر کیے مگر اپنی اثر پذیری سے ایک جہاں کو متاثر کیا۔ ان کی تحریروں میں الفاظ اور جملے بھرتی کے نہیں ہوتے بلکہ ہر لفظ اور جملے سے معنی کا ایک جہاں ابھرتا تھا۔ ادب، جمالیات اور صحافت سے متعلق اپنا واضح نظریہ 'افتخار' رکھنے والے 'امام' نے ادب اور ادبی صحافت کی خدمت کو اپنا وظیفۂ حیات بنالیا تھا۔ رسالہ 'شاعر' کے اداریے کے ذریعے انھوں نے میدان ادب میں فرمانروائے فکر وفن کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔ اپنی بات کو نئی سوچ، نئے رنگ، نئے احساس، نئی زبان، نئی لفظیات اور نئے جملوں کے قالب میں ڈھال کر قاری کو نئی طرز تحریر سے آشنا ہی نہیں کیا بلکہ نئی اسلوبی راہیں بھی دریافت کیں۔ انھوں نے اعترافی ادب میں بھی اسی جدت طبع سے کام لیا۔ اداریہ نگاری ایسا بحر ژخار کہ اچھے اچھوں کو اس میں ڈوبتے دیکھا گیا۔ اس کی تھاہ پالینا سب کے بس کی بات نہیں۔

زبان ویسے بھی تغیر پذیر شئے ہے اور اردو زبان تو بہت سے چولے بدل کر ہم تک پہنچی ہے۔ یہ کسی کے ہاتھ کی کٹھ پتلی نہیں، یہ خود ساختہ زبان و زماں، ذہنوں ذہن سفر کرتی سوچ کو لفظ عطا کرتی، مزدور، کاریگر، صنعت کار، فنکار اور تخلیق کاروں کے الفاظ، سوچ فکر، خودداری اور خود اعتمادی کے ساتھ مسکرا کر سب کو اپنا محبوب بنا کر اور اپنا نیا روپ دکھا کر آگے بڑھ جاتی ہے۔ یہ سلسلہ صدیوں صدی سے جاری ہے۔ کچھ جگمگاتے، حیرت زدہ کرتے، سنہرے الفاظ کے جادو کی چھڑی اپنے دیوانوں کو سونپ کر کہیں اور نکل جاتی ہے۔ جدید لفظوں کی یہ شہزادی ہر دور میں آتی رہی ہے اور آئے گی۔

افتخار امام نے نصف صدی سے زائد عرصے تک کاروان ادب وصحافت کی سالاری کی، تہذیب وثقافت کے دیے روشن کیے ان کی واحد دلچسپی ادب، ادبیات اور ادبی صحافت سے تھی۔ محبت اور جاں نثاری کے جس شعبے سے وہ اٹھتے تھے وہ ان کی پسندیدہ اور تخلیق کردہ تھی۔ اخباری صحافت کی بنسبت ادبی صحافت کے مسائل بہت زیادہ ہیں۔ چونکہ ادبی رسائل سیاست دانوں کے بیان اور تقریر نہیں چھاپتے نہ تبصرے کرتے نہ تصویر شائع کرتے ہیں۔ وہ سیاسی پارٹیوں کے اتار چڑھاؤ اور ابن آدم کے خرید و فروخت کے دام تک نہیں بتاسکتے۔ کسی معجون اعظم، قرص مقوی کے اشتہار ہوں یا ضرورت رشتہ کا اشتہار وہ شائع نہیں کرتے۔ اپنی پوری توجہ، زبان وادب، لسانیات، ادبی مسائل، ادبی شخصیات، اجرا و وفات پر رکھتے ہیں۔ یہ ایسا جرم کہ جس کی وجہ سے ان کا حلقۂ اشاعت، تعداد اشاعت دونوں متاثر ومحدود ہوجاتا ہے۔ ساتھ ہی طباعت کے مصارف، اشاعت کی مشکلات، کاغذ کی فراہمی، سرکیولیشن کا مسئلہ مسلسل سر پر سوار رہتا ہے۔ وزیروں، سفیروں اور سیاست دانوں اور سرمایہ داروں کو ان سے کوئی نسبت بھی نہیں ہوتی۔ ان کی نظر کرم ایسے خشک رسالوں تک بھلا کیوں پڑے...؟ اس پر افتاد یہ کہ ادبی رسائل اپنے معیار و وقار کے دائرے میں محبوس اور زر آمد کے ذرائع مفقود۔ رسالے کا وقت پر شائع ہونا ہی بڑا مسئلہ ہوتا ہے۔ ایسے مسائل سے اکیلے شخص کا گزرنا پل صراط طے کرنے کے برابر ہوتا ہے جس کا اعتراف افتخار صاحب نے برجستہ اپنے اداریے میں بارہا کیا تھا۔ تمام اخراجات کا بار ان کے نوک قلم پر رکا ہوا تھا۔ ساتھ ہی زندگی کی ضروریات، مسائل اور شکم کے تقاضے بھی تھے۔ اپنی ذہانت اور جدوجہد سے رسالہ شاعر کو بلندی تک پہنچایا۔ ایک خوددار، آزردہ اور خلوت انجمن پسند انسان، صحافت کے کالے بازار میں معاش اور ادب کی خاطر یرقانیت کے کاروبار کا جھولا لٹکائے برسوں کھڑا رہا مگر اس کے ہاتھ اور کردار ہمیشہ اجلے رہے۔ وہ دنیا سے چلا گیا۔ اپنے پیچھے مال وزر نہیں عزت وافتخار چھوڑ گیا۔

ایک دین دار، متقی، پرہیزگار، نیک طینت انسان جن کی فطرت میں انکساری اور متحمل مزاجی رچی بسی تھی، شاعروں، ادیبوں اور تخلیقی فن کاروں کی قدر و منزلت کرنے والے افتخار امام جیسے محسن اردو کی غیر معمولی کوششوں کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ کسی کی موت کے بعد ان کے حوالے سے ہم سب بارہا باتیں کرتے ہیں۔ موت نے کیسے کیسے باغ و بہار شخص سے ہمیں محروم کردیا جن کا ہم احترام کرتے ہیں۔ ان کے لیے تعزیتی کالم لکھنا کتنا مشکل کام ہوتا ہے۔

شاعر خاندان نے جس طرح مصائب وافتاد کا سامنا کیا اور ثابت قدم رہے۔ نامساعد حالات کے باوجود ثابت قدمی کی بنیاد بیگم اعجاز صدیقی رہیں۔ محترمہ نسیم بانو اعجاز صدیقی دراصل حالات کے مارے اس خاندان کی سب سے بڑی طاقت وقوت تھیں۔ ماہنامہ شاعر اور شاعر خانوادے کو ایک برانڈ بنادیا۔ اس کی حرمت اور دائمیت کو قائم رکھنے میں محترمہ نسیم بانو اعجاز صدیقی کا کردار اہم ہی نہیں اساسی نوعیت کا حامل بھی ہے۔

افتخار امام صدیقی نے جس گھرانے میں آنکھیں کھولی، بچپن گزرا، وہاں خونی رشتوں کا ہی نہیں بغرض ملاقات آنے والوں کا بھی احترام کیا جاتا، ادبا وشعرا کا خیر مقدم ہوتا، آگرہ سے ممبئی تک ہر دور میں زبان وادب سے وابستہ خواتین بصد شوق ملاقات کو جاتیں تو خانوادۂ سیماب کی مستورات ان کی خوب پذیرائی اور خاطر مدارت کرتیں۔ ایک ملاقات کے دوران افتخار صاحب نے بتایا کہ

''ہمارے بچپن کے زمانے میں مہنگائی ایسی نہ تھی لوگ بڑے مخلص تھے۔ کوئی تخلیق کار خاتون ہمارے گھر ملنے آتیں تو گھر کی عورتیں انہیں گھیر لیتی، خوب خاطر ہوتی، ہماری دادی جان ان کی آمدورفت کے اخراجات اور جوڑے انہیں دیتیں، ہتھیلی پر کچھ نذرانے بڑے شوق سے رکھتیں اور پھر کسی قریبی رشتے سے وابستگی باندھ لیتیں اور ہمیشہ اسی رشتے سے ان کا ناطہ جڑ جاتا۔ یہ ہمارے ادبی خاندان کی تہذیبی روایت رہی ہے۔۔۔''

آج ایک خوش خلق اور مشفق شخصیت ہماری نگاہوں سے ہمیشہ کے لیے اوجھل ہوگئی۔ افتخار صاحب کی موت ایک بڑا ادبی خسارہ ہے۔ جس کا ازالہ تقریباً ناممکن ہے ان کی مقبولیت اور شہرت کو سرحدوں میں قید نہیں کیا جاسکتا۔ ماہنامہ شاعر جو عنقریب اپنی اشاعت کے سو سال مکمل کرلے گا۔ بلاشبہ افتخار امام صدیقی اردو کی ادبی صحافت کا افتخار تھے۔ افسوس کہ ادب کے اس ''امام'' کی آواز ہمیشہ کے لیے بے صدا ہوگئی۔

پتہ نہیں پہلے پہل میں نے انھیں بھائی کب کہا یا انھوں نے مجھے بہن کا درجہ دیا لیکن اس مقدس رشتے کا تمام حسن انہوں نے قائم رکھا۔ ہمیشہ میرے ساتھ ان کا برتاؤ ایک محترم بھائی کے خلوص کی صداقت کا مظہر رہا۔ وہ سراپا مہر و مروت رہے۔ اردو ادب وصحافت سے محبت اور رشتوں کی نگہبانی کرنے والے میرے محترم بھائی میں بڑی خوبیاں تھیں۔

درد کی ساری تہیں اور سارے گزرے حادثے
سب دھواں ہوجائے گا' ایک واقعہ رہ جائے گا

■

Shama Akhtar Kazmi
12/14, Sai Nagar,
Gaibi Nagar,
Bhiwandi - 421302 (M.S.)
Mob.: 9284690949

رئیس فاطمہ

ماسٹر رام چندر اور فوائد الناظرین

ماسٹر رام چندر کا نام دہلی کالج کی علمی و ادبی شخصیات میں ممتاز حیثیت کا حامل ہے۔ ان کی علمی و ادبی سرگرمیوں کی بدولت اردو ادب اور صحافت میں اتنے وقیع اضافے ہوئے جس کی مثال اس سے پہلے نہیں ملتی۔ ماسٹر رام چندر کا رجحان سائنس اور فلسفے میں تعلیم کے ابتدائی دور سے ہی تھا انھوں نے ریاضی میں معرکۃ الآرا کتابیں بھی تالیف کیں۔ کمپنی بہادر نے ان کی کتاب Maxima and Minima کے صلے میں خلعت پنج پارچہ اور دو ہزار روپیہ نقد انعام بھی دیا تھا اس کتاب کے علاوہ ان کی ایک اور کتاب کو جس میں Differential Calculus پر ان کا نظریہ بیان کیا گیا تھا انگلستان اور یورپ کے ممالک میں علما اور ماہرین کے درمیان بہت پذیرائی حاصل ہوئی۔

ماسٹر رام چندر نے جدید علوم وفنون کے فروغ کے لیے اس دور میں تنہا جو کام کیا وہ شاید کسی اور سے نہ ہوسکا۔ ان کے اخبارات، تراجم اور تالیفات اگر ایک طرف ان کے انفرادی ذوق وشوق کو ظاہر کرتے ہیں تو دوسری طرف ان کی تحریروں کی زیریں لہروں میں اس دور کی ذہنی اور فکری ہلچل صاف محسوس کی جاسکتی ہے۔ انھوں نے جس ماحول اور جس زمانے میں نشوونما پائی وہ معاشرتی اور سیاسی اعتبار سے ہندوستان کی تاریخ کا ایک بڑا اہم دور تھا۔ عالی شان مغلیہ سلطنت کا آخری وقت آچکا تھا۔ سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر انگریزوں کے وظیفہ خور ہوکر دہلی کے لال قلعے میں مقیم تھے۔ ہندوستانی سیاست کی زمین میں برطانوی سامراجیت کی جڑیں مضبوطی کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ جاگیرداری نظام شکست وریخت کے دور سے گذر رہا تھا۔ یوروپ کا صنعتی انقلاب ہندوستانی زندگی کے دوسرے تمام شعبوں کے ساتھ ساتھ یہاں کی معاشرت پر بھی اثر انداز ہورہا تھا اس انتشار سے بھرپور دور میں ماسٹر رام چندر ہندوستان کی ان چند ہستیوں میں سے تھے جو وقت کے اس تقاضے کو جان گئے تھے کہ اگر ہندوستانی نئی طاقتوں، نئے میلانات اور نئی قدروں کو پوری طرح اپنا نہ سکیں تو ان کی قومی زندگی کبھی ابھر نہ سکے گی۔ لہٰذا یہ ضروری تھا کہ مغربی علوم وفنون کی اشاعت عام کی جائے اس کے لیے انھوں نے جدید علوم وفنون کو اپنی زبان (اردو) اور اپنے انداز میں پیش کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی۔ انھیں اس بات کا پورا پورا احساس تھا کہ نئے نظریات کو سمجھنا اور نئی روش پر چل کر زندگی کی جاندار اور متحرک قدروں کو اپنانا نہ صرف وقت کا تقاضا ہے بلکہ ہندوستان کے روشن مستقبل کے لیے انتہائی ناگزیر بھی ہے۔

ماسٹر رام چندر نے اپنے ان مقاصد کے حصول کے لیے صحافت کو اپنا ہتھیار بنایا اور اس کے ذریعے سے ہندوستانی قوم کے ذہن اور فکر وشعور پر مثبت کاری ضرب لگانے کی جہد مسلسل کرتے رہے۔ محب ہند اور فوائد الناظرین کے ذریعے سماج کی علمی ترقی اور اخلاقی اصلاح کی جو کوششیں ماسٹر رام چندر نے کیں وہ لائق ستائش ہیں۔

فوائد الناظرین کے بارے میں کتابوں میں پڑھنے کے بعد مجھے اس موضوع پر لکھنے کا تجسس ہوا لیکن تلاش بسیار کے بعد بھی فوائد الناظرین کی فائلوں تک میری رسائی نہ ہوسکی غالباً فوائد الناظرین کی فائلیں اب موجود نہیں ہیں بقول سیدہ جعفر "یہ رسالے اب اتنے پرانے ہوچکے ہیں کہ جگہ جگہ سے چھپا پاڑ گیا ہے اور بوسیدگی کا یہ عالم ہے کہ ہاتھ آئیں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے۔" مجبوراً مختلف کتابوں کی مدد سے ہی میں نے اس مقالے کو تحریر کرنے کی کوشش کی ہے۔

بقول خواجہ احمد فاروقی:

"رام چندر کا 15 روزہ اخبار فوائد الناظرین 23 مارچ 1845 با اہتمام صاحبان مجمع فوائد العام کے مکان مولوی محمد باقر میں پنج پریس پنڈت موتی لعل پرنٹر و پبلشر دہلی اردو اخبار کے نکلنا شروع ہوا"[1]

فوائد الناظرین میں تاریخی، سماجی، تحقیقاتی اور اصلاحی مضامین ہوا کرتے تھے۔ ان مضامین کے ذریعے سے ماسٹر رام چندر اپنے ہم وطنوں کو علمی طور پر مستحکم کرنا چاہتے تھے۔ فوائد الناظرین جاری کرنے کا مقصد ہندوستانی عوام کی معلومات میں اضافہ کرنا' انھیں مختلف جدید علوم اور مغربی ادب سے روشناس کرانا تھا۔ یکم نومبر 1848 کے شمارے میں خود رام چندر نے اخبار کا مقصد واضح کرتے ہوئے لکھا ہے:

"پرچہ فوائد الناظرین واسطے ان اشخاص کے جاری کیا گیا ہے کہ جو واقفیت علوم وفنون سے نہیں رکھتے ہیں اور نہ ان کے لیے جنھوں نے مدرسے سرکاری میں یا کسی اور جائے علوم حکمیہ اور فنون مفیدہ سے واقفیت حاصل کی ہے پس اب لازم ہے کہ اس پرچے میں ایسے مضامین درج کیے جائیں جو ان ناواقف آدمیوں کی سمجھ میں آجائیں"[2]

رام چندر فوائد الناظرین کے ذریعے ان لوگوں سے مخاطب تھے جو پڑھے لکھے ہونے کے باوجود جدید فلسفہ اور علوم سے ناواقف تھے۔ انگریزی زبان اور مغربی علوم سے وہ بدگمان تھے۔ ماسٹر رام چندر کی کوشش تھی کہ فوائد الناظرین کے مضامین مفید ہونے کے ساتھ قابل فہم بھی ہوں۔ عبارت اور انداز بیان آسان اور سادہ ہو۔ ابتدا میں رام چندر کا یہ ارادہ تھا کہ فوائد الناظرین کو صرف طبعیات اور ریاضی کے لیے مخصوص کردیا جائے مگر کچھ دنوں بعد انھیں محسوس ہوا کہ قارئین کی دلچسپی اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بنانے کے لیے مختلف عنوانات پر مضامین شائع کرنے ضروری ہیں لہٰذا یکم نومبر 1846 کے شمارے میں لکھتے ہیں:

"واضح ہو کہ جب پرچہ فوائد الناظرین کا جاری ہوا تھا اس وقت اس احقر کی بھی یہی رائے تھی کہ سوائے طبعیات اور ریاضیات کے اور کوئی بات پرچہ مذکورہ میں نہ چھپے چنانچہ ایسا ہی مدت تک عمل میں آیا لیکن اس عرصے میں ہر طرف سے یہی فریاد سنی کہ مضامین پرچہ فوائد الناظرین کے کسی کی سمجھ میں نہیں آتے"[3]

8 فروری 1847 کے شمارے میں اس نتیجے پر پہنچے کہ فوائد الناظرین کے قارئین کو ہندوستان کی تاریخ سے بھی واقفیت بہم پہنچائی جائے:

''مجھے یہ بہت خوب معلوم ہوتا ہے کہ کچھ کچھ حال تواریخ ہندوستان کا اور بادشاہان سلف کا اپنے پرچے میں درج کیا کروں''[4]

قارئین کی دلچسپی کو ذہن میں رکھتے ہوئے بعد میں ماسٹر رام چندر نے متعدد معروف اور غیر معروف شعرا کا کلام بھی اپنے پرچوں میں شائع کرنا شروع کیا۔ ویسے تو رام چندر برطانوی نظام حکومت کے متعلق بہت اچھی رائے رکھتے تھے لیکن اس کے باوجود بعض جگہ انھوں نے اعتراضات بھی کیے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک یوروپین کا خط چھپا جس کا حاصل یہ تھا کہ ہندوستانیوں کو جدید علوم وفنون سے آراستہ کرنا برطانوی حکومت کے لیے خطرہ پیدا کرنے کے برابر ہے کیونکہ اس طرح ہندوستانی قوم ایسی صلاحیتوں کی مالک ہوجائے گی کہ انگریزوں کو ہندوستان سے نکلنے پر مجبور کردے گی اس لیے انگریزی نظام تعلیم کو رائج کرنا خود برطانیہ کے حق میں ضرر رساں ثابت ہوگا۔ ماسٹر رام چندر رائے'' ایک انگریز کی درباب تربیت اہل ہند کے'' زیرعنوان اس قسم کے خیالات پر افسوس ظاہر کرتے ہیں:

''بعض انگریزوں کی یہ رائے تھی اور اب بھی ہے کہ اگر اہل ہند کو علوم وفنون اہل فرنگ سکھائے جائیں تو وہ لوگ آزاد منش اور عالی حوصلہ ہوکر اہل انگریز کی حکومت کو دور کرنا چاہیں گے اور اس باعث سے اہل ہند کو انگریزی طریقے پر تربیت کرنا گویا اپنے حق میں برائی کرنی ہے''[5]

لیکن رام چندر اس معاملے میں اپنا نقطہ نظر اس طرح رکھتے ہیں کہ اس دور میں ہندوستانیوں کا برطانوی علوم میں ترقی یافتہ ہوجانا ناممکنات میں سے ہے اس لیے ان پر جدید علوم وفنون کا دروازہ بند کرنا غلط ہوگا بلکہ اس کے لیے تو اور زیادہ کوششیں ہونی چاہئیں:

''ہمیں لازم ہے کہ واسطے تدارک خوف مذکورہ بالا کو یہ نہ چاہیے کہ علوم وفنون کے شیوع میں برج ڈالیں بلکہ اور تدبیر کرنا چاہیے''[6]

انگلستان میں کیونکہ اپنے شہریوں کے لیے تعلیمی انتظامات کرنا حکومت کی ذمے داری نہیں تھی اور تعلیمی ادارے آزادانہ طور پر چلتے تھے اس لیے شروع میں کمپنی کی توجہ بھی اس طرف نہ گئی لیکن بعد میں عیسائی مشنریوں اور کچھ انگریز کارکنوں کی کوششوں سے یہاں جدید تعلیم کا آغاز ہوا مگر جلد ہی سیاسی ضروریات کی بنا پر اس کی اہمیت کا احساس انگریز حکام کو بھی ہونے لگا برطانوی پارلیمنٹ نے ہندوستان میں تعلیم کی طرف توجہ دی اور 1813 میں پہلی بار ایک لاکھ روپے کی رقم تعلیم پر خرچ کرنے کے لیے منظور کی گئی۔ اس زمانے میں ایک بحث یہ بھی چل رہی تھی کہ حکومت کو مشرقی تعلیم کی طرف توجہ کرنا چاہیے یا ہندوستانیوں کو مغربی تعلیم سے آراستہ کیا جائے۔ لارڈ میکالے کا جھکاؤ مغربی تعلیم کی طرف تھا لہذا اسی بنیاد پر تعلیمی پالیسی مرتب ہوئی۔ برطانوی حکومت ہندوستانی باشندوں کا ایک ایسا طبقہ وجود میں لانا چاہتی تھی جو کمپنی کے نظام کو مستحکم کرنے میں معاون ومددگار ثابت ہو اس دوران ہندوستانیوں کا ایک ایسا طبقہ بھی وجود میں آچکا تھا جسے اپنے اہل وطن کی علمی بے ثباتی کا شدت سے احساس تھا وہ جانتا تھا کہ جدید دنیا میں عزت وآبرو کے ساتھ زندہ رہنے کے لیے یوروپین علوم وفنون کا حصول وقت کی ایک بہت بڑی ضرورت ہے اور اس کے لیے وہ برطانوی نظام حکومت کے ساتھ تعاون کو ضروری سمجھتا تھا اس خیال کے حامی ماسٹر رام چندر بھی تھے برطانوی نظام حکومت سے تعاون رام چندر کے نزدیک قوم پرستی اور حب الوطنی کا تقاضا تھا ملکی مفاد کے پیش نظر انھیں یقین تھا کہ ہندوستان برطانیہ کا سہارا لیے بغیر قدامت کی تاریکی سے نہیں نکل سکتا۔ ان کے نزدیک ہندوستان کی تباہی کی اصل وجہ ہندوستانیوں کی ذہنی پسماندگی تھی جس کا علاج صرف مغربی علوم وفنون کی اشاعت کے ذریعے کیا جاسکتا تھا۔ ان کا مطمح نظر تھا کہ مغربی طرز کے اسکول اور کالج قائم کیے جائیں جہاں جدید وقدیم علوم وفنون کو بالکل نئے ڈھنگ سے سکھایا جائے۔ رام چندر چاہتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں ہندوستانی انگریزی زبان سے واقفیت حاصل کریں۔ انگریزی زبان کے فوائد کو بہت ہی واضح الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''زبان انگریزی ایک وساطت ہے کہ اس کے ذریعے سے جتنے علوم اور فنون اس دنیا میں بالفعل پائے جاتے ہیں موجود ہیں اور جس کو یہ منظور ہو کہ میں علوم اور فنون کو کما حقہ تحصیل کروں اسے لازم ہے کہ زبان انگریزی تحصیل کرے''[7]

انگریزی زبان میں کیونکہ علم وادب کا ایک وسیع ذخیرہ موجود تھا اس لیے ماسٹر رام چندر کی یہ خواہش تھی کہ اردو زبان اور ادب میں مغربی ادبیات کی جاندار اور توانا روایات کو منتقل کیا جائے تاکہ ہندوستانیوں کی علمی اور معاشرتی اصلاح ہو اور عام لوگوں کی بھلائی میں مدد ملے ساتھ ہی وہ انگریزی زبان کے بہترین سرمائے کو رفتہ رفتہ اردو میں پیش کرکے اسے انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں کی طرح اعلیٰ علمی حیثیت دینا چاہتے تھے:

''جو شخص ہندوستان کے اپنے ملک کے خیرخواہ ہیں اور اس قدر حوصلہ رکھتے ہیں کہ وہ کچھ فائدہ خلقت ہندوستان کو پہنچاویں ان کو چاہیے کہ اس بات کی کوشش کریں کہ جو علوم اور فنون زبان انگریزی میں ہیں ان کو بالکل زبان اردو میں ترجمہ کریں''[8]

ماسٹر رام چندر اس بات کو بھی سمجھتے تھے کہ ہندوستانی زبانوں میں جدید علوم وفنون کو منتقل کرنا ایک بڑا ذمے دارانہ اور مشکل کام ہے۔ اپنے ایک مضمون 'تربیت اہل ہند' میں وہ لکھتے ہیں کہ اس وقت سارے ہندوستان میں 56 مختلف زبانیں رائج ہیں اور ایک انگریزی کتاب کا ان 56 زبانوں میں ترجمہ کرنا بہت مشکل ہے اس سے زیادہ بہتر اور آسان طریقہ ہندوستانیوں کے لیے یہ ہے کہ وہ انگریزی زبان سیکھ لیں۔

ماسٹر رام چندر کی یہ شدید خواہش تھی کہ ہندوستانیوں میں فضول رسم ورواج کی جو پابندی چلی آرہی تھی اور یہاں کے لوگوں میں فرسودہ خیالات سے جو محبت اور نئی قدروں سے جو بدگمانی تھی اس کو دور کیا جائے رام چندر اس نظریے کے حامل تھے کہ افراد کی کوششوں سے قوم ابھرتی ہے اور مستقبل میں ہندوستان کی ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ نئی نسل کی تعلیم وتربیت اور ان کی اصلاح کا خاص خیال رکھا جائے انھیں اس بات کا کامل یقین تھا کہ ہندوستان کو آزاد کرانے کے لیے تعلیم ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے ہندوستانیوں میں قومی ترقی کی چاہ اور آزادی کی لگن پیدا ہوسکتی ہے۔ ماسٹر رام چندر اپنے ایک مضمون 'حب الوطنی' میں ہندوستان میں رائج تعلیمی نظام پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب تک ہندوستانیوں کو جدید علوم وفنون نہ سکھائے جائیں ان کی آنکھیں نہیں کھلیں گی وہ حب الوطنی کو صحیح تعلیم کا حاصل سمجھتے ہیں انھیں اس بات کا بھی شدت سے احساس تھا کہ نئی تعلیم کے حصول سے ہی یہاں کے لوگ غلامی کا داغ اپنی پیشانی سے مٹا سکتے ہیں:

''کم ہمتی جو اہل ہند کا خاصہ ہے اس کے باعث وہ ہمیشہ غلامی میں رہتے ہیں اور دیکھیے کب تک رہیں گے ان کو آزاد گورنمنٹ کا تصور بھی نہیں یہ اثر تعلیم کا ہے جو یہاں کے لوگ پاتے آئے ہیں..... اس حال میں یہاں باشندوں کو بہت ضرورت واسطے تحصیل علوم مختلفہ کی ہے بدون اس کے ان کی آنکھیں کبھی نہیں کھلیں گی مطالعہ تواریخ آزاد قوموں کا سب سے زیادہ ضرور ہے کیونکہ ان کی عالی ہمتیں اور حب الوطنی کو دیکھ کر انھیں بھی عزم آوے اور ایک روز داغ غلامی سے بری ہوں''[9]

ماسٹر رام چندر اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ جب برطانوی حکومت عوام کی تعلیم وتربیت پر دھیان

دے گی تو عوام کے اخلاق سدھریں گے جس کے اثر سے جرائم کا تناسب بھی بہت کم ہوجائے گا اور تعلیم پر جو خرچ برطانوی حکومت کرے گی:

''اس خرچ کے عوض میں اس سے زیادہ تو اس میں فائدہ حاصل ہوجائے گا کہ خرچ جیل خانوں اور فوجداری کے اخراجات اکثر کم ہوجائیں گے یعنی وہ خرچ جو سزا دینے گنہگاروں میں صرف ہوتا ہے بہت کم ہوجائے گا''[10]

ماسٹر رام چندر کی یہ خواہش تھی کہ جدید تعلیم کے حصول سے ہندوستانی رفتہ رفتہ اپنے اندر ایسی صلاحیت پیدا کرلیں کہ اپنے ملک کی تمام اہم ذمے داریاں بحسن و خوبی انجام دینے لگیں اور ایک وقت وہ بھی آئے جب ہندوستانی جج، کلکٹریٹ اور مجسٹریٹ جیسے اعلیٰ عہدے حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے ملک کے اصل حاکم بھی ہوجائیں:

''ہندوستان میں بڑے بڑے علاقے ملکی اور فوجی فرنگیوں کو ملتے ہیں اور ہندوستانیوں کو وہ علاقے نہیں ملتے ہیں..... کیا خوب بات ہو کہ علاقہ جات جج اور کلکٹر اور مجسٹریٹ پر ہمارے وطن کے آدمی بھی مقرر ہونے لگیں''[11]

یہ بات صحیح ہے کہ رام چندر انگریزوں کی بعض خوبیوں کے معترف تھے اور ان کی انتظامی خوبیوں اور صلاحیتوں کے قائل تھے برطانوی حکومت نے عوام کی بھلائی کے لیے جو اقدامات اٹھائے ان کی ستائش بھی رام چندر نے فوائدالناظرین کے مضامین میں کی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا سکتا کہ وہ برطانوی سیاست کے بعض پہلوؤں سے غیر مطمئن بھی تھے۔ انھیں ہندوستانیوں کی محکومی اور برطانوی حکومت کے غلبے کا پورا پورا احساس تھا جب کبھی ہندوستانی قوم کی حق تلفی ان کی نظر میں آتی تو وہ فوائدالناظرین کے ذریعے اپنا پرزور احتجاج ضرور درج کراتے۔ امروہہ میں جب انگریزوں نے غریبوں کی بعض اراضی ضبط کرلی تھیں تو رام چندر کی تحریر کا کڑواپن اور طنزیہ انداز صاف محسوس کیا جاسکتا ہے:

''ہزاروں غریب کہ وجہ معاش اپنے اوپر اسی زمین کے رکھتے تھے نان شبینہ کے محتاج ہوئے پس یہ مثل اس پر صادق آتی ہے کہ سلیمان زمانہ لقمہ دہن چیونٹی سے لیوے..... یہ بات لائق حوصلہ ایسے سرداران باوقار کے نہیں ہے کہ روزینہ بخشا ہوا بزرگان سلف کا پنجہ ضعیفوں بے پروبال سے لیویں اور بے چاری بیواؤں اور محتاجوں کو روٹی سے حیرانی کریں اور ممکن نہیں کہ اتنے زر قلیل سے خزانہ عامرہ سرکاری پر ہووے''[12]

فوائدالناظرین کے مضامین کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کے اس پرچے میں اس دور کی روح سمٹ آئی ہے انھوں نے فوائدالناظرین کے ذریعے سے اپنے زمانے کے سماجی تعلقات اور عمرانی مسائل کی بھی نقاب کشائی کی ہے ساتھ ہی سیاسی تبدیلیوں کی وجہ سے پیدا ہونے والے رجحانات اور عوامل سے بھی بحث کی ہے۔ ماسٹر رام چندر معاشرہ کی اصلاح اور عوام کی فلاح اور ترقی کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس کے مسائل کے سد باب کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔ جاگیرداری نظام کا زوال ہندوستانی عوام کی زندگی پر بھی اثر انداز ہورہا تھا ساتھ ہی برطانوی حکومت کی مطلق العنانی کے منفی اثرات ہندوستانی زندگی پر کس طرح اثر انداز ہورہے تھے اور اس سے عوام کی معاشی اور اخلاقی زندگی کس طرح متاثر ہورہی تھی اس کی واضح عکاسی فوائدالناظرین کے مضامین میں ملتی ہے۔ ہندوستانی قوم کے مستقبل کو لے کر وہ اکثر متفکر رہتے تھے نیز اس ضمن میں کبھی کبھی ان کے مضامین میں مایوسی اس حد تک در آتی کہ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتے کہ ہندوستانی قوم شاید اب اندھیرے میں ہی رہے گی کیونکہ ترقی کے کوئی آثار بھی نظر نہیں آتے:

''غرض یہ کہ کوئی علامت ایسی نہیں پائی جاتی کہ اس سے یہ معلوم ہو کہ کسی وقت میں اہل ہند اولوالعزم اور آزادمنش مثل اہل فرنگ کے ہوجائیں''[13]

ماسٹر رام چندر چاہتے تھے کہ برطانوی حکومت عوام کی تربیت میں اپنی ذمے داریاں بحسن وخوبی انجام دے اور اگر وہ اپنی اس ذمے داری کو نہیں سمجھتی ہے تو ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم گورنمنٹ کی توجہ اس جانب مبذول کرائیں بھلے ہی یہ بات حکومت کو ناگوار گزرے:

''گورنمنٹ کو لازم ہے کہ تربیت عوام میں دخل دے اور کوشش اور مدد کرے اور یہ ایک ایسی خوب بات ہے کہ اس کے اظہار میں کبھی تامل نہیں کروں گا خواہ کوئی خفا ہو یا خوش''[14]

اس طرح مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ فوائدالناظرین کے ذریعے سے ماسٹر رام چندر نے علم وادب اور ہندوستانی قوم کی قابل قدر خدمات انجام دیں اس پرچے کے ذریعے اردو میں تھوڑے ہی عرصے میں مفید اور کارآمد علمی مضامین کا ایک قابل قدر قیمتی اثاثہ وجود میں آگیا یہ پرچہ اردو کی علمی صحافت کے لیے ایک سنگ میل ثابت ہوا۔ فوائدالناظرین میں ماسٹر رام چندر نے ہندوستان کی تاریخ اور بادشاہان سلف کے ذکر کے ساتھ ساتھ آزاد قوموں کی تاریخ کے مطالعے پر خاص زور دیا تاکہ ہندوستانی قوم میں آزادی کی امنگ اور ولولہ پیدا ہوسکے۔ انھوں نے برطانوی حکومت کی توجہ عوام کی تعلیم وتربیت کی طرف دلانے کی کوشش کی اور ہندوستانی قوم کی حق تلفی پر اپنا پرزور احتجاج درج کرانے میں ذرا بھی تامل نہیں کیا۔ فوائدالناظرین (جو سرکاری امداد سے شائع ہوتا تھا) میں سرکار کی قابل گرفت باتوں پر پکڑ بھی کی جاتی تھی اور بلاشبہ یہ بڑی ہمت کا کام ماسٹر رام چندر نے انجام دیا۔

حواشی:

1 ماسٹر رام چندر قدیم دہلی کالج کی ایک اہم شخصیت، تالیف صدیق الرحمٰن قدوائی مع مقدمہ از خواجہ احمد فاروقی، ناشر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، اشاعت اول اگست 1961 ص 61

2 ایضاً، ص 62-61

3 ایضاً، ص 63

4 ایضاً، ص 63

5 'رائے ایک انگریز کی درباب تربیت اہل ہند کے' فوائدالناظرین، اگست 1847، ج 2، ن 19 ص 154، بحوالہ ماسٹر رام چندر اور اردو نثر کے ارتقا میں ان کا حصہ مؤلفہ ڈاکٹر سیدہ جعفر، انتخاب پریس جواہر لال نہرو روڈ۔ حیدرآباد 1960، ص 62

6 پروفیسر رام چندر صحافی کی حیثیت سے۔ پروفیسر قاسم علی حجن لال مترجم، خواجہ احمد فاروقی، قدیم دلی کالج نمبر، دلی کالج اردو میگزین، اپریل 1953، ص 64

7 'فوائد تحصیل علم انگریزی کے' فوائدالناظرین، 10 جنوری 1848 بحوالہ ماسٹر رام چندر قدیم دہلی کالج کی ایک اہم شخصیت، صدیق الرحمٰن قدوائی، ص 103

8 ایضاً، ص 106

9 'حب الوطنی' فوائد الناظرین، اکتوبر 1855، ج 2 ن 21، ص 164، بحوالہ ماسٹر رام چندر اور اردو نثر کے ارتقا میں ان کا حصہ، سیدہ جعفر، ص 56

10 ماسٹر رام چندر اور اردو نثر کے ارتقا میں ان کا حصہ، سیدہ جعفر، ص 135

11 'حال گورنمنٹ انگریزی ہندوستان کا' فوائدالناظرین 15 مئی 1845 بحوالہ ماسٹر رام چندر قدیم دہلی کالج کی ایک اہم شخصیت، صدیق الرحمٰن قدوائی، ص 100

12 'حال ضبطی اراضی معافیدران، قصبہ امروہہ' فوائدالناظرین، اپریل 1847، ج 2 ن 7، ص 55 بحوالہ ماسٹر رام چندر اور اردو نثر کے ارتقا میں ان کا حصہ، سیدہ جعفر، ص 48

13 فوائدالناظرین، اگست 1847، ج 2، ن 19، ص 154، بحوالہ ماسٹر رام چندر اور اردو نثر کے ارتقا میں ان کا حصہ، سیدہ جعفر، ص 62

14 ماسٹر رام چندر اور اردو نثر کے ارتقا میں ان کا حصہ، سیدہ جعفر، ص 134

Dr. Rais Fatma
D-2-224, Jamia Masjid Street
Markapur, Prakasam District - 523316 (A.P)
Mob: 7982427622
E-mail: safdaralibaig786@gmail.com

منصور خوشتر

پروفیسر عبدالمنان طرزی سے بات چیت

پروفیسر طرزی آج ایسا معتبر نام بن چکا ھے کہ جس کا معترف ھر خاص و عام ھے۔ دربھنگہ کی سرزمین جو صدیوں سے کافی زرخیز رھی ھے اس میں طرزی ایک نمایاں نام ھے۔ ان کی زندگی بہت ادنیٰ درجے سے شروع ھوتی ھوئی ایک اعلیٰ مقام تک پھنچتی ھے۔ وہ بھی مقام ایسا جس کے لیے لوگ رشک کرتے ھیں۔ صدر جمھوریہ ھندسے انعام یافتہ طرزی اب تک سانھ ھزار اشعار کھہ چکے ھیں۔

حادثے شخصیتوں کی تعمیر کرتے ھیں اور گھے یہ بھی ھوتا ھے کہ شخصیتوں سے حادثے سرزد ھوتے ھیں۔ طرزی اسی خانے میں آتے ھیں۔ حادثوں نے ھی ان کی شخصیت کی تعمیر کی ھے۔ پروفیسر طرزی کی پیدائش 19 محرم الحرم 1357ھ کو ھوئی تھی۔ رنج والم کی تمام داستانیں جو اب تک بڑے خلوص کے ساتھ ان کی رفاقت کا دم بھر رھی ھیں ان کے خلقی ورثے میں ملی ھیں۔ ان کا تاریخی نام "مظاھر السمیع" ھے جس کو سوائے طرزی صاحب کے کوئی اورنھیں جانتا۔ ھم جناب عبدالمنان طرزی کے شکر گزارھیں کہ انھوں نے ھمیں بات چیت کے لیے اپنا قیمتی وقت عنایت کیا۔

منصور خوشتر: طرزی صاحب سب سے پہلے اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں بتائیں؟

عبدالمنان طرزی: ہمارے والدؒ پوری زندگی، معلم، مقرر اور امام رہے۔ انہوں نے چار سال کی عمر میں میری بسم اللہ کرائی اور براہِ راست ان سے حصولِ تعلیم کا سلسلہ رہا۔ چنانچہ میں صرف سولہ برس کی عمر میں حافظ قرآن بحمد اللہ ہوگیا۔ میری جسمانی ساخت کچھ ایسی تھی کہ سولہ برس کا ہونے پر بھی سولہ برس کا نہیں لگتا تھا۔ مجھے تراویح سنانے کے لیے تقریباً دو سال انتظار کرنا پڑا۔ لوگ مجھے ''بچہ حافظ'' کہتے تھے۔ گھر کا ماحول دینی تھا۔ جب میرا ایک پارہ حفظ پورا ہوجاتا تو والدہؒ ایک روزہ رکھتیں۔ ہر جمعرات کو وہ پابندی سے مجھے مسجد میں جھاڑو لگانے کو بھیجتیں۔ اللہ پاک ہمارے والدین کی مغفرت فرمائے۔ والد سے ہی میں نے اردو وفارسی کی کتابیں پڑھیں۔ گلستاں، بوستاں، پندنامہ والد صاحب سے ہی پڑھا۔ اس کے بعد عربی پڑھنے کے خیال سے مدرسہ حمیدیہ قلعہ گھاٹ، دربھنگہ میں داخل ہوا۔ مولانا مقبول احمد خاںؒ، ناظم اعلیٰ نے مجھے یہ سہولت نہیں دی کہ میری صلاحیت کی بنیاد پر وسطانیہ میں میرا داخلہ ہو جبکہ فضل کبریا کو ایسا موقع دیا گیا۔ میں نے عربی پڑھنے کا خیال دل سے نکال دیا اور اختر الایمان کی طرح اپنا ٹین کا بکس سر پر رکھا اور پیدل دربھنگہ سے جلوارہ آگیا۔ گھر پر رہ کر ماسٹر نورالہدیٰ صاحب، اللہ ان کی مغفرت فرمائے، سے انگریزی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا اور ایک سال کے بعد پنڈراچ ہائی اسکول میں آٹھویں درجے میں داخلہ کرایا اور 1957 میں میٹرک پاس کیا۔ فرسٹ ڈویزن میں انیس نمبر کی کمی رہ گئی۔

خوشتر: آپ کی طالب علمی کے زمانے میں وسائل کی کمی تھی، کتابوں کی فراہمی ایک بڑا مسئلہ تھا، مطالعے کے لیے آپ کیا کرتے تھے؟

عبدالمنان طرزی: آپ کا اندازہ صحیح ہے۔ مدرسوں میں تو یہ طریقہ آج بھی ہے کہ 10-8 طلبا ایک ساتھ استاد کے سامنے ایک کتاب میں درس لیتے ہیں۔ میٹرک تک نصابی کتابیں مل جاتی ہیں۔ کالج میں کتابوں کی فراہمی میں مشکل پیش آتی ہے۔ ادبا وشعرا نصاب تیار کرنے والوں سے اپنے تعلق کی بنا پر اپنی کتاب نصاب میں شامل تو کرا دیتے اور وہ کتاب آسانی سے دستیاب نہیں ہوتی۔ اس مشکل کو ہم لوگ اس طرح حل کرتے کہ اگر کالج کی لائبریری میں مطلوبہ کتاب ہے تو ہفتہ دو ہفتہ کے لیے نام پر لے کر ممکنہ سوالات کے جوابات تیار کر لیتے۔ ایسا بھی ہوتا کہ بھارتی بھون ناولٹی طباعتی ادارے Notes تیار کرا کر بازار میں Display کر دیتے۔ آنرس (اردو)

> **میری جسمانی ساخت کچھ ایسی تھی کہ سولہ برس کا ہونے پر بھی سولہ برس کا نہیں لگتا تھا۔ مجھے تراویح سنانے کے لیے تقریباً دو سال انتظار کرنا پڑا۔ لوگ مجھے ''بچہ حافظ'' کہتے تھے۔**

اسٹیج میں Abros نامی ایک دوکان اسمٰعیل گنج میں تھی۔ جس کے کسی رشتے دار کی وجہ سے جو پاکستان میں رہتے تھے اس کو پاکستانی اعلیٰ نصاب معاون کتابیں حاصل

ہوجاتیں اور ہم لوگ Abros سے کافی اچھی اور نادر کتابیں حاصل کر لیتے۔ جب میں بی اے اور ایم اے کا امتحان دینے والا تھا تو میں سرکاری ملازمت میں آ گیا تھا اس لیے کتاب کی خریداری میں مجھے مالی پریشانی نہیں تھی۔ یہاں ایک بات واضح کردوں کہ میں میٹرک کے بعد سرکاری دفتر میں کلرک ہوگیا تھا۔ آئی اے اور اردو آنرس، ایم اے اردو اور فارسی اور ایل ایل بی تک سارے امتحانات پرائیوٹ طور پر بارہ برس کلرک رہتے ہوئے پاس کیے۔

خوشتر: تعلیم کہاں تک ہے؟ آپ نے کس موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری لی؟

عبدالمنان طرزی: میری تعلیم کے دو پہلو ہیں۔ مکتب نشینی سے لے کر تکمیل حفظ کلام پاک تک والد علیہ الرحمۃ قاری محمد داؤد طالب کا فیض ہے۔ یوں تو میری پوری زندگی، ان کی شفقت، تربیت اور درسیات چشم وابرو سے عبارت ہے لیکن تین چیزیں وارثِ کلی کے طور پر مجھے حاصل ہوئیں۔ حفظِ قرآن کا، معمولی سی فارسی دانی اور خوش خطی۔ پندرہ سال کی عمر میں حفظ سے فراغت پائی۔ میری تراویح کی امامت پر اعتراض ہوتا تھا کہ کم عمر لڑکا امام ہے۔ والد صاحب کی درس دہی کا طریقہ بھی کچھ عجیب تھا۔ میں ان کے پاؤں بھی دابتا رہتا۔ اس دوران وہ مجھ سے دو پارہ قرآن پاک سن لیتے۔ راستہ ساتھ طے کرتے ہوئے دو پارے سنا دیتا۔ اس کے بعد دار العلوم المشرقیہ حمیدیہ دربھنگہ میں عربی پڑھنے کے خیال سے کچھ مہینوں تک قیام رہا۔ میں چاہتا تھا کہ میری صلاحیت کی بنیاد پر میرا داخلہ اوپر درجے میں ہو۔ ناظمِ اعلیٰ مولانا مقبول احمد خاںؒ نے اس کی اجازت نہیں دی۔ گاؤں واپس آ کر ہائی اسکول کے آٹھویں درجے میں داخلہ پایا۔ 1957 میں میٹرک پاس کیا۔ مالی پریشانیوں کے پیش نظر آگے کی تعلیم جاری رکھنے کا ارادہ نہیں تھا۔ اس لیے امتحان سے قبل ہی بورڈ میں درخواست دے کر میں نے اپنی عمر تین سال بڑھالی تھی تاکہ ملازمت کرسکوں۔ تقریباً تین سال کے بعد 11 جنوری 1961 میں دربھنگہ میڈیکل کالج و ہسپتال میں باضابطہ کلرک کی جگہ مل گئی۔ اس ملازمت کا سلسلہ جولائی 1972 تک رہا جب کنور سنگھ کالج لہریا سرائے میں لکچرر کی حیثیت سے تقرری ہوگئی۔ آئی۔ اے، بی۔ اے (اردو آنرس) ایم۔ اے۔ اردو، ایم۔ اے۔ فارسی اور ایل ایل بی۔ ساری ڈگریاں ایام کلرکی کا ماحصل ہیں۔ صرف اردو آنرس کے موقع پر ملت کالج میں داخلہ لے رکھا تھا۔

میرے تحقیقی مقالے کا موضوع 'نواب سید سعادت علی خاں پیغمبر پوری حیات و خدمات' تھا۔ وہ صاحب دیوان شاعر گزرے ہیں۔ داغ دہلوی کے شاگردوں میں تھے۔ کئی رسائل و جرائد کے مربی اور سرپرست تھے۔ ان کا دیوان مطبع نول کشور، لکھنؤ سے بڑے اہتمام سے چھپا تھا۔ ان دنوں لاکھ روپے سے زیادہ خرچ آیا تھا۔ نہایت منقش، دیدہ زیب اور خوبصورت۔ ہر صفحے پر الگ الگ نقش نگاری کئی رنگوں میں تھی۔ میرے نگراں پروفیسر مطیع الرحمٰن علیہ الرحمٰن تھے جو ان دنوں صدر شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی تھے۔

خوشتر: ملازمت کی تفصیل بتائیں کب اور کہاں سے شروع کی؟

عبدالمنان طرزی: میں نے میٹرک کے قبل ہی حالات کے پیش نظر طے کرلیا تھا کہ پاس کرنے کے بعد نوکری کرلوں گا۔ مجھ سے چھوٹے پانچ بھائی تھے اور دو بہنیں تھیں۔ ان کے مستقبل کو بنانے کی ذمے داری کا احساس مجھ کو اپنی تعلیمی ڈگریوں سے زیادہ تھا۔ وجہ یہ تھی کہ والد نے دوسری شادی کرلی تھی۔ تقریباً ساڑھے تین برسوں تک مختلف نوعیت کی چھوٹی چھوٹی ملازمت کی۔ نشاط فیشن بوٹ ہاؤس اور چیت پور روڈ کول کا تاجوتے کی دکان میں (سیلس مین)، آسنسول اور بہار شریف کے صابن کے کارخانوں میں فیلڈ آفیسر اور مدرسہ امانیہ لوام اور بائسی مڈل اسکول پورنیہ میں معلم رہا۔ جنوری 1961 تا جولائی 1972 کلرک رہا۔ کنور سنگھ کالج لہریا سرائے میں لکچرر رہا۔ پھر بی پی ایس سی ایم کالج، دربھنگہ میں لکچرر بحال ہوا۔ 1981 میں متھلا یونیورسٹی کے اگزامینیشن ڈپارٹمنٹ میں ایک سال آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی رہا۔ اسی سال نومبر میں پی جی ڈپارٹمنٹ آف اردو میں تبادلہ ہوگیا جب سے تا سبکدوشیِ ملازمت (جولائی 2000) وہاں رہا پھر بحمد اللہ بحیثیت یونیورسٹی پروفیسر باعزت متقاعد ہوا۔

خوشتر: آپ کی زندگی کا سب سے خوبصورت لمحہ کون سا ہے؟

عبدالمنان طرزی: آپ اپنے سوال میں یادگار، خوش گوار اسم صفت کے ساتھ ایمان افروز بھی بڑھا دیجیے تو میرا جواب مکمل ہوگا۔ واقعے کو میں بہت اختصار کے ساتھ بیان کر رہا ہوں۔ 1958 میں بہار شریف کے ایک صابون کارخانے Arbi Soap Factory جو محلّہ پل پر واقع تھا، میں نے Field Officer کی حیثیت سے تقریباً دس روز کام کیا تھا۔ ایک دن کارخانے کے Iron Safe کے نیچے میں نے تین سو روپے پڑے ہوئے دیکھے۔ اس رقم کو میں نے رکھ لیا۔ بعد میں Cashier کو رقم کی کمی کا احساس ہوا۔ کمپنی کے تمام ملازمین سے پوچھا گیا سب نے لاعلمی ظاہر کی اور میں نے بھی۔ رات کو تقریباً تین بجے مجھے اپنے جرم کا احساس ہوا۔ میں نے وہ رقم مالک کارخانہ کے بستر پر آہستہ سے جا کر رکھ دی جس پر وہ آرام کر رہے تھے۔ صبح سب کی رائے ہوئی کہ اب تو اور بھی پتہ لگانا ضروری ہے۔ کچھ ملازمین جو یہاں رات کو رہتے ہیں ان میں سے کسی نے رقم داب رکھی تھی۔ بہر حال اسی شہر میں ایک شخص تھا جس کے پاس ایک کتا تھا اور وہ اپنے کتے کے ذریعے سچائی کا پتہ لگا دیتا تھا۔ چنانچہ اسی کو بلایا گیا۔ تمام ملازمین (تقریباً تیس) ایک دائرہ بنا کر کھڑے ہوگئے۔ کتے والے نے کہا کہ جس کا جی چاہے وہ کتے سے سوال پوچھ کر اس کے جواب سے مطمئن ہوجائے کہ یہ صحیح جواب بتاتا ہے یا نہیں۔ ایک لطف کے طور پر سب نے ضرورت سے زیادہ ہی سوالات کیے اور کتے نے صد فی صد صحیح جواب بتلایا۔ مثلاً کس کا نام احمد ہے۔ کون کہاں کا رہنے والا ہے، کس کی جیب میں اس وقت سب سے زیادہ روپیہ ہے اور جواب میں کتا اس آدمی کے پاؤں پر بیٹھ جاتا تھا۔ مجھے اپنی پیش آنے

کئی غیر مسلم شعرا نے ایسی اعلیٰ درجے کی فارسی نعتیں کہی ہیں کہ بڑی حیرت ہوتی ہے۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد شاداں، شگفتہ لکھنوی، قیس جالندھری لالہ امر ناتھ، ہرکشن لال پنڈت، سائل سہارنپوری وغیرہ کا فارسی کلام میں نے دیکھا ہے۔

والی ذلت ورسوائی کا احساس ایسا حواس باختہ کیے ہوئے تھا کہ سارے لوگوں کا مجھ پر ہی شبہ تھا۔ کتے سے ایک سوال یہ بھی کیا گیا تھا کہ مالک کارخانہ کو کس پر شبہ ہے۔ تقریباً 7-6 آدمیوں کے پاؤں پر وہ بیٹھا جس میں سے ایک میں بھی تھا۔ میں نے دل ہی دل میں توبہ استغفار کیا اور حضرت بڑے پیر کے نام پر فاتحہ پڑھ کر ذلت ورسوائی سے ان کے صدقے میں اللہ سے بچا لینے کی دعا کی۔ فائنل شو ہوا اور کتے سے روپیہ لینے والے کا نام پوچھا گیا وہ اس کارخانے کے باورچی کے پاؤں پر بیٹھ گیا جو بہت ایماندار آدمی سمجھا جاتا تھا۔ کسی کو یقین نہیں ہو رہا تھا۔ پھر تھوڑی دیر بعد دوبارہ یہ عمل کیا گیا۔ کتے کی آنکھ پر رومال باندھ دیا گیا اور پھر کتے کا جواب وہی تھا۔ اس واقعہ کے 2-3 گھنٹے بعد میں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور گھر واپس آ گیا۔

خوشتر: آپ فارسی زبان کے بھی اسکالر ہیں فارسی پڑھنے کا شوق کس طرح پیدا ہوا؟

عبدالمنان طرزی: فارسی میں نے حافظ ہونے کے بعد اور اسکول میں داخلہ لینے سے قبل تک والد ہی سے پڑھی تھی۔ نوکری میں آ جانے کے بعد ایک بڑے قابل اور مشفق استاد مل گئے۔ شفیع مسلم ہائی اسکول میں آرہ کے رہنے والے ایک استاد تھے جنید صاحب۔ اللہ مغفرت فرمائے ان کی، ان سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ والد صاحب 'اقبال منزل' بڑھی میں جب امام وخطیب ومعلم کی ذمے داری نبھایا کرتے تھے تو میں والد صاحب کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ حاجی عبدالغفار صاحبؒ کی بڑی شاندار لائبریری تھی۔ اس کی کنجی والد صاحب کے پاس ہوتی تھی اس لیے مجھے کتابوں سے عشق وہاں کی ہی دین ہے۔

خوشتر: فارسی کے کن اساتذہ سے آپ نے استفادہ کیا؟

عبدالمنان طرزی: جیسا میں نے اوپر بیان کیا والد صاحب سے اور مولانا جنید صاحب سے اللہ مغفرت فرمائے۔ جن کے کلام سے میں فیضیاب ہوا وہ ہیں شیخ سعدی، حافظ، عطار اور مولانا جلال الدین رومی۔

خوشتر: آپ کے نزدیک ہندوستان خاص طور سے بہار میں فارسی زبان کے زوال کے کیا اسباب ہیں؟

عبدالمنان طرزی: ہر عہد کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ کبھی فارسی کے عروج کا زمانہ تھا تو مسلمان چھوڑے، غیر مسلم فارسی شعرا چمنستانِ ہند میں بلبل خوش نوا کا مقام حاصل کیے ہوئے تھے۔ میری ایک تالیف طباعتی مرحلے میں ہے۔ کئی غیر مسلم شعرا نے ایسی اعلیٰ درجے کی فارسی نعتیں کہی ہیں کہ بڑی حیرت ہوتی ہے۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد شاداں، شگفتہ لکھنوی، قیس جالندھری لالہ امر ناتھ، ہرکشن لال پنڈت، سائل سہارنپوری وغیرہ کا فارسی کلام میں نے دیکھا ہے۔ اب تعلیم ذریعہ معاش ہے۔ فارسی پڑھنے پر تو تیل ہی بیچنا مقدر ہے اس لیے ہم فارسی سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔

خوشتر: آپ نے اردو کے علاوہ فارسی زبان میں بھی شاعری کی ہے جس نے آپ کو ایران تک پہنچایا۔ یہ سب کیسے ہوا؟

عبدالمنان طرزی: غالباً 2010 کے کسی مہینے میں اپنی اہلیہ کے ساتھ میں دہلی سے دربھنگہ آ رہا تھا ACII میں اپنی جگہ لے چکا تھا۔ کچھ دیر بعد ایک صاحب تشریف لائے جو اپنی شبیہ سے انگریز معلوم ہوتے تھے لیکن انہوں نے مجھے سلام کر کے میرے گمان کو خارج کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے فرمایا آپ طرزی صاحب ہیں نا؟ میں نے کہا جی میں ہوں تو طرزی، لیکن آپ طرزی شناس کیسے ہوئے؟ پھر انہوں نے اپنا تعارف کرایا اور مجھے یاد دلایا کہ ہم لوگ حیدرآباد یونیورسٹی حیدرآباد کے سہ روزہ سمینار میں جو جلال الدین رومی پر تھا، ساتھ تھے۔ سفر پر لطف رہا اور بہت حد تک ادبی۔ ڈاکٹر محمود عالم صاحب جہان آباد گیا کے رہنے والے ہیں۔ جے این یو میں فارسی شعبے سے بحیثیت پروفیسر سبکدوش ہوئے اور اب گڑگاؤں میں مقیم ہیں۔ بہت مشفق ومہربان ذی علم اور نیک وشریف انسان ہیں۔ انھوں نے پورا واقعہ میری کتاب قدآوراں پر فارسی زبان میں تقریظ کی صورت میں رقم کیا ہے۔ انھوں نے پوچھا کہ صدر جمہوریہ ہند سے جو فارسی دانی پر سند اعزاز اور انعام ملتا ہے وہ آپ کو ملا ہے؟ میں نے کہا کہ میں تو جانتا بھی نہیں ہوں کہ ایسا ہوتا ہے اور مجھے کون دے گا۔ انھوں نے کہا کہ ان شاء اللہ میں دلواؤں گا۔ آپ درخواست دیجیے۔ درخواست دیا۔ 2011 میں وہ طرزی نوازی میں ناکام رہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جو اس کمیٹی کے چیئرمین تھے ان سے ڈاکٹر محمود عالم صاحب کے تعلقات کشیدہ تھے۔ دوسرے سال 2012 میں میں نے ڈاکٹر محمود عالم صاحب سے کہا کہ آپ اب اس معاملے سے باہر رہیے اور میں چیئرمین صاحب سے براہ راست واسطہ پیدا کرتا ہوں۔ میں نے چیئرمین صاحب پر طویل نظم لکھی اور ان کے گھر پر گیا۔ ان کی اہلیہ بھی فارسی کی پروفیسر ہیں۔ غرضیکہ اللہ رب العزت کا کرم ہوا اور میں عزت مآب صدر جمہوریہ ہند کے ہاتھوں 2012 میں نوازا گیا۔ اس انعام کے تحت تا حیات 50 ہزار روپیہ سالانہ ملتا ہے۔ ہر سال ماہ اگست میں یہ رقم عطا کی جاتی ہے۔

خوشتر: آپ بحیثیت نظم نگار مشہور ہیں۔ آپ کے منظوم تبصروں اور منظوم مقالوں پر مشتمل کتابیں آ چکی ہیں۔ آپ اپنی زود گوئی کے لیے بھی جانے جاتے ہیں۔ آپ اپنے خیالات کو الفاظ کا پیکر کس طرح دیتے ہیں؟ کیا آپ طویل نظمیں ایک نشست میں ہی مکمل کر لیتے ہیں یا سلسلہ قسطوں میں پورا ہوتا ہے؟

عبدالمنان طرزی: میری شعری تصنیفات وتالیفات کو نفس مضمون کی بنیاد پر آپ دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک جس میں خیالات و افکار کی بوقلمونی و جلوہ سامانی ہے دوسرا حصہ وقائع نویسی پر مبنی ہے۔ پہلی نوعیت پر مبنی 'آیات جنوں' اور 'آہنگ غزل' ہے۔ باقی سارا کلام وقائع نویسی کے زمرے میں آتا ہے۔ وقائع نویسی میں شعریت کے جوہر دکھانے کا موقع کم ہوتا ہے۔ لیکن یہاں بھی میں نے کچھ خاص بات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ آہنگ غزل کے مقدمہ میں نارنگ صاحب فرماتے ہیں ''دیکھا جائے تو بہت کم عرصے میں انھیں (راقم الحروف کو) ریکارڈ اشعار کہنے کا شرف حاصل ہے اور میں کہتا ہوں کہ ان کے اشعار فقط تعداد وقادر الکلامی ہی کی وجہ سے نہیں بلکہ تازگی وندرت وشعریت کی وجہ سے بھی اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ ان کے طرز اظہار میں جو نظم وضبط اور رکھ رکھاؤ ہے اس سے ان کا شاعرانہ انفراد و امتیاز نمایاں ہوتا ہے۔ الفاظ کے دروبست میں غزل کے تہذیبی وثقافتی عناصر کی کارفرمائی ان کے کلام کو تہہ داری عطا کرتی ہے اور یہ ان کا وصف خاص ہے۔'' میں بلا تکلف ایک دن میں سو سے زیادہ اشعار کہہ لیتا ہوں۔ دو ماہ قبل ایک اور خوش کن تجربے سے آشنا ہوا۔ 372 غیر مسلم نعت گویوں کا منظوم تذکرہ لانے کا میرا منصوبہ تھا۔ سروائیکل پین کی وجہ سے لکھنے پڑھنے سے ڈاکٹر نے روک دیا۔ رمضان المبارک میں روزے کی حالت میں پندرہ نعت گو شاعروں کے بارے میں اشعار عزیزی عثمانی صاحب کو جو میرے مکان میں کرایہ پر ہیں کو اس طرح ڈکٹیشن دیتا جیسے نثر میں۔ میں خود بھی اللہ پاک کے اس فضل سے

خوش ہوااوراس کا شکریہ ادا کیا۔ایک ماہ سے کم ہی عرصے میں یہ کتاب تیار ہوگئی۔

خوشتر: طرزی صاحب ہندوستان اور خاص طور سے بہار میں اردو کے مستقبل کے سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

عبدالمنان طرزی: الحمد للہ، فصل لالہ کاری ولالہ زاری کے مترادف ہے۔ میرا خیال ہے کہ بہار تمام ریاستوں میں اردو کی ترویج واشاعت کے لیے سرفہرست ہے۔کمپیوٹر کی وجہ سے طباعتی واشاعتی مشکل مرحلے آسان ہوگئے ہیں۔ بہار اردو اکادمی اور راج بھاشا اردو بھی اردو ترویج وترقی کے بڑے کام کررہی ہے۔

خوشتر: نئی نسل کے تخلیق کاروں اور قلم کاروں میں کن ناموں نے آپ کو متاثر کیا ہے یہ بتائیں کہ اردو ادب کو نئی نسل سے جو امیدیں وابستہ ہیں اس پر وہ کس طرح کھرے اتر رہے ہیں؟

عبدالمنان طرزی: ایک دو نام نہیں ہیں جن کی خدمات وکاوشات سے متاثر ہوں۔ قافلہ جانب منزل رواں ہے۔ اردو ادب کی مقبولیت کو دو چار افراد کی کم نگاہی کیا نقصان پہنچائے گی کیونکہ گیسوئے اردو کے شانہ طرازوں کی فہرست بڑی طویل ہے۔اردو ادب کو نئی نسل سے جو امیدیں وابستہ ہیں وہ خوب خوب پوری ہورہی ہیں۔

خوشتر: ہندوستان میں ادب کے موجودہ منظر نامہ سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

عبدالمنان طرزی: ہندوستان میں اردو ادب کے موجودہ منظر نامے سے میں بہت مطمئن ہوں۔

ہر اک عہد کے ہیں تقاضے الگ
حقیقت الگ تو فسانے الگ
بہت وضع دارانہ سب سے ملی
محافظ رہی اپنی پہچان کی
تغیر پسند و ترقی پذیر
ہے اردو کا کچھ ایسا خود ہی خمیر
لچکدار مٹی سے ہے جو بنی
زمانے کے یہ ساتھ چلتی رہی

خوشتر: کوئی ایسا سوال جو میرے پوچھنے سے رہ گیا یا آپ میرے سوالات کے علاوہ اور کچھ کہنا چاہتے ہوں؟

عبدالمنان طرزی: اچھا کیا، آپ نے یہ سوال کرکے میری ایک خلش دور کردی۔ میں نے کسی جواب میں یہ بتایا ہے کہ اصناف سخن کی چار شقوں میں منظوم پیرایۂ اظہار کی بنا پر مجھے اجتہادانہ حیثیت حاصل ہے۔منظوم تذکرے (رفتگاں وقائماں) سے جس کی ابتدا ہوتی ہے۔اس کے بعد منظوم مقالے کا مقام آتا ہے۔منظوم مقالوں کی صرف

نارنگ صاحب فرماتے ہیں "دیکھا جائے تو بہت کم عرصے میں انہیں (راقم الحروف کو) ریکارڈ اشعار کہنے کا شرف حاصل ہے اور میں کہتا ہوں کہ ان کے اشعار فقط تعداد و قادر الکلامی ہی کی وجہ سے نہیں بلکہ تازگی و ندرت و شعریت کی وجہ سے بھی اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔

کتاب ہی آکر رہ جاتی تو کوئی خاص بات نہیں ہوتی۔ان مقالوں کو قومی اور بین الاقوامی سمیناروں میں پڑھنے کا موقع ملا وہ میری مقبولیت وشہرت کے در کھولتا ہے۔ان میں سے چار ساہتیہ اکادمی، ایک (پریم چند) این سی پی یو ایل، ایک (جلال الدین رومی، حیدرآباد یونیورسٹی) اور ایک (امام غزالی) الہ آباد میں منعقد ہوا تھا۔منظوم مقالہ نویسی کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے کہ ساہتیہ اکادمی سے ولی دکنی پر مجوزہ سمینار کی دعوت نارنگ صاحب کی طرزی نوازی کے نتیجے میں ملی۔ بہت ہی ہلکے انداز میں ڈاکٹر محمد ارشد جمیل مرحوم نے کہا کہ مقالہ منظوم ہی لکھیے۔ اللہ مغفرت فرمائے ان کی۔ نہ جانے کیسی ساعت میں یہ مشورہ انھوں نے دیا تھا۔تقریباً پچاس ساٹھ اشعار جب ہوگئے تو میں نے نارنگ صاحب کو فون کیا کہ میرا مقالہ منظوم ہوگا۔ انھوں نے جواباً کہا کہ منظوم مقالہ کیا ہوتا ہے۔مزید کہا کہ آپ پورا مقالہ بھیج دیجیے، دیکھنے کے بعد فیصلہ ہوگا اور میں نے ایسا ہی کیا۔ ساہتیہ اکادمی کے سمینار عام طور پر کم ازکم ایک ماہ قبل دعوت اور موضوع دیا جاتا ہے۔ سہ روزہ سمینار تھا۔ تینوں دن سمینار کا مقام بدلتا رہا۔ مجھے آخری دن، آخری سیشن میں پڑھنے کا موقع ملا جو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ہال میں منعقد ہوا تھا۔ ولی دکنی والے سمینار (دہلی) اور پریم چند والے سمینار (لکھنؤ) کا آنکھوں دیکھا حال دو عظیم ہستیوں (پروفیسر وہاب اشرفی اور پروفیسر شارب ردولوی) نے تحریر فرمایا ہے۔دونوں حضرات کی یہ قیمتی رائے میری دو الگ الگ کتابوں میں ان کے مقالے کی حیثیت سے محفوظ ہے۔اشرفی صاحب نے لکھا ہے پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔سیشن کی صدارت نثار احمد فاروقی صاحب نے فرمائی تھی۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے کہا کہ ولی کو اس عمدگی سے تو نثر میں بھی پیش نہیں کیا جاسکتا اور نثار احمد فاروقی صاحب نے کہا کہ نارنگ صاحب پورے ہندوستان کی خبر رکھتے ہیں۔ کیسے کیسے لوگوں کو ڈھونڈ نکالتے ہیں۔اس کے بعد نارنگ صاحب مائک پر آئے اور اس وقت ان کا سینہ ساٹھ انچ کا نظر آرہا تھا۔ کیونکہ عام صورت میں تو وہ چھپن انچ کا ہے ہی اور میرے سلسلے میں کچھ باتیں کہیں۔ میری مقالہ خوانی کا منظر ادھورا رہ جائے گا اگر میں تعریف وتحسین کے ایک پہلو کا بیان نہ کروں۔ ولی دکنی والے مقالے کے بعد میں نے دہلی میں دو اور سمینار میں منظوم مقالے پڑھے۔ میرے مقالہ (منظوم) پڑھنے کا جب موقع آتا تھا تو بہاری طرزی نواز حضرات جس میں کوثر مظہری، پروفیسر مولا بخش اور پروفیسر شیخ عقیل وغیرہ ہوتے تھے، ایک صف میں کھڑے ہوکر باضابطہ اور منصوبہ بند طریقے سے داد دیتے تھے۔ پروفیسر شارب ردولوی نے تفصیل سے لکھنؤ والے سمینار کا حال لکھا ہے۔ ابھی حال میں ڈاکٹر احسان کے ذریعے ترتیب دی گئی ایک کتاب میں ان کا مضمون شامل ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ طرزی اس کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ وہ منظوم گفتگو کرسکیں۔ (طرزی ذات سے شعری کائنات تک ص 36) اسی سمینار کے ایک معزز مقالہ خواں ڈاکٹر سید تقی عابدی (کناڈا) ایک خط (مطبوعہ) میں رقم طراز ہیں کہ آپ جیسی نامور شخصیت کو سمندر پار آنا چاہیے۔مکتوبات ص (79)

'منظوم مقالے' میری مطبوعہ کتاب ہے جس میں تقریباً چالیس منظوم مقالے ہیں۔ معاف فرمایئے گا جواب کچھ زیادہ مفصل ہوگیا۔

خوشتر: آپ نے ایک موقع پر کہا تھا کہ آپ بحمد اللہ حافظ قرآن ہیں بھی اور حافظ آپ کے نام کا حصہ بھی ہے، ایسا کیسے ہوا؟

عبدالمنان طرزی: 1952 میں حافظ ہونے کے بعد میں نے کچھ دنوں تک گھر میں رہ کر عصری تعلیم کی تیاری کی اور پنڈارچ ہائی اسکول درجہ ہشتم میں داخلہ کرایا۔ اتفاق سے ایک اور میرے ہمنام 3-2 دن کے بعد داخلہ لیا۔اگرچہ ان کے نام کے ساتھ خان کا لاحقہ تھا مگر میرے اسکول کے مولانا صاحب مولانا عبدالحفیظ ساکن موضع برداہا نے بغیر مجھ سے پوچھے میرے نام کے ساتھ حافظ بڑھوادیا۔ اگرچہ مجھے یہ سابقہ پسند نہیں تھا لیکن استاذ نے ایسا کیا تھا اس لیے میں نے اسے گوارا کیا۔

خوشتر: نوجوانوں کو آپ کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

عبدالمنان طرزی:

بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

■

DrMansoor Khushter
Editor-Darbhanga Times
Purani Munsafi
Darbhanga-800 004 (Bihar)
Mob.:9234772764
Email.: mansoorkhushter@gmail.com

محمد پرویز عالم

ہندوستان میں روزگار کے مواقع

سرکاری اقدامات کے تناظر میں

ہندوستان دنیا کی تیزی سے ترقی کرتی معیشتوں میں سے ایک ہے۔ کسی بھی معیشت کے لیے سب سے اہم خطرہ بے روزگاری ہے۔ بے روزگاری ایک مستقل طور پر استعمال شدہ اصطلاح ہے اور بے روزگار سے وہ لوگ عام طور پر مراد لیے جاتے ہیں جو کام سے ہٹ جاتے ہیں۔ بے روزگاروں میں وہ تمام افراد شامل ہیں جو کام کرنے کے قابل اور خواہشمند ہیں لیکن انھیں ملازمت میسر نہیں ہے۔ معاشی سرگرمیوں کی تعریف میں این ایس ایس کے سروے میں تمام طرح کے کام بشمول خودروزگار (سیلف امپلائمنٹ)، جزوقتی کام (پارٹ ٹائم ورک)، گھریلو کام (ہوم میڈ کام) اور اس طرح کے کاموں کو شامل کیا گیا ہے۔ یوں تو بے روزگاری کی متعدد شکلیں ہیں مگر قومی نمونہ سروے کے مطابق ہم اسے دو بڑے تناظر میں دیکھ سکتے ہیں دیہی بے روزگاری اور شہری بے روزگاری جس کی درجہ بندی جنس، عمر، تعلیم، منظم و غیر منظم شعبہ، موسمی، زرعی و صنعتی شعبے کے اعتبار سے کی جاسکتی ہے۔ ہندوستان میں ملازمت سے متعلق سرکاری اعداد و شمار کے بڑے ذرائع مردم شماری، این ایس ایس او کا روزگار اور بے روزگاری سروے، ڈائریکٹوریٹ جنرل آف امپلائمنٹ اینڈ ٹریننگ ہیں۔

ہندوستان کی مردم شماری، سالانہ سروے آف انڈسٹریز، ڈائریکٹوریٹ جنرل آف امپلائمنٹ اینڈ ٹریننگ (DGET ڈی جی ای ٹی)، اس کے علاوہ ہم بنیادی طور پر لیبر بیورو (ایل بی) کے ذریعے 2015 میں کیے گئے سرکاری روزگار بے روزگاری سروے (EUS) اور عظیم پریم جی یونیورسٹی میں مرکز برائے پائیدار روزگار (اسٹیٹ آف ورکنگ انڈیا (ایس ڈبلیو آئی) 2018 پر انحصار کرتے ہیں۔

موجودہ اعداد و شمار کے مطابق، قریب 90 لاکھ مزید نوجوان بہتر ملازمتوں تک رسائی کے قابل ہونے کی امید میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ثانوی اور اعلیٰ ثانوی تعلیم میں ایسے نوجوانوں کی کل تعداد کم از کم 5.5 کروڑ ہے۔ پچھلے پانچ سال کے عرصے میں، ہر قسم کی ملازمت میں بھی تقریباً 2.8 کروڑ کا اضافہ ہوا ہے۔

حکومتِ ہند کی بے روزگاری دور کرنے کی سمت میں کی جانے والی کوششوں پر نظر ڈالیں تو صورت حال مثبت نظر آتی ہے۔ کچھ اہم پروگراموں کے ذریعے اس کی تصویر جدول میں دیکھی جاسکتی ہے۔

اہم پروگراموں کے ذریعے پیدا شدہ روزگار کا اعداد و شمار

پروگرام	2016-17	2017-18	1028-19	2019-29*
پردھان منتری روزگار یوجنا کے تحت پیدا شدہ روزگار	407840	387182	587416	211840
مہاتما گاندھی قومی دیہی روزگار گارنٹی کے تحت روزگار کی فراہمی	23564000	23374000	26799000	20762000
پنڈت دین دیال اپادھیائے گرامین کوشل یوجنا کے تحت روزگار	147883	75787	135502	110862
دین دیال انتودیہ یوجنا قومی شہری ذریعہ معاش مشن کے تحت ہنرمند نوجوانوں کا پلیسمنٹ	151901	115416	178243	44066
کل	24271624	23952385	27700161	21128768

*As on 27.1.2020

وزارت دیہی ترقی بشمول مہاتما گاندھی نیشنل رورل امپلائمنٹ گارنٹی ایکٹ (MGNREGA)، دین دیال اپادھیائیا انتودے یوجنا- نیشنل رورل لائولی ہڈ مشن (NRLM-DAY)۔مختلف شعبوں میں لوگوں کا معیار زندگی میں مجموعی طور پر بہتری لانے کے لیے ریاستی حکومتوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں کے ذریعے ان پروگراموں کے نفاذ سے براہ راست یا بالواسطہ روزگار کے مواقع پیدا ہوتے ہیں۔ یہ نوجوانوں میں مہارت پیدا کر کے ذریعہ کھلے بازار یا اوپن مارکیٹ میں ملازمت کے قابل بناتے ہیں اور انھیں خود روزگار یا کاروبار کا اہل بناتے ہیں۔منریگا کے تحت، بالترتیب 2017، 2016-17، 2018-19، 18 اور 2019-20 کے دوران 235.15 کروڑ، 233.74 کروڑ 267.99 کروڑ اور 207.62 کروڑ غیر ہنر مند افراد روزگار سے مربوط ہوئے۔ 2018-19 کے دوران، 85.61 کروڑ (27.07.2018 تک) افراد میں غیر ہنر مند روزگار پیدا ہوا ہے۔

روزگار کی فراہمی کے ساتھ ساتھ ملازمت میں بہتری لانا حکومت کی ترجیحات میں شامل ہے۔ روزگار کے مواقع پیدا کرنا کسی بھی ملک کی معاشی ترقی کا سنگ بنیاد ہے اور یکے بعد دیگرے ہر حکومت نے یہ مواقع پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔حکومت ہند کی مختلف رفاہی و ترقیاتی اسکیموں اور پروگراموں کے سلسلے میں بجٹ میں مختص رقم میں اضافے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دیہی بنیادی ڈھانچے کی ترقی، معیشت کے شعبے میں تنوع پیدا کرنے، غربت کے خاتمے کے اقدامات میں تیزی لانے پر خصوصی توجہ ہے۔

وزارت محنت اور روزگار نیشنل کیریئر سروس کو ایک مشن موڈ پروجیکٹ کے طور پر نافذ کر رہی ہے تاکہ ملازمت سے متعلق مختلف خدمات جیسے کیریئر سے متعلق مشاورت، پیشہ ورانہ رہنمائی، مہارت کی ترقی کے نصاب سے متعلق معلومات، اپرنٹس شپ اور انٹرن شپ فراہم کی جاسکے۔ان خدمات تک ذریعہ معاش کے مراکز، مشترکہ خدمت مراکز، ڈاک خانے، موبائل یا سائبر کیفے وغیرہ کے ذریعے براہ راست رسائی حاصل کی جاسکتی ہے اس سروس کے ذریعے 5.85 کروڑ خالی اسامیوں کی تلاش کی گئی ہے۔

حکومت نے ملک میں روزگار کے مواقع پیدا کرنے کے لیے مختلف اقدامات اٹھائے ہیں جیسے معیشت کے نجی شعبے کی حوصلہ افزائی، سرمایہ کاری میں شامل مختلف منصوبوں، وزیراعظم روزگار جنریشن پروگرام (PMEGP)، مہاتما گاندھی قومی دیہی روزگار گارنٹی اسکیم (MGNREGS) جیسی اسکیموں پر عوامی اخراجات میں اضافہ (MGNREGS)، پنڈت دین دیال اپادھیائے گرامن کوشل یوجنا اور دین دیال انتودے یوجنا-قومی شہری روزگار مشن (NULM-DAY) وغیرہ میں تیزی لانا ہے۔

ملک کی معاشی ترقی میں نوجوانوں کو فعال شراکت داری کے قابل بنانے کے لیے کاروبار کو فروغ دینا ضروری ہے۔اسی مناسبت سے حکومت ہند نے متعدد اقدامات جیسے اسٹارٹ اپ انڈیا، مدرا اسکیم وغیرہ کے ذریعے کاروباری کو ترجیح دی ہے تاکہ تاجروں کی تربیت اور مالی اعانت کی جاسکے۔ نئے انٹر پرینیور آگے آئے اور مستحکم ہونے کے لیے اسکل ڈیولپمنٹ کو قومی ترجیح کے طور پر اپنایا اور اسکل انڈیا مشن کا آغاز کیا۔

اسکل انڈیا مشن کے تحت، وزارت اسکل ڈیولپمنٹ اینڈ انٹر پرینیورشپ پروگرام جس کو پردھان منتری کوشل وکاس یوجنا (پی ایم کے وی وائی) کے نام سے جانا جاتا ہے جس کا مقصد ملک بھر میں مختصر مدتی تربیت یا شارٹ ٹرم ٹریننگ (STT) اور ریکگنیشن آف پریئر لرننگ (RPL) کے تحت 2016 تا 2020 میں ایک کروڑ افراد کو ہنر مند کرنے کا منصوبہ ہے۔

ہندوستان 2024-25 تک 5 ٹریلین ڈالر کی معیشت کے وژن کو پورا کرنا چاہتا ہے۔اس ہدف کو حاصل کرنے کے لیے ایم ایس ای سیکٹر پر نگاہیں مرکوز ہیں۔ایم ایس ایم ای شعبہ میں 10 کروڑ سے زیادہ افراد روزگار رکھتے ہیں اور 45 فیصد پیداوار کے ساتھ ساتھ 40 فیصد سے زیادہ ملک کی درآمدات ہیں۔اس وقت ملک کی جی ڈی پی کا 29 فیصد شراکت داری ایم ایس ایم ای سیکٹر کا ہے۔

روزگار کی فراہمی کے ساتھ ساتھ ملازمت میں بہتری لانا حکومت کی ترجیحات میں شامل ہے۔ روزگار کے مواقع پیدا کرنا کسی بھی ملک کی معاشی ترقی کا سنگ بنیاد ہے اور یکے بعد دیگرے ہر حکومت نے یہ مواقع پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ حکومت ہند کی مختلف رفاہی و ترقیاتی اسکیموں اور پروگراموں کے سلسلے میں بجٹ میں مختص رقم میں اضافے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دیہی بنیادی ڈھانچے کی ترقی، معیشت کے شعبے میں تنوع پیدا کرنے، غربت کے خاتمے کے اقدامات میں تیزی لانے پر خصوصی توجہ ہے۔

پرائم منسٹر ایملائمنٹ جنریشن پروگرام (PMEGP) کا آغاز روایتی کاریگروں اور بے روزگار نوجوانوں کی مدد کر کے غیر زراعتی شعبے میں مائیکرو کاروباری اداروں کے ذریعے خود روزگار کے مواقع پیدا کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ایم ایس ایم ایز کے حوالے سے حکومت نے موجودہ 49 فیصد سے 60 فیصد تک برآمدات کا ہدف مقرر کیا ہے۔غیر ملکی منڈیوں کی ضروریات کے بارے میں ایم ایس ایم ای میں بہتر آگاہی پیدا کرنے کی بھی کوششیں کی جارہی ہیں تاکہ وہ اس کے مطابق اپنی مصنوعات کو تیار کر سکیں۔

پردھان منتری روزگار پروتساہن یوجنا (PMRPY) وزارت محنت و روزگار نے روزگار کے مواقع کو فروغ دینے اور ملازمین کو ترغیب دینے کے لیے شروع کیا تھا۔اس اسکیم کے تحت حکومت 3 سال سے تمام شعبوں کے اہل ملازمین کے لیے EPF اور EPS کی طرف آجر کی پوری شراکت (12% یا قابل قبول) ادا کر رہی ہے۔

ان اقدامات کے علاوہ حکومت کے اہم پروگرام جیسے میک ان انڈیا، ڈیجیٹل انڈیا، سوچھ بھارت مشن، اسمارٹ سٹی مشن، اٹل مشن برائے بحالی اور شہری تبدیلی (Atal Mission for Rejuvenation and Urban Transformation)، رہائش سب کے لیے، انفراسٹرکچر ڈیولپمنٹ اور صنعتی اداروں میں روزگار کے مواقع پیدا کرنے کی صلاحیت ہے۔ وزارتیں، محکمے، ریاستیں نوجوانوں کی ملازمت کو بہتر بنانے اور تقرری کے لیے مختلف شعبوں میں ہنر مندی کے منصوبے چلاتی ہیں۔نیشنل اپرنٹس شپ پروموشن اسکیم (این اے پی ایس) جیسی اسکیمیں جن میں اپرنٹس کو دیے جانے والے وظیفے کے 25 فیصد کی ادائیگی (Reimburse) حکومت کرتی ہے، نوجوانوں کے روزگار تک رسائی کی سمت میں اضافہ کرتی ہے۔

اس طرح روزگار کے مواقع میں اضافے کو یقینی بنانے کے لیے حکومت کے اقدامات کو چار حصوں میں تقسیم کر کے دیکھا جا سکتا ہے: پہلا مہارت کی ترقی، دوسرا مزدور اصلاحات، تیسرا ملازمت پیدا کرنا، اور چوتھا دیہی ترقی۔

مہارت کی ترقی: ایم ایس ڈی ای (نیشنل اسکل ڈیولپمنٹ کارپوریشن) کے کوشل بھارت کے توسط سے، ہر سال ایک کروڑ سے زائد نوجوانوں کو مختلف مہارتوں کی تربیت دی جارہی ہے۔قومی اپرنٹس شپ پروموشن اسکیم (این اے پی ایس) اگست 2016 میں

شروع کی گئی تاکہ آجروں کو زیادہ سے زیادہ اپرنٹس میں مشغول ہونے کی ترغیب دی جائے۔

ایم ایس ڈی ای ملک کے 24 لاکھ نوجوانوں کو شامل کرنے کے مقصد سے نیشنل اسکل ڈیولپمنٹ کارپوریشن کے ذریعے پردھان منتری کوشل وکاس یوجنا نافذ کی گئی۔ اس اسکیم کی توجہ روزگار پر ہے اور اہل امیدواروں کو مختلف شعبوں اور صنعتوں میں ملازمت کو یقینی بناتا ہے۔

مزدور اصلاحات: مزدور اصلاحات کا آغاز ہر کارکن کی حفاظت، سلامتی، صحت اور سماجی تحفظ سے متعلق پہلوؤں کو مستحکم کرنے کے مقصد سے کیا گیا ہے۔ غیر منظم شعبے میں کارکنوں کو معاشرتی تحفظ کے فوائد کے ساتھ ساتھ بڑھاپے کے تحفظ کے لیے دو بڑی پنشن اسکیمیں بھی متعارف کروائی گئیں۔

- دین دیال انتودیہ یوجنا قومی دیہی معیشت مشن (ڈی اے وائی - این آر ایل ایم: نیشنل انتودیہ یوجنا - نیشنل رورل لائولی ہڈ مشن) کا مقصد متنوع اور فائدہ مند خود روزگار اور ہنر مند اجرت روزگار کے مواقع کو فروغ دینا ہے۔ اس مشن کے تحت کمیونٹی اداروں کو فروغ دینے اور مضبوط کرنے پر زور دیا جا رہا ہے۔ قومی دیہی ذریعہ معاش مشن کے دو عناصر ہیں۔

پہلا ذریعہ معاش پروگرام (The livelihood program) جو خواتین کے سیلف ہیلپ گروپوں پر مرکوز ہے اور دوسرا جزو این آر ایل ایم کا دین دیال اپادھیائے گرامین کوشل یوجنا ہے۔ اس پروگرام کے تحت، 15 سے 25 سال کی عمر کے غریب خاندانوں کے دیہی نوجوانوں کو مہارت کی تربیت فراہم کی جاتی ہے۔

1 پردھان منتری شرم یوگی مان دھن یوجنا: یہ یوجنا غیر منظم شعبے میں کارکنوں کی فلاح و بہبود کے لیے ایک رضاکارانہ اور حصہ دینے والی پنشن اسکیم ہے۔ اسے فروری 2019 میں شروع کیا گیا۔ اس کے تحت غیر منظم شعبے سے تعلق رکھنے والے 18 سے 40 سال عمر کے کارکنان جن کی ماہانہ آمدنی 15000 یا اس سے کم ہے انھیں 60 سال کی عمر کے بعد، مستفید ہونے والے کو ماہانہ 3000 روپے پنشن ملے گی۔

2 قومی پنشن اسکیم: اسے ستمبر 2019 میں تاجروں، دکانداروں اور خود روزگار میں مصروف افراد کے لیے شروع کی گئی۔ ایسے تاجر اور دکان دار جن کی عمر یں 18 تا 40 سال ہیں جن کا سالانہ کاروبار 1.5 کروڑ سے زیادہ نہیں ہے۔ انھیں اس پروگرام کے تحت، مستحق افراد کی طرف سے 50 فیصد ماہانہ حصہ دیا جاتا ہے اور اس میں مماثلت کی شراکت مرکزی حکومت کرتی ہے۔ 60 سال کی عمر پوری ہونے پر، اس طرح کے فرد کو کم سے کم 3000 روپے ماہانہ پنشن کا حق ہے۔

ملازمت پیدا کرنا: وزیر اعظم روزگار پروتساہن یوجنا کے تحت کاروبار کے آغاز سے لے کر 3 سال تک کی مدت کے لیے حکومت نئے آجروں کو خصوصی مدد فراہم کر رہی ہے۔ اس اسکیم کے تحت، ملازمین کے مستقبل کے فنڈ اور ملازمین اسٹیٹ انشورنس اسکیم میں آجروں کی پوری شراکت حکومت خود ادا کرتی ہے۔ اس اقدام سے غیر منظم شعبے کے کارکنوں کو سماجی تحفظ کے فوائد مل رہے ہیں۔

دیہی ترقی: دیہی ہندوستان میں جامع ترقی کو یقینی بنانے کے لیے منریگا ایک میل کا پتھر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے تحت دیہی علاقوں میں ہر گھر کو کم سے کم 100 دن کے لیے دستی مزدوری سے متعلق غیر ہنر مند روزگار کی ضمانت دی جا رہی ہے۔ اس اسکیم کے تحت مالی سال 15-2014 تا 20-2019 میں 1348.43 کروڑ یومیہ جاری کیا گیا۔

- پردھان منتری آواس یوجنا - گرامین: یہ یوجنا ایک ہاؤسنگ پروگرام ہے جس میں براہ راست اور بالواسطہ دونوں طرح سے روزگار پیدا ہوتا ہے۔

فرد کی ترقی اور نشوونما کا انحصار اس کی تعلیم خواہ وہ بنیادی ہوں یا تکنیکی اور پیشہ پر ہے۔ گلوبلائزیشن کے اس دور میں نوجوانوں میں روزگار کے لیے تین اہم چیزیں علم، ہنر اور بہتر شخصی رویہ لازمی ہیں۔ بنیادی کام کی مہارت افراد کو لیبر مارکیٹ کو سمجھنے، تعلیم، تربیت، اجرت، خود روزگار، کو آپریٹو میں ان کے اختیارات سے باخبر کراتی ہے اور پیشے کا انتخاب کرنے میں مدد فراہم کرتی ہے۔ وہ انھیں بہتر شہری بننے میں معاونت کرتی ہے اور اپنی برادریوں اور معاشروں میں پہچان دلاتی ہے۔ عام طور پر، تعلیم سے نوجوانوں کو معیاری ملازمت حاصل کرنے کے امکانات بہتر ہوتے ہیں اور اس کی پیداواری اور آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے۔

حکومت کے مذکورہ بالا مختلف اقدامات آنے والے دنوں میں نہ صرف نوجوانوں کو روزگار سے منسلک کرنے میں مدد کریں گے بلکہ ان کی ہمہ جہت ترقی اور خود کفیل و خود مختار بننے میں اہم کردار ادا کریں گے۔ توقع ہے کہ حکومتی اقدامات اسکل ڈیولپمنٹ، لیبر ریفارم، ملازمت کے مواقع پیدا کرنا اور دیہی ترقی کی سمت میں متعدد اسکیموں کے ذریعے نوجوانوں کو تعلیم، ہنر سے لے کر انٹرپرینر شپ حاصل کرنے تک کے خوابوں کو پورا کرنے میں معاون ثابت ہوں گے۔ یہ تمام سرگرمیاں ملک کے معاشی حالات کو بہتر بنانے اور بے روزگاری کو کم کرنے کی سمت میں امید کی کرن ہیں۔ شرط یہ ہے کہ سرکاری سطح پر خلوص اور نیک نیتی سے ان اسکیموں کے نفاذ پر توجہ دی جائے اور عوام الناس تک ان اسکیموں کی پوری جانکاری پہنچائی جائے تاکہ وہ ان سے بھرپور استفادہ کرسکیں۔

■

Md. Parwez Alam
Research Scholar, Dept of Social Work
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli
Hyderabad - 500032 (Telangana)
Email.: prwez.alam@gmail.com

زنیرہ

محی الدین قادری زور بہ حیثیت شاعر

سید محی الدین قادری زور ایک درویش صفت انسان تھے۔ زور بحیثیت محقق، ماہر لسانیات، ماہر دکنیات، ماہر مخطوطات، نقاد، افسانہ نگار کے تعلق سے کسی بھی تعارف کے محتاج نہیں ہیں لیکن بات اگر بحیثیت شاعر کی جائے تو افسوس ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ بس ایک تخلص زور ہی رہ گیا ہے۔ اس تعلق سے ہمارے ناقدین کی بھی نظر کم ہی گئی ہے۔ اس کے پیچھے وجہ کیا رہی ہے اس تعلق سے بہت سے سوالات ہمارے اور آپ کے ذہن میں آسکتے ہیں جیسے کہ کیا زور کی شاعری ہی ایسی تھی کہ اس پر توجہ نہ دی جائے یا پھر زور کی دیگر خدمات نے ایک بطور شاعر کی پہچان بننے نہیں دیا؟ ان سوالوں کے جواب ہمیں ان کی شعری خصوصیات کے اجاگر ہونے کے بعد ہی مل سکیں اور کچھ اسی تعلق سے میں نے چند باتیں اس مضمون میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

زور کو شعر کہنے کا فن ورثے میں ملا تھا۔ ان کے والد حضرت زعم بھی ایک شاعر تھے یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ زور ایک موروثی شاعر تھے۔ علاوہ ازیں ان کی طبیعت بھی فطرتاً شعر گوئی کی طرف مائل تھی اور کچھ زندگی کے تجربات و مشاہدات نے انھیں وسعت نظری بخشی۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ زور نے اپنی ذات اور شخصیت کے اظہار کے لیے ادب کی جن اصناف کا سہارا لیا ان میں سے ایک شاعری بھی ہے، یہ اور بات ہے کہ زبان کی دیگر خدمات نے انھیں اس طرف دیکھنے کا بہت ہی کم موقع دیا اور ان کی شاعری کے کل اثاثے میں 5 نظمیں چاندنی، آسماں کی زبان سے، افسانہ محبت، رہبر منزل کی جدائی، جامعہ عثمانیہ اور نونہالان دکن، فارسی میں ایک نظم 'خیر مقدم' کے عنوان سے ہے اور غزلوں میں ان کی 16 غزلیں اور چند متفرق اشعار شامل ہیں۔

زور کی شاعری پر جب ہم تنقیدی نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ زور کی یہ شاعری غم جاناں اور غم دوراں سے عبارت ہے۔ ان دونوں نے مل کر زور کی زندگی میں اتنے انتشار پیدا کر دیے تھے کہ ان کو کہنا پڑا۔

ہم اور غم دوراں کی خلش، ہم اور غم جاناں کی تپش
کچھ لوگ ابھی تک فردائے قیامت بیٹھے ہیں

ہمارے لیے یہ غور و فکر کا مقام ہے کہ زور کی زندگی میں اتنے مسائل ہونے کے باوجود بھی انھوں نے زندگی کے کسی موڑ پر ہمت نہیں ہاری اور ہر مشکل کا سامنا بڑے ہی بہادری سے کرتے رہے۔ ادب ہو کہ زندگی دونوں ہی میں جوش اور ولولے کے ساتھ بے لوث خدمات انجام دیتے رہے انھیں اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ زندگی تو فانی ہے ہی اور ایک انسان کی خدمت اور کام ہی ہیں جس کی بدولت وہ ہمیشہ یاد رکھے جاسکتے ہیں اس لیے انھوں نے کہا کہ

یوں تو کرنے کو بہت کام ہیں لیکن اے زور
کام آتا ہے ہنر کوئی نہ خدمت کے سوا
موت سے بھی مریں گے نہیں زور ہم
زندگی میں جو کچھ کام کر جائیں گے

زور کی ہمہ جہت شخصیت کی بہترین عکاس ان کی شاعری ہے۔ کہنے کو تو یہ صرف 5 نظمیں اور 16 غزلیں ہیں لیکن ہر غزل کا ایک ایک شعر ہماری توجہ اپنی طرف کھینچتا ہے۔ موضوعات کے تنوع کے بنا پر ان کی یہ غزلیں کسی شاعر کے دیوان سے کم نہیں ہیں۔ ان کے یہاں عشق کی نیرنگیاں اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہیں۔ وہ محبوب کو اپنی آنکھوں میں یوں بسائے ہوئے ہیں کہ

میری آنکھوں میں جلوہ اپنا دیکھو
یہ ہر دم دیکھتے ہو آئینہ کیا

اسی طرح وہ کبھی کبھی محبوب کے خیالوں میں اس قدر کھو جاتے ہیں کہ انھیں محبوب کے پاس ہونے کا گماں ہوتا ہے۔

سوچتا ہوں کہ کہیں تم تو نہیں آنکلے
ایک ہلچل سی مچی رہتی ہے جب دل کے قریں

اتنا اچھا اور سچا شعر کہ بے ساختہ دل کہہ اٹھے کہ واہ یہ زور کا کمال ہے۔

ایک عاشق کے دل میں اپنے محبوب کے دیدار کے لیے جو تڑپ اور بے چینی ہوتی ہے اس کی جھلک بھی ہمیں زور کے یہاں دیکھنے کو ملتی ہے۔ محبوب کا شوق دیدار زور کے یہاں ایک آتش شعلہ بن گیا ہے۔ جس کی دھیمی دھیمی آنچ میں ان کے جذبات شعر کے سانچے میں ڈھل کر ان کے اس شوق کی ترجمانی کچھ یوں کرتے ہیں۔

کبھی تو ایک جھلک سی دکھایئے ہم کو
ابھی تک آس لگائے ہیں انتظار میں

اور جب عاشق کے اصرار پر محبوب کبھی ملاقات کے لیے رضامند ہو بھی جاتا ہے تو ملاقات سے پہلے انتظار کی جو گھڑی ہوتی ہے وہ کس قدر جان لیوا ہوتی ہے یہ ایک طرح کی اضطراری کیفیت ہوتی ہے طرح طرح کے خیالات اس کے ذہن میں آتے رہتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی محبوب کے آنے نہ آنے کے اندیشے بھی اس کو ستاتے رہتے ہیں اس کی بے لاگ تصویر زور کے اس شعر میں دیکھ سکتے ہیں۔

جی جی کے انتظار میں مرتے رہیں ہیں ہم
آخر وہ آتے آتے نہ آئیں تو کیا کریں

اتنا ہی نہیں محبوب سے ملاقات کے وقت ایک عاشق کی جو دلی کیفیت ہوتی ہے اس کا اظہار بھی زور کے یہاں ملتا ہے۔ ان کے کچھ شعر ایسے ہیں جو اس کیفیت کو تمام تر سچائیوں کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ملاقات کے ان لمحات میں محبوب کی ایک ایک ادا عاشق کے جذبات کو کس طرح سے بھڑکاتی ہے اس تعلق سے زور کا یہ شعر دیکھیے۔

وہ ناز و ادا میں سرگرمی سو رنگ سے جب دکھلاتے ہیں
جذبات کو لے کر پہلو میں سرگرم وفا ہو جاتا ہوں

ہر عاشق کی یہ آرزو ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ معشوق کی توجہ کا مرکز بنا رہے اور محبوب کی اسی توجہ اور محبت کی طلب کی حسرت زور کے یہاں اتنا زور پکڑ لیتی ہے کہ انھیں اس بات پر زور دے کر کہنا پڑتا ہے کہ

ایک نگاہ غلط انداز سہی دیکھ تو لیں
آپ کے چاہنے والوں میں یہاں ہیں کچھ لوگ

لیکن لاکھ کوششوں کے باوجود بھی لگتا ہے کہ شاعر کو عشق میں ناکامی ہی ہاتھ لگتی ہے اور انھیں محبوب کے در سے نامراد اور خالی ہاتھ لوٹنا پڑتا ہے۔ محبوب کی اس بے اعتنائی اور بے وفائی سے وہ ٹوٹ جاتے ہیں ان کا یہ درد بھی شکوہ

بن کر لبوں پر آتا ہے تو کبھی اپنی اس کیفیت پر وہ خود سے نالاں نظر آتے ہیں۔اس سلسلے سے دو شعر دیکھیں جو ان کی ان دونوں ہی طرح کی کیفیات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

وہ بزم غیر میں جھوٹے فسانے
انھیں یاد آئے گی میری وفا کیا؟
تیرے در پر جو آیا پھر نہ اٹھا
یہی دنیا میں تھا اک آسرا کیا؟

عشق کی یہ ناکامی اور نامرادی زور کو توڑ کر رکھ دیتی ہے لیکن یہ بھی تو کہا جاتا ہے کہ جب زخم حد سے بڑھ جاتا ہے تو دوا بن جاتا ہے ایسا ہی کچھ زور کے ساتھ بھی ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور اس کے بعد ان کے قلب سے جو صدا نکلتی ہے وہ دیگر عاشقوں کے لیے نصیحت کا کام کرتی ہے۔زور یہ نہیں چاہتے ہیں کہ کوئی اور عشق میں گرفتار ہو کر مصیبتوں کو مول لے اس لیے وہ کہتے ہیں کہ۔

یہ راہ سوچ سمجھ کر ہی اختیار کریں
وہ سوئے دار چلے ہیں جو کوئے یار میں ہیں

غم جاناں کے بعد غم دوراں کی تپش نے زور کو تجربات و مشاہدات کی آگ میں جھلسا کر کندن بنا دیا تھا اس لیے وہ کبھی فلسفۂ حیات کی بات کرنے لگے تو کبھی دنیا کی بے ثباتی کا اظہار اور کبھی فکر روزگار نے انھیں اس طرح آ لیا کہ مجبوراً انھیں کہنا پڑا۔

اچھا نہیں شکوہ شام و سحر مگر
افکار روزگار ستائیں تو کیا کریں

یہ مثل ہے کہ جب مصیبتیں آتی ہیں تو ہر طرف سے آتی ہیں شاید کہ زور کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔غم جاناں نے تو انھیں پریشان کیا ہی تھا بچی کھچی کسر غم دوراں نے پوری کر دی تھی۔اس طرح زور نے زندگی کے اتنے رنگ دیکھے کہ زندگی ہی پر ان کا بھروسہ نہ رہا ایسے موقعے پر ان کے اشعار دنیا اور ہستی کی بے ثباتی کا اظہار کرتے ہیں۔

ٹوٹے جو روز سر پر بلائیں تو کیا کریں
وہ بھی ہنسا ہنسا کر رلائیں تو کیا کریں
ہر دم نئے نئے یہ دکھاتی ہے شعبدے
ہستی کا پھر فریب نہ کھائیں تو کیا کریں

اے زور نہ کر راحت کی ہوس دنیا ہے یہ سب دھوکہ کی جگہ
چشمہ بھی سراب آتا ہے نظر جب پیاس بجھانے جاتا ہوں

حیرت کی بات یہ ہے کہ غم جاناں اور غم دوراں دونوں نے مل کر بھی زور کو دنیا و جہاں سے بے خبر نہ ہونے دیا ایسے کڑے وقت میں بھی انھوں نے ایک مصلح کی طرح سماج اور معاشرے کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور لوگوں کو انسان دوستی، محبت اور آپسی بھائی چارگی کا سبق سکھایا، دلوں میں کدورت اور بغض جگہ نہ لیں اس کے لیے اخلاقی درس دیا اس تعلق سے انھوں نے جو اشعار کہے ہیں وہ آفاقیت لیے ہوئے ہیں مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ کریں۔

ہم نے سیکھا ہی نہیں آپ کی چاہت کے سوا
کام آیا نہیں دنیا میں محبت کے سوا
دل ہو بیدار تو انسان سمجھ سکتا ہے
قوتیں اور بھی ہیں دولت و ثروت کے سوا

زور کو غریب اور محنت کش لوگوں سے بلا کا لگاؤ تھا اور ان کے ناگفتہ بہ حالات انھیں دیکھے نہیں جاتے تھے یعنی کہ زور ایک دردمند دل رکھتے تھے۔وہ دوسرے اور خاص کر غریب اور کسان طبقے کی حالت پر افسوس کا اظہار بھی کرتے ہیں جو انسان دوستی کی بہترین مثال ہے شعر دیکھیں کہ۔

کیا ستم ہے وہی بے نام و نشاں رہتے ہیں
جن غریبوں کے پسینوں سے نکھرتی ہیں زمیں

زور اخلاقی قدروں اور تہذیب کے پاسدار بھی تھے۔وہ دور اندیش بھی۔روزانہ کی مصروفیات نے آپسی رشتوں کی محبت کو اثر انداز کیا ہے آئے دن ہونے والی اخلاقی قدروں میں گراوٹ، محبت و بھائی چارگی کی کمی، جدید تہذیب کے نقصانات کو دیکھتے ہوئے انھوں نے اس وقت ہی اس پایے کے اشعار کہے تھے جو آج بھی فٹ بیٹھتے ہیں۔وہ یوں کہ شعر دیکھیں۔

ہنوز ایسے بھی انسان روزگار میں ہیں
کبھی سحر کے کبھی شب کے اعتبار میں ہیں

تو کبھی نالاں ہو کر یوں بھی کہا ہے کہ۔

انسان مر چکا ہے مشینوں کا دور ہے
اب کیا کسی کو زہر کہ، امرت پلایئے

اتنا ہی نہیں زور امن کے بھی پیامبر تھے۔وہ تمام عالم میں امن کے خواہاں نظر آتے ہیں۔

زور نے اپنی زندگی میں لاکھ مصیبتوں کا سامنا کیا لیکن ایسے کٹھن اور کڑے وقت میں بھی انھوں نے اپنا حوصلہ نہیں کھویا اور نا ہی کبھی ناامیدی کا شکار ہوئے یہی وجہ ہے کہ ہمیں ان کے اشعار میں بھی یہی امید دکھائی دیتی ہے۔وہ لوگوں کو پرعزم، ہمت و حوصلہ سے لبریز اور کسی بھی حال میں امید کا دامن نہ چھوڑنے اس کے ساتھ ہی جہد مسلسل کی ترغیب دیتے ہیں۔اشعار دیکھیے۔

اپنی تقدیر بنتی ہے تدبیر سے
اب نہ دشمن کا ڈھونڈوں کرم ساتھیو
ولولے دل کے مگر سرد نہ ہونے پائے
مضمحل ہو کے بھی جذبات نہ سونے پائے

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ زور کی ان غزلوں میں موضوعات کا اس قدر تنوع ہے جس کی بنا پر اگر ہم کہیں کہ ان کی یہ 16 غزلیں ایک مکمل دیوان ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

موضوع کے ساتھ ساتھ اگر ہم ان کے فن پر نظر ڈالیں تو یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ زور نے اپنی غزلوں کے اکثر اشعار میں متضاد الفاظ کو لانے کی سعی کی ہے بلکہ کسی کسی غزل کے تو سبھی اشعار میں لفظوں کا یہ تضاد دیکھنے کو ملتا ہے۔ان کے اس طرح استعمال سے شعر کے ظاہری حسن کے ساتھ معنوی حسن میں بھی اضافہ ہوا ہے نمونے کے طور پر چند اشعار ملاحظہ کریں۔

آپ کے شوق میں جیتے ہی رہے مر مر کے
اور زمانے نے یہ سمجھا کہ یہ مر جائیں گے
فردا کے انتظار میں کٹتی ہے زندگی
بہتر ہے روز و شب کا پردہ نہ اٹھایئے

اسی طرح ان کے یہاں بے شمار تضاد الفاظ ملتے ہیں جیسے۔زہر امرت، شام و سحر، جینا مرنا، بننا بگڑنا، خزاں بہار، افسانہ حقیقت، بلند پست، خوشی غم، قید آزاد وغیرہ جن کی مدد سے زور نے اپنی غزلیہ دنیا کو سجا رکھا ہے۔کہیں کہیں یہ تضادات تکرار کی شکل بھی اختیار کر کے ایک طرح کی موسیقیت اور ترنم پیدا کرتے ہیں جس کو برتنے میں انھیں مہارت حاصل تھی۔شعر۔

انقلاب زمانہ ہے شاید یہی دیکھتے دیکھتے کیا سے کیا بن گئے
ہم جو بن بن کے بگڑتے تو بنے وہ بگڑتے بگڑتے خدا بن گئے

زور نے اپنے اشعار میں محاوروں کا بھی برمحل استعمال کیا ہے۔یہ محاورے ان کے اشعار میں اس طرح رچ بس گئے ہیں کہ شعر کے ظاہری حسن کو دوبالا کرنے کے ساتھ ساتھ انھیں معنی خیز بھی بناتے ہیں۔انھوں نے بڑے ہی سلیقے سے محاوروں کو اشعار کی قالب میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔اس تعلق سے یہ شعر دیکھیے۔

گنا کرتے ہو راتوں کو جو تارے
یہ آخر زور تم کو ہو گیا کیا؟

الغرض زور کی شاعری کا موضوعی اور فنی جائزہ لینے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ زور کو فن شاعری پر گرفت تھی اور وہ ایک اچھے شاعر تھے۔

افسوس کی بات ہے کہ ہمارے ناقدوں کی نظر اس طرف نہیں گئی ہے۔زور کو بحیثیت محقق، نقاد، ماہر لسانیات مان کر ان پر بہت کچھ لکھا گیا لیکن بحیثیت شاعر چند ایک مضمون کے علاوہ کچھ نہیں ملتا، مانا کہ زور نے شاعری کم کی لیکن ان کی یہ کم شاعری اتنی بھی کم تو نہیں تھی کہ اس پہلو سے انھیں یکسر نظر انداز کر دیا جائے۔

■

Zunera
Room No: 104, L.H.7, South Campus
University of Hyderabad - 500046
Mob.:9493011532
Email.: zuneraabrar2014@gmail.com

مصنف: عبیر السید
مترجم: محمد قطب الدین

عبیر السید مصر کے 'شرقیہ'گورنریٹ میں 1970میں پیداہوئیں. مصرمیں انگریزی زبان وادب میں گریجویٹ کی ڈگری لینے کے بعد اٹلی کی فلورنسا یونیورسٹی کا رخ کیاجہاں ترجمہ وکلچر کے علاوہ انگریزی،اطالوی اور عربی علوم لسانیات میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی. 1992میں مصر سے اٹلی ہجرت کرگئیں.

عبیر السید، مصری رائٹرس یونین کی ایک سرگرم ممبر ہونے کے ساتھ ساتھ اٹلی کے مختلف تعلیمی،تربیتی،سماجی،فلاحی اور مہاجرین سے متعلق اداروں اور تنظیموں سے منسلک ہیں.وہ فلورنسا کے' مرکز برائے ثقافت وتخلیقات' کی بانی اور صدربھی ہیں.عربی زبان کے ساتھ ساتھ انگریزی اور اطالوی زبانوں پر بھی یکساں قدرت رکھتی ہیں

معاصرعربی افسانہ نگار خواتین میں عبیر السید کا نام نمایاں مقام رکھتا ہے.ان کی افسانوی تخلیقات مصرو بیرون مصرسے شائع ہونے والے عربی اخبارات و رسائل کی زینت بنتی ہیں.دیار غیر میں عرب مہاجرین کے مسائل اور ان کی تکالیف کو اپنے افسانوں کا موضوع بنانا ان کا امتیاز ہے.عبیر السید کے اہم افسانوی مجموعوں میں "الهروب من جنة آدم"، 'سورالیاسمین'، 'جدیجو و نافذة الأحلام' اور 'الارنب المشاغب 'قابل ذکر ہیں.پیش نظر کہانی ان کے اول الذکر افسانوی مجموعے سے ماخوذ ہے.

پردیسی

خوب صورت شہر کے بیچوں بیچ واقع مسجد میں عصر کی نماز ختم ہوچکی تھی۔ وسیع وعریض ہال کی شیشے والی چھت سے مسلسل بارش کی خوب صورت آواز آرہی تھی۔

وہاں پر خاموشی طاری تھی اور نمازی تسبیح پڑھ رہے تھے۔امام صاحب جوں ہی تسبیحات سے فارغ ہوئے۔ بعض نمازی اٹھ کر جلدی سے اپنے کام پر جانے لگے۔ (اچانک) ٹیلی فون کی ایک آواز نے خاموشی توڑدی۔ ایک ملازم دوڑ کر گیااور ریسیور اٹھایا۔دوسری جانب سے بولنے والے کی آواز سن کر وہ سناٹے میں رہ گیا۔جب اوسان بحال ہوئے تو اس نے بتایا:حفاظتی دستے کا ایک اہل کار'عرب کمیونٹی' کو یہ اطلاع دے رہا ہے کہ ایک خاتون اور ایک نوجوان دونوں کی لاشیں میونسپلٹی کے ایک اسپتال میں ہیں۔ان کے پاس سے کوئی عربی شناختی کارڈ برآمد ہوا ہے اگر'عرب کمیونٹی' کو اس کی پروا ہے تو کسی کو وہاں بھیجے تاکہ شناخت کرکے لازمی کارروائیاں کی جائیں۔ورنہ چند روز بعد اسپتال کے دستور کے مطابق لاشوں کو نذر آتش کردیا جائے گا۔

وہاں پر موجود تمام لوگ اس خاتون کے بارے میں ایک دوسرے سے پوچھنے لگے۔اس کی شہریت کا پتا لگانے لگے اور اس نوجوان کے بارے میں بھی تفتیش کرنے لگے۔معاً ہرطرف رونے دھونے اور چیخ وپکار کا سلسلہ شروع ہوگیا۔موقع غنیمت جان کر امام صاحب مسجد میں موجود لوگوں کو وعظ سنانے کے لیے کھڑے ہوگئے۔ گویا ان لوگوں کی تقدیر میں پند ونصیحت کے سوا کچھ اور نہ تھا۔امام صاحب کی تقریر شروع ہوئی اور تمام حاضرین کو اسلامی قبرستان کے لیے زمین خریدنے پر ابھارتے رہے۔اپنی تقریر کے دوران انھوں نے کہا کہ ہمیں ایک ایسی تنظیم بنانے کی ضرورت ہے جو لاوارث لاشوں کو ان کے ورثا تک پہنچانے کا اہتمام کرے۔اخیر میں متوفین کے لیے دعائے مغفرت کی گئی۔بعدازاں سب لوگ رخصت ہوگئے۔موسلا دھار بارش نے غم وافسوس کے ماحول کو یکسر تبدیل کردیا۔

اسپتال کا پتا اور کمرہ نمبر لے کر میں نے بڑی مشکل سے گھر واپس جانے کا فیصلہ کیااور اگلی صبح ان بدنصیب لاشوں کو دیکھنے کا عزم کیا۔شاید میں خاتون کو پہچان لوں،ممکن ہے وہ ان مہمان خواتین میں سے ہو جو نماز کے لیے مسجد آتی ہیں۔میرے ذہن میں بعض ان خواتین کی یادتازہ ہوگئی جو اچانک لاپتہ ہوگئی تھیں۔جب مجھے ان عورتوں کی گمشدگی کا علم ہوا،پھر میں نے ان کے بارے میں مزید استفسار کیا تو مجھے سخت صدمہ پہنچا۔ان کے جاننے والوں نے ان کی وفات کی خبر سنائی،پردیس میں ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔بسا اوقات کئی دن،مہینے اور سال گزرجاتے ہیں مگر پردیسی کا حال چال کوئی نہیں پوچھتا۔

ہمیشہ کی طرح رات گزرگئی اور اس حادثے کا مجھ پر کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا۔صبح ہوتے ہی میں جلدی جلدی اسپتال گئی۔وہاں میں نے اس خاتون کو دیکھا اور پہچان لیا۔ہائے بے چاری!یہ تو وہی عورت ہے جو ابھی کچھ دنوں پہلے تک ایک سخت قسم کے مرض میں مبتلا تھی۔ اسپتال سے باہر آنے کے بعد اس کی کوئی خبر نہیں تھی۔ مجھے کسی عورت نے بتایا تھا کہ وہ کسی بڑی مصیبت سے دوچار ہے۔وہ ہمیشہ اپنے لاپتہ نوجوان بیٹے کی تلاش میں یہاں وہاں بھٹکتی پھری جو ملنے کے بعد پھر لاپتا ہوجاتا۔ ممکن ہے یہ وہی نوجوان ہو جس کی لاش اس عورت کے

برابر والے بیڈ پر ہے۔

کتنا بڑا اور المناک حادثہ ہے! میں اس لاچار عورت کی کہانی میں ڈوب گئی اور خود کو جی بھر کر کوسا کیوں کہ کئی مہینوں سے میں نے اس کی کوئی خبر نہ لی تھی۔

یہ لو! یہ تو وہی اداس چہرے والی عورت ہے جس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔ میں اس کی کمزوری دیکھ کر حیران رہ گئی کیوں کہ وہ پہلے اتنی کمزور نہیں تھی۔ اس کے سر پر سرخ پٹی کیوں ہے؟ میں نوجوان کے چہرے کو زیادہ دیر تک نہیں دیکھ سکی۔ اس کی پیشانی پر ان تمام پریشانیوں کے آثار نمایاں تھے، جن کو وہ بیس سال کی عمر میں جھیل رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر سب تحریر تھا۔

میں نے اپنی دونوں آنکھیں بند کرلیں جو افسوس کے آنسوؤں سے بھر چکی تھیں اور ان لوگوں کو بتایا کہ میں نے خاتون اور نوجوان دونوں کی شناخت کرلی ہے۔ میں انتہائی خاموشی سے بیٹھ گئی اور انتظار کرنے لگی کہ کوئی 'اسلامک سینٹر' سے آئے۔ امام صاحب آئیں اور ان کے ہمراہ کوئی خاتون آئے تاکہ ان دونوں کو عرب مسلمانوں کے لیے میونسپلٹی کی جانب سے مختص کیے گئے قبرستان میں

عورت جلدی جلدی بس سے نیچے اتری۔وہ اس طرح گھبرائی ہوئی ہانپ رہی تھی جیسے کوئی ڈوبنے والا پانی سے نکلا ہو۔اسی حالت میں وہ تھوڑی دور تک چلتی رہی تاکہ کوئی اسے پتہ بتادے۔ابھی صبح کے سات بجے تھے۔اتوار کا دن تھا،چھٹی کا دن ہونے کے باعث شاید ہی سڑک پر اسے کوئی ملتا۔وہ ایک شراب خانے میں داخل ہوئی اور وہاں موجود لوگوں سے پتہ پوچھا۔ایک ملازم نے فلورنسا(اٹلی کا ایک شہر) کے نامانوس 'فیورینتینا لہجے' میں اس جگہ کا پتہ بتایاجسے وہ تھوڑا بہت سمجھ پائی۔

تدفین کے واسطے درخواست دی جائے۔ (میں سوچنے لگی) اگر آپ خوش قسمت ہیں تو آپ کی لاش یہاں دفن ہوجائے گی اور اگر آپ کا کوئی خیر خواہ نہیں ہے تو خدا جانے انجام کیا ہوگا۔

میں قہوے والی مشین کے پاس گئی اور ایک پیالی قہوہ لے کر اس کی چسکیاں لیتے ہوئے انتظار کرنے لگی۔ ان دونوں کے ساتھ ہونے والے حادثے کے متعلق سوچ سوچ کر میں تھک چکی تھی۔ گھڑی کی سوئیاں جیسے رُک گئی تھیں اور عورت کو اپنے لختِ جگر سے ملنے کے اشتیاق میں رکاوٹ بن رہی تھیں۔ وہ عورت بس میں سوار کھڑکی کے باہر پریشانی اور مایوسی سے دیکھ رہی تھی۔ کھڑکی کا شیشہ لوگوں کی سانسوں کے بخارات کے باعث ڈھک چکا تھا۔ کھڑکی بند ہونے کے باعث سانسیں اندر ہی گھٹ رہی تھیں اور تمام مسافروں کو ان کی مرضی کے خلاف ناقابل برداشت تکلیف میں مبتلا کررہی تھیں، سب لوگ تکلیف محسوس کررہے تھے اور خاموش تھے۔ ماں اپنے بیٹے کی گمشدگی کے رنج اور تکلیف کو یاد کرنے لگی اور ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔

ہم میں سے کس نے کسی کو کھونے کا کڑوا مزہ نہیں چکھا ہے؟ عورت کے لرزتے ہونٹوں سے ایک گہری سانس آزاد ہوئی۔ اس کی پریشان نگاہیں کسی ایک جگہ نہیں ٹھہر رہی تھیں۔ اسے ان مقامات سے کوئی مطلب نہ تھا کیوں کہ اس شہر میں نہ تو وہ کسی سے آشنا تھی اور نہ کوئی اسے جانتا تھا۔ وہ ایک اجنبی اور پردیسی تھی۔ حالاں کہ کئی سال پہلے وہ یہاں آئی تھی۔ وہ پردیسی تھی باوجودیکہ اتھارٹی نے اسے یوروپی شہریت کا کارڈ دے دیا تھا۔ وہ ایک ایسی پردیسی تھی جس کے شوہر کا جب انتقال ہوا تو اس نے شوہر کے جسدِ خاکی کو اپنے وطن لانے میں بہت تکلیفیں برداشت کی تھیں اور بہت سارا مال بھی خرچ کیا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ بچا تھا وہ چند ماہ کے گزارے کے لیے ناکافی تھا۔ چنانچہ وہ خرچ کی غرض سے پیسے جٹانے کے لیے جدوجہد کرنے لگی۔ اس کا بیٹا تعلیم کا سلسلہ منقطع کرکے ماں کے ساتھ کام کرنے پر مصر تھا۔ اچانک زندگی نے ایک نیا موڑ لیا جیسے اس نے ان سے منہ پھیر لیا ہو اور اسی کے ساتھ بیٹا بھی بدل گیا... وہ بس ڈرائیور کی آواز پر چونک گئی۔ ڈرائیور نے بتایا کہ بس اپنے آخری اسٹینڈ پر پہنچ چکی ہے۔

عورت جلدی جلدی بس سے نیچے اتری۔ وہ اس طرح گھبرائی ہوئی ہانپ رہی تھی جیسے کوئی ڈوبنے والا پانی سے نکلا ہو۔ اسی حالت میں وہ تھوڑی دور تک چلتی رہی تاکہ کوئی اسے پتہ بتادے۔ ابھی صبح کے سات بجے تھے۔ اتوار کا دن تھا، چھٹی کا دن ہونے کے باعث شاید ہی سڑک پر اسے کوئی ملتا۔ وہ ایک شراب خانے میں داخل ہوئی اور وہاں موجود لوگوں سے پتہ پوچھا۔ ایک ملازم نے فلورنسا (اٹلی کا ایک شہر) کے نامانوس 'فیورینتینا لہجے' میں اس جگہ کا پتہ بتایا جسے وہ تھوڑا بہت سمجھ پائی۔

وہ چلتی رہی اور کاغذ پر لکھے اسپتال کا پتہ تلاش کرتی رہی۔ عموماً اس ملک میں شہروں کے باہر موجود آثارِ قدیمہ

ہم میں سے کس نے کسی کو کھونے کا کڑوا مزہ نہیں چکھا ہے؟عورت کے لرزتے ہونٹوں سے ایک گہری سانس آزاد ہوئی۔اس کی پریشان نگاہیں کسی ایک جگہ نہیں ٹھہر رہی تھیں۔اسے ان مقامات سے کوئی مطلب نہ تھا کیوں کہ اس شہر میں نہ تو وہ کسی سے آشنا تھی اور نہ کوئی اسے جانتا تھا۔وہ ایک اجنبی اور پردیسی تھی۔

اور بڑے بڑے محلات اسپتالوں میں تبدیل کردیے گئے تھے جو شہر کے شور و ہنگامے سے دور پرسکون ماحول میں درختوں کے بیچ چھپے ہوئے تھے۔ اپنی تمام تکالیف کو بھلا کر وہ اسپتال جلدی سے پہنچ جانا چاہتی تھی۔ وہ کافی عرصے تک بیمار بھی رہ چکی تھی اور اب بھی بہت کمزور تھی۔ تنہائی میں بار بار چیخ کر اس نے آوازیں لگائیں مگر انھیں اللہ کے سوا کسی اور نے نہیں سنا۔ اس نے اپنا سر دیوار سے ٹکرادیا۔ اس کا بیٹا اس کے سامنے ہی تھا، وہ اسے تلاش کرتے ہوئے اس کے پاس سے ہی گزری تھی مگر پہچان نہ سکی۔ ریلوے اسٹیشن کو جانے والے فلائی اوور کے نیچے وسیع و عریض پلیٹ فارم کے پاس وہ ساری دنیا سے بے گانہ حالت میں پڑا تھا اور کپڑوں کے ایک ڈھیر کے نیچے دبا ہوا تھا۔ وہ عورت بیٹے کے بوسیدہ کپڑوں اور بڑھی ہوئی داڑھی کو پہچان نہ سکی تھی۔ کیوں کہ ایسی شکل میں کبھی بھی اس نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ نہ ایسی فضا سے اس عورت کا کبھی واسطہ پڑا جس میں گاڑیوں اور راہ گیروں کی سگریٹوں کا دھواں اور سستی شراب کی بو کی آمیزش تھی۔ ہر جگہ پیشاب کی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ کمزوری اور نقاہت نے نوجوان کی خوب صورت شکل بگاڑ کر رکھ دی تھی۔ بھوک نے اس کے جسم کو گھلا دیا تھا۔ اپنے جیسے نہ جانے کتنے لوگوں کی طرح وہ بھی ادھر ادھر بھٹکتا پھر رہا تھا۔ وہ خاتون بھی دوسرے لوگوں کی طرح ان بھٹکنے والے لوگوں کے پاس سے گزرنا پسند نہیں کرتی تھی کیونکہ لوگ انھیں بے کار اور آوارہ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ وہ ہمارے ہی سماج کا ایک دوسرا چہرہ ہیں۔ جس معاشرے میں محتاجوں اور بے کار لوگوں کی کثرت ہو سمجھ لینا چاہیے کہ اس سماج میں برائی اچھائی پر غالب ہے۔ کچھ رحم دل انسان جو ان محتاجوں کے آگے چھوٹے سکے پھینک دیتے ہیں، اس سے وہ اپنی جان لیوا بھوک کی تھوڑی مقدار کم کرلیتے ہیں۔

عورت نے اپنے بیٹے کو نہیں پہچانا۔ اس نے اپنا سر دیوار سے ٹکرالیا۔ وہ مرنا ہی چاہتی تھی مگر موت نے

انکار کردیا۔ موت اس پر اتنی مہربان نہ تھی جتنا اس کا بیٹا اس پر مہربان تھا۔

اپنے جگر کے ٹکڑے کو وہ پہچان نہیں پائی۔ اس کی گمشدگی پر جی بھر کر روئی۔ ٹیلی فون پر اس نے کئی بار رحم کی بھیک مانگی مگر وہ ہر بار انکار کرتا رہا۔ شاید وہ ڈر رہا تھا کہ ماں کہیں اس کا شکست خوردہ چہرہ، کمزور اور شکستہ جان نہ دیکھ لے، جو بے جڑ والے پودے کی مانند ہو چکی تھی۔

ایک پڑوسن نے اس کی چیخ سن لی اور ایمبولنس بلالی۔ بڑی مشکل سے دروازہ کھولا گیا۔ عورت پرانی یادو ں میں ڈوب چکی تھی۔ وہ اپنے بیٹے کے جنم دن کے موقع پر ان بچوں کی ہنسی کو یاد کررہی تھی جو یکے بعد دیگرے دروازہ کھٹکھٹاتے تھے۔ اس نے اپنے شوہر کی آواز سنی جو بیٹے کا پسندیدہ چاکلیٹ لے کر آئے تھے۔ اس نے بچوں کی ہنسی بھی سنی تھی جو رنگین غبارے اڑاتے تھے اور جنم دن کا گانا بھی گاتے تھے۔

عورت ایمبولنس والوں کی بات نہیں سن پارہی تھی۔ وہ اسے آرام کرنے کے لیے کہہ رہے تھے۔ کیو ں کہ اس کا بہت سارا خون بہہ چکا تھا۔ ان لوگوں نے یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ کسی کو اپنے ساتھ رہنے کے لیے بلا لے۔ شاید اسے بخار چڑھ آیا ہے۔ معاً ہی انھوں نے عورت کو چھوٹی چھوٹی گولیاں دیں اور پھر واپس چلے آئے۔ ابھی بھی وہ بچوں کا گانا سن رہی تھی۔ عورت نے اس چاندی کی چین کو یاد کیا جو اس نے اپنے بیٹے کو پہنائی تھی۔ اس کی پریشانی عود کر آئی، اس نے دواؤں کو ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ بڑی مشکل سے چھوٹی الماری کے پاس گئی۔ اس میں سے ایک رنگین تھیلا نکالا۔ کچھ دیر تک وہ اسے غور سے دیکھتی رہی۔ اس میں شیر خوار بچے کے کپڑے تھے۔ انھیں اپنے ہاتھ میں لے کر سینے سے لگائے رہی اور اُسی عالم میں وہیں سوگئی۔

صبح ہوتے ہی اس عورت نے اپنے سر کو ایک بڑے سے اسکارف سے ڈھانپ لیا تاکہ سر پر بندھی میلی پٹی چھپ جائے۔ اس کے سر کے زخم سے ابھی تک خون رس رہا تھا۔ پورے دن تکلیف میں رہی اور شدت غم سے اس کا دل پھٹا جارہا تھا۔ عورت کو وہ منحوس فون یاد آیا جو اس نے کل ریسیو کیا تھا۔ ایک نامعلوم شخص نے اسے بتایا تھا کہ ریلوے اسٹیشن کے پاس ایک بے ہوش نوجوان ملا تھا اور جب وہ ہوش میں آیا تو اس نے اپنی ماں سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ نیز یہ کہ وہ نوجوان چند مہینوں سے وہیں رہ رہا تھا اور اب اسے اسپتال منتقل کردیا گیا ہے۔

عورت اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکی۔ یہ وہی بوڑھا

صبح ہوتے ہی اس عورت نے اپنے سر کو ایک بڑے سے اسکارف سے ڈھانپ لیا تاکہ سر پر بندھی میلی پٹی چھپ جائے۔ اس کے سر کے زخم سے ابھی تک خون رس رہا تھا۔ پورے دن تکلیف میں رہی اور شدت غم سے اس کا دل پھٹا جارہا تھا۔ عورت کو وہ منحوس فون یاد آیا جو اس نے کل ریسیو کیا تھا۔ ایک نامعلوم شخص نے اسے بتایا تھا کہ ریلوے اسٹیشن کے پاس ایک بے ہوش نوجوان ملا تھا اور جب وہ ہوش میں آیا تو اس نے اپنی ماں سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ نیز یہ کہ وہ نوجوان چند مہینوں سے وہیں رہ رہا تھا اور اب اسے اسپتال منتقل کردیا گیا ہے۔

نوجوان تھا جو اسے راستے میں بار بار دیکھتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس نوجوان کو ماں کے دل نے پہچان لیا تھا مگر اس کی عقل نے انکار کیا تھا۔ وہ اپنا سر دیوار سے مارنے لگی۔ جیسے وہ اس عقل کو ہی ختم کردینا چاہتی ہو جس نے اس کے جگر گوشہ کو پہچاننے سے انکار کردیا تھا۔ ماں نے بیٹے کی پسندیدہ مٹھائی تھیلے میں رکھی۔ گھر کے دروازے کو آہستہ سے بند کیا جس میں وہ اکیلی رہتی تھی۔ راستے میں اس نے بیٹے کے بچپن کے اسکول کی طرف غمگین نگاہوں سے دیکھا، اسے اسکول کے وسیع وعریض میدان میں بیٹے کے دوڑنے کی آوازیں آئیں۔ اب وہ بچہ بڑا ہوگیا تھا اور ہر چیز بڑی ہوچکی تھی۔ ان دونوں کے بیچ کی خلیج اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ وہ جان لیوا اور گہری ہوچکی تھی۔ بالخصوص شوہر کے انتقال کے بعد۔ وہ ہر چیز سے انکار کرتا تھا۔ کوئی تشخص نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنی دنیا اور جڑوں سے دور چلا گیا۔ وہ ایک ایسے بیمار پودے کی طرح ہوچکا تھا جس کی جڑ کمزور ہوگئی ہو۔ اس کے لیے ماں کی شفقت بھی اس حد تک سنگ دلی اور انکار میں تبدیل ہوچکی تھی کہ ہر دن اسے اپنی ماں سے دور بھاگنے پر آمادہ کرتی۔

عورت اسپتال کے مین گیٹ کے پاس گئی۔ ہاتھ میں لیے فوٹو میں اس نے دیکھا تو یہ وہی گیٹ تھا۔ اس نے بیل بجائی۔ چوکیدار نے اس کے لیے گیٹ کھول دیا اور اندر جانے والی راہ داری کی رونمائی کی۔ سب سے پہلے اس عورت کا جس آدمی سے سامنا ہوا اس سے پوچھا تو اس نے اس کمرے تک پہنچادیا۔ عورت نے کمرے میں ایک بیڈ کے پاس ڈاکٹر کو موجود پایا۔ اس کے سامنے مریض کی تفاصیل والی ایک تختی تھی۔ ڈاکٹر خاتون کو دیکھ کر اس سے مخاطب ہوا اور بولا:

''محترمہ! آپ خود پر قابو رکھیں، یہ نوجوان بہت ہی زیادہ بیمار ہے۔ اس کا کمزور جسم منشیات اور شراب سے لڑ رہا ہے۔ اسے نیند کے بہت زیادہ ڈوز دیے گئے ہیں، تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ سو سکے۔ میں مانتا ہوں کہ بیٹے کے لیے آپ کا دل تپ رہا ہوگا۔''

خاتون نے اپنے آپ پر قابو پانے اور خود کو یقین دلانے کی بھرپور کوشش کی کہ اس کا بیٹا بیڈ پر آرام کررہا ہے۔ اس کا پردیسی بیٹا نہایت ذہین تھا۔ جب بھی کوئی اس سے اس کے ملک کے بارے میں پوچھتا، تو وہ گہری سوچ میں پڑ جاتا۔ کبھی اس ملک کا نام لیتا تو کبھی اس ملک کا اور بسا اوقات دو ملکوں کو ایک ساتھ ملا دیتا۔

خاتون بیڈ پر پڑے کمزور نوجوان کے قریب گئی جو اس کا پیارا بیٹا تھا، مسکراتا چہرہ اور عربی خدوخال والا۔ اسے دیکھ کر عورت کا دل پھٹ پڑا اور اس کا وجود ختم ہونے لگا۔ اس نے بیٹے کا چہرہ اپنے ہاتھ میں لیا اور اس کو ٹٹولنے لگی، اس کی روح اس طرح پرواز کررہی تھی جیسے کوئی درخت جڑ سے اکھڑ رہا ہو۔ عورت نے قرآن شریف کی آیتوں کا ورد شروع کردیا، اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ اس بار یادداشت ساتھ نہیں دے رہی تھی چنانچہ کچھ آیتیں پڑھتی تو کچھ بھول جاتی۔ بیٹے کی آنکھ سے آنسو ٹپکنے لگا۔ جس نے ماں کے ہاتھ کو تر کردیا۔ اس کے گلے میں اب تک چاندی کی وہ چین موجود تھی جو ماں نے اس کے جنم دن کے موقع پر گفٹ کی تھی۔ ماں اسے گود میں لینا چاہتی تھی۔ وہ اس کے اور قریب آئی اور اپنے بے جان جسم کو بیٹے کے پہلو میں ڈال دیا۔ بیٹے نے ماں کے وجود کو محسوس کیا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ماں سوگئی اور اسے وقت کا کچھ پتہ نہ چلا۔

صبح جب نرس مریض کو دوا کھلانے آئی تو فوراً بھاگ کر اپنے ایک ساتھی کے پاس گئی اور انتہائی افسوس ناک لہجے میں اسے بتایا کہ مراکشی نوجوان جو سانس نہیں لے پارہا ہے، اس کے کمرے میں ایک خاتون خون میں لت پت پڑی ہے۔ کہیں وہ اس کی ماں تو نہیں؟

اسپتال کا ڈائریکٹر اپنے عملے کے ساتھ وہاں پہنچا، لاش کو مردہ گھر منتقل کرنے کا حکم دیا اور 'عرب کمیونٹی' سے رابطہ کرنے کے احکامات دیے۔

موت کا یہ حادثہ ساحلوں پر موت کو گلے لگانے والوں کی تعداد میں محض ایک اضافہ تھا یا ایک قربانی تھی جسے ہجرت کے خوابوں نے زندگی کے تلاطم خیز سمندر کی نذر کردیا تھا۔

■

Dr. Mohd Qutbuddin
Associate Professor, JNU
New Delhi - 110067
Email.: basmaqutub@gmail.com

سوال نامہ برائے انٹرویو

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کردی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورت حال سے آگاہ ہوسکیں۔

س: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟

س: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟

س: زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟

س: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟

س: کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟

س: موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟

س: کیا اردو کا چہرہ مسخ ہو رہا ہے؟ کیا اردو کی شکل بگڑ رہی ہے؟

س: اردو کا مستقبل کیا ہے؟

س: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟

س: کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟

س: کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟

س: آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟

س: آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟

س: آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟

س: آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟

س: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کیا جاسکتی ہیں؟

س: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟

س: کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟

س: آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟

س: غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟

س: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟

س: سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورت حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in

تبصرہ وتعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ھی کی ایك شكل ھے جس میں كتاب كے مواد، اسلوب اور معیار كا تجزیہ كیا جاتا ھے۔ كتاب كے ماله وما علیه اور دیگر جزئیا ت كے حوالے سے قارئین كو بھت قیمتی معلومات عطا كی جاتی ھیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری كی ایك مضبوط اور مستحكم روایت رھی ھے، خاص طور پر قدیم مجلات نے مطبوعات جدیدہ كے تعارف كا جو سلسله قائم كیا تھا وہ بھت ھی مفید تھا۔ تبصرہ بھت ذمے داری كا كام ھے اس لیے مبصرین كو چاھیے كه وہ كتابوں كے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق كا ثبوت دیں اور تبصرہ كرتے وقت غیرضروری تمھید، افراط و تفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز كركے كتاب كے اھم اور افادی نكات كی نشاندھی كریں۔ اردو كے علاوہ انگریزی، ھندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان و ادب سے متعلق جو كتابیں شائع ھوتی ھیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بھتر ھوگا۔

كلیات جوش (جلددوم)

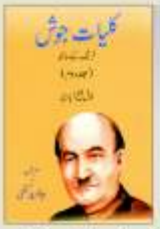

شاعر: جوش ملیح آبادی، مرتب: جاوید نسیمی
صفحات: 974، قیمت: 450
ناشر: قومی كونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی
مبصر: عشرت جہاں، محلّہ ٹنڈولہ، ٹانڈہ، رامپور، یوپی

جوش ملیح آبادی اردو كے معروف شاعر گزرے ھیں۔ ان كی شاعری میں مختلف اصناف مثلاً غزل، نظم، رباعی، مرثیہ وغیرہ شامل ھیں۔ چونكہ جوش ملیح آبادی كا كلام گوناگوں خصوصیات كا حامل ہے، اس لیے ان كے كلام كو پسند كرنے والوں كی بڑی تعداد ان كے اپنے عہد میں بھی تھی اور آج بھی ہے۔ جوش ملیح آبادی كے كلام كے متعدد مجموعے منظر پر آئے۔ بعد میں ان مجموعوں میں شامل كلام كو یكجا كركے 'كلیات جوش ملیح آبادی' كے نام سے شائع كردیا گیا۔ كلیات جوش ملیح آبادی كا تازہ ترین ایڈیشن قومی كونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی نے شائع كیا ہے جسے جاوید نسیمی نے مرتب كیا ہے۔ اس سے پہلے 'كلیات جوش ملیح آبادی' كو ڈاكٹر عصمت ملیح آبادی نے مرتب كیا تھا اور فرید بك ڈپو نے اسے 2007 میں چھاپا تھا۔

جاوید نسیمی كے ذریعے مرتب كردہ كلیات جوش ملیح آبادی ڈاكٹر عصمت ملیح آبادی كے مرتب كردہ 'كلیات جوش ملیح آبادی' سے اس طور پر الگ ہے كہ اس میں مرتب نے فرہنگ كو بھی شامل كیا ہے، جس كے باعث اس كی افادیت میں اضافہ ھوگیا ہے۔ مرتب نے فرہنگ میں مشكل الفاظ كے معانی ومفاہیم پیش كیے ھیں۔ عمدہ بات یہ ہے كہ اس فرہنگ كو تیار كرتے وقت مرتب نے مستند لغات اور معتبر كتابوں كو سامنے ركھا ہے اور الفاظ كے معانی كی تلاش میں بڑی محنت كی ہے۔ اس فرہنگ كے حوالے سے خود مرتب لكھتے ھیں:

''راقم الحروف نے اس فرہنگ كی تیاری میں عربی، فارسی اور اردو كے مستند لغات كے ساتھ ساتھ تلمیحات اور كہاوت ومحاورات سے متعلق معتبر كتابوں سے استفادہ كیا ہے اور ہر لفظ كی اچھی طرح جانچ پڑتال كرنے كے بعد ھی اسے فرہنگ میں شامل كیا ہے۔ غیر ضروری طوالت سے بچتے ہوئے كسی تلمیح كو اس حد تك واضح كرنے كی كوشش كی ہے كہ جس سے پوری بات سمجھ میں آجائے۔ ساتھ ھی شاعر كی منشا كا بھی خیال ركھا ہے كہ وہ كسی تركیب یا تلمیح كے ذریعے كیا كہنا چاہتا ہے۔''

پیش نظر 'كلیات جوش ملیح آبادی' جلددوم میں جوش ملیح آبادی كے جن پانچ مجموعوں كے كلام كو شامل اشاعت كیا گیا ہے، ان كے نام اس طرح ھیں: فكر ونشاط، جنون وحكمت، حرف وحكایت، آیات ونغمات اور عرش وفرش۔ كتاب كے شروع میں قومی كونسل كے ڈائركٹر شیخ عقیل احمد كا لكھا ہوا 'پیش لفظ' ہے جس میں انھوں نے كتابوں كی اہمیت وافادیت اور اشاعت كے حوالے سے گفتگو كی ہے۔ اس كے بعد فہرست دی گئی ہے اور اس میں نظموں كے عنوانات درج كیے گئے ھیں تاكہ قارئین كسی كی بھی نظم كی تلاش آسانی سے كرسكیں۔ پھر مرتب نے اپنے تحریر كردہ دیباچے كو شامل اشاعت كیا ہے اور اس میں انھوں نے پیش نظر كلیات كے اختصاصات وامتیازات سے بحث كی ہے۔ جلددوم كی ترتیب كے وقت مرتب كو جس نوع كے مسائل كا سامنا كرنا پڑا، اس كا بھی انھوں نے تذكرہ كیا ہے اور جہاں شك وشبہ كی صورت سامنے آئی وہاں مرتب نے كافی تحقیق وجستجو سے كام لیا ہے اور متعدد كتب خانوں میں موجود جوش ملیح آبادی كے مطبوعہ كلام سے استفادہ كركے كسی نتیجے پر پہنچنے كی كوشش كی

ہے۔ پانچوں شعری مجموعوں کے کلام کو اس کلیات میں شامل کرنے کے بعد مرتب نے آخر میں فرہنگ کو پیش کیا ہے۔ فرہنگ میں مرتب نے اس بات کا التزام کیا ہے کہ پہلے مجموعے کی نظموں کو جس ترتیب سے رکھا ہے، اسی ترتیب کا فرہنگ میں بھی لحاظ کیا ہے۔ اس کے بعد ترتیب وار ہر نظم کے عنوان کے تحت اس میں موجود مشکل الفاظ کے معنی ومفہوم کو بیان کیا ہے۔ اس طرح اس کلیات میں شامل تمام نظموں کے مشکل الفاظ کے معانی ومفاہیم پیش کردیے گئے ہیں تاکہ قارئین کو کسی طرح کی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے اور وہ آسانی سے ہر مشکل لفظ کے معانی تلاش کرلیں۔ آخر میں مرتب نے ایک عنوان 'اشاریہ اسما' قائم کیا ہے جس کے تحت ان اسما کی وضاحت کی گئی ہے جو کلیات میں مختلف مقامات پر آئے ہیں۔

کہا جاسکتا ہے کہ اس کلیات کا سب سے افادی حصہ 'فرہنگ' ہے جس کو تیار کرنے میں مرتب نے عرق ریزی سے کام لیا ہے۔ یہ بات بڑے یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اس فرہنگ کی شمولیت کے بعد 'کلیات جوش ملیح آبادی' کی افادیت میں اور زیادہ اضافہ ہوگیا ہے۔ دراصل کلیات جوش ملیح آبادی میں فرہنگ کی واقعی ضرورت بھی محسوس کی جارہی تھی۔ کیونکہ جوش ملیح آبادی نے بھاری بھرکم الفاظ، محاورات، تلمیحات، استعارات اور ضرب الامثال وغیرہ کو اپنی شاعری میں بحسن وخوبی برتا ہے، مگر چونکہ موجودہ عہد کے قارئین کی استعداد میں گزشتہ دور کے معیار کے مقابلے میں انحطاط واقع ہوا ہے، اس لیے بہت سے الفاظ ان کی پہنچ سے باہر ہیں، ایسی صورت میں فرہنگ ان کے لیے نہایت سود مند ثابت ہوگی۔ یہ کلیات اردو ادب کے طلبا واساتذہ کے لیے نہایت اہم اور مفید ہے۔

تاریخ و تہذیب و ثقافت

مصنف: ڈاکٹر نریش

صفحات: 210، قیمت: 120 روپے، سنہ اشاعت: 2020

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: عبدالباری قاسمی، C-145/1 گراؤنڈ فلور طیب لین شاہین باغ، جامعہ نگر اوکھلا، نئی دہلی 25

ڈاکٹر نریش شاعر، ادیب، محقق اور دانشور کی حیثیت سے محتاج تعارف نہیں ہیں، انھیں ان کی علمی، ادبی اور تصنیفی خدمات کے اعتراف میں متعدد ریاستی، ملکی اور بین الاقوامی انعامات واعزازات سے بھی نوازا جاچکا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب 'تاریخ وتہذیب وثقافت' ان کے کالموں کا مجموعہ ہے، جسے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی نے شائع کیا ہے، اس میں تاریخ، معاشرت و سیاست، لسانیات، تصوف، مذاہب ہند، تاریخی مقامات، آزادی ہند، تعلیم وتدریس اور طب وصحت کے حوالے سے تقریباً سولہ مضامین شامل ہیں۔

ڈاکٹر نریش کا کمال ہے کہ خشک سے خشک تر موضوعات میں بھی طنزیہ اور مزاحیہ حکایات وواقعات کو شامل کرکے اسے خوب سے خوب تر بنا دیتے ہیں۔ اس کی وجہ سے قاری اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا دوسری خوبی ڈاکٹر نریش کی یہ ہے کہ معتدل مزاجی ان کی طبیعت میں ہے کوشش کرتے ہیں جو جیسا ہے اسی طرح بیان کیا جائے۔

پہلا مضمون 'تاریخ کے دامن سے' کے عنوان سے ہے، اس میں غلام خاندان، بلون خاندان، خلجی خاندان، تغلق خاندان، سید خاندان، لودھی خاندان، غزنوی اور غوری، مغلیہ سلاطین اور قدیم راجاؤں کے تعارف اور مختصر تاریخ کے ساتھ ساتھ اس عہد کی تہذیب وثقافت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس ایک مضمون میں کس قدر معلومات کو یکجا کردیا گیا ہے عناوین سے ہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

دوسرا مضمون 'بھاگیرتی سے گنگا' کے عنوان سے ہے، یہ مضمون بھی دلچسپ ہے، بھاگیرتی سے گنگا کیسے بنی؟ اور اس کے اردگرد کیا ہوتا ہے اسے بیان کرنے کے ساتھ ساتھ پنجاب، فرید کوٹ، بٹالہ شریف، بہادر گڑھ، ڈیرہ بابا جیمل سنگھ، کوٹ عبدالخالق، امرتسر، چنڈی گڑھ اور راجستھان کی تہذیب وثقافت اور محل وقوع وغیرہ کا بھی مختصرا تعارف پیش کیا ہے تاکہ قارئین ان مقامات کی تاریخی اور تہذیبی اہمیت کو جان سکیں۔

تیسرا موضوع 'شہیدان تحریک آزادی ہند' ہے اس مضمون میں ان چند شہیدوں کا تذکرہ ہے جن کو وطن عزیز کے نام پر جام شہادت نوش کرنا پڑا۔

چوتھا مضمون 'معاشرت وسیاست' ہے، اس میں جمہوریت، اس کے فوائد، سیکولر نظام، آزادی، تقسیم پنجاب اور مسئلہ کشمیر وغیرہ کو بیان کیا گیا ہے۔

پانچواں مضمون 'پاس پڑوس' کے عنوان سے ہے، اس مضمون میں ہمارے پڑوسی ملک سے ہمارے ملک کے رشتے کیسے ہیں؟ اور وہاں صحافت کی کیا صورت حال ہے؟ صحافیوں کا کیا رویہ رہتا ہے ان تمام پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

چھٹا مضمون 'تعلیم وتدریس' ہے، اس مضمون میں آزاد ہندوستان میں تعلیم وتدریس کی صورت حال کو بیان کرنے کے ساتھ تعلیمی وتدریسی دستور اور اس تعلق سے ذرائع ابلاغ کے کردار پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

ساتواں مضمون 'شخصیات' کے عنوان سے ہے، اس میں ملک کی چند اہم شخصیات کا تعارف اور ان کی خدمات کو بیان کیا گیا ہے جن میں دارا شکوہ، بابا لال، سانجھا پیر، کھیتو رام، سوامی دیانند، منشی نول کشور، پروفیسر سپورن سنگھ، گاندھی جی، سبرامنیم بھارتی اور جواہر لال نہرو وغیرہ شامل ہیں۔

آٹھواں مضمون ہے 'لسانیات' اس میں زبان کی تعریف، زبان اور مذہب، رسم الخط، گنگا جمنی تہذیب اور غلط عام وغیرہ پر مختصرا روشنی ڈالی گئی ہے۔ نواں مضمون ہے 'ادبی معاملات' اس میں ادب، ادیب کی ذمے داری، ادب اور سماج کا رشتہ اور ادب وقاری وغیرہ کا تعارف کرانے کے علاوہ چند اہم ادیبوں اور شاعروں کے کلام سے اقتباسات بھی پیش کیے ہیں۔

دسواں عنوان ہے 'قلمکار' اس میں چند اہم قلمکاروں، ادیبوں اور شاعروں کا تعارف شامل ہے، جن میں بطور خاص پریم چند، غالب، اقبال، کرشن چندر اور ساحر صدیقی وغیرہ ہیں۔

گیارہواں مضمون ہے 'باب تصوف' اس میں تصوف کی تعریف اور اہمیت بیان کرنے کے ساتھ مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے صوفیاء کرام کا بھی تعارف پیش کیا گیا ہے۔

بارہواں مضمون 'جسم وصحت' ہے، اس میں مختلف بیماریوں کے ساتھ ساتھ ان سے بچنے کی تدابیر اور حفظان صحت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

تیرہواں مضمون ہے 'طنز ومزاح' اس میں طنز ومزاح اور چند مزاحیہ ادب پاروں کا تعارف کرایا گیا ہے۔

چودہواں مضمون ہے 'اسلامیات' اس میں اسلام کی تعریف، اسلامی رسم ورواج، کفر وشرک، زکوۃ، شریعت اور اسلامی کلینڈر کو بیان کیا ہے۔

پندرہواں مضمون ہے 'عیسائیت' اس میں عیسائیت اور عیسائی رسوم ورواج اور طریقہ کار کو بیان کیا گیا ہے۔

سولہواں اور آخری مضمون ہے 'ہندوازم' اس میں ہندو مذہب کے رسوم ورواج اور طریقہ کار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

موضوعات ومضامین سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کتاب میں کس قدر اہم مضامین شامل ہیں، اہم معلومات کے ساتھ ساتھ فکری تقویت میں بھی یہ کتاب بہت معاون ہے، طلبا اور قارئین کے لیے بہت مفید ہے۔

قومی یکجہتی ایک مطالعہ اور تجزیہ

مصنف: ڈاکٹر ابوسفیان

صفحات: 203، قیمت: 110، سنہ اشاعت: 2019

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر حمیرا حیات، ریسرچ اسکالر، دہلی یونیورسٹی، دہلی

ہندوستان مختلف تہذیب وتمدن کا گہوارہ ہے جہاں مختلف مذاہب کے لوگ بستے ہیں اور لسانی، تہذیبی، مذہبی اور روایتی اعتبار سے مختلف ہونے کے باوجود باہم مل جل کر رہتے ہیں۔ درحقیقت یہی رنگارنگی ہندوستان کی شان ہے اور قومی یکجہتی کی اصل بنیاد بھی ہے۔ ہندوستان میں قومی یکجہتی کی ایک لمبی تاریخ رہی ہے۔ اسی تاریخ کو دہرانے اور یاد کرنے کی ضرورت پر روشنی ڈالنے کا کام مصنف ڈاکٹر ابوسفیان نے اپنی عمدہ کاوش بعنوان 'قومی یکجہتی ایک مطالعہ اور تجزیہ' کے ذریعے کیا ہے۔ مذکورہ کتاب حالیہ دور میں ایک اہم کتاب ہے جو دراصل قومی یکجہتی کے شعور اور جذبے کو مزید استوار کرنے کی مخلصانہ کوشش ہے جس کے ذریعے نا صرف قومی یکجہتی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے بلکہ مذہبی رواداری، آپسی بھائی چارہ، اقتصادی مضبوطی، ثقافتی ہم آہنگی اور مشترکہ تہذیب کو بام عروج تک پہچانے کا عمدہ فعل بھی ہے۔

کتاب میں گیارہ ابواب شامل ہیں جو قومی یکجہتی کے تاریخی پس منظر سے لے کر اس کی افادیت وضرورت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ مصنف نے تاریخی شواہد، قومی یکجہتی کے فروغ میں صوفی سنتوں اور ادیبوں کی خدمات، اس کے عروج و زوال کے اسباب، استحکام کے لیے طریقہ کار، اہمیت وافادیت کو موثر انداز میں پیش کر کے قومی شعور کو بیدار کرنے اور ہر خاص و عام کی ذہن سازی کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہندوستان مختلف اقوام، مذاہب اور تہذیب کا گہوارہ رہا ہے۔ مختلف النوع ثقافتی، لسانی اور جغرافیائی خصوصیات کے باوجود ہر عہد میں ہمارا ملک وحدت کے سانچے میں ڈھلتا رہا ہے اور یہی اس کی امتیازی شان ہے۔ بہ حیثیت ہندوستانی ہمارا فرض بنتا ہے کہ اس شان کو قائم ودائم رکھا جائے۔

کتاب کا پہلا مضمون بعنوان 'قومی یکجہتی کا صحیح مفہوم' ہے۔ جس میں مصنف نے مفہوم کے متعلق مفکرین کے خیالات کو پیش کیا ہے۔ اگلا مضمون 'قومی یکجہتی کا تاریخی پس منظر' ہے جو دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں عہد قدیم سے 1857 تک قومی یکجہتی کے تاریخی پس منظر کو حقائق کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے۔ جس میں اس تاریخی حقیقت کو اجاگر کیا ہے کہ 1857 سے پہلے پورا ملک سماجی، مذہبی اور ثقافتی ڈائیورسٹی کے باوجود وحدت کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا لیکن پلاسی کی جنگ کے بعد پھوٹ ڈالو اور راج کرو کی حکمت عملی کے سبب ہندوستان کی قومی یکجہتی پر کاری ضرب لگائی۔ مصنف نے ان سبھی حقائق کو تاریخی شواہد کی روشنی میں پیش کیا ہے۔

باب چہارم میں مختلف مصنفوں، ادیبوں اور شاعروں نے قومی یکجہتی کے فروغ میں بنا کسی مذہب وملت کے جو خدمات انجام دیں اسے تاریخی وادبی ذرائع کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ اگلا مضمون 'اسلامی نقطہ نظر سے قومی یکجہتی' ہے۔ اس میں اسلام کے ضابطہ حیات اور قوانین حکومت میں قومی یکجہتی کی اہمیت اور اس کے فروغ کے لیے کس طرح مذہبی رواداری، بردباری، آپسی بھائی چارہ اور خدمت خلق لازمی عنصر ہے، ان سبھی حقیقتوں کی منصفانہ اور موثر طور پر تصویر کشی کی ہے۔ کتاب کا اگلا مضمون 'قومی یکجہتی کے کمزور ہونے کے اسباب' ہے۔ اس مضمون کو بھی دو حصوں میں بانٹا گیا ہے۔ پہلا '1757 سے 1947 کے درمیان کمزور ہونے کے اسباب، دوئم 'ملک کی آزادی کے بعد قومی یکجہتی کے متزلزل ہونے کے اسباب' اس میں مصنف نے ملک میں قومی یکجہتی کے کمزور ہونے کے اسباب کو حقائق کی روشنی میں پیش کیا ہے۔

کتاب کا اگلا باب بعنوان 'قومی یکجہتی کے کمزور ہونے کے مضر اثرات' ہے۔ اس باب میں مصنف اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ کس طرح قومی یکجہتی کے کمزور ہونے کی وجہ سے پورا ملک نفرت، عناد، اور فرقہ وارانہ تشدد کا شکار ہوا، عزت وآبرو لوٹی گئی، آپسی بھروسہ اور اعتماد کا خاتمہ ہوا اور ساتھ ہی ان سبھی حالات کے ملک پر کیا اثرات واضح ہوئے۔ ان ساری حقیقتوں کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔

اگلے باب میں مصنف نے قومی یکجہتی کے استحکام کے لیے طریق کار کو اپنانے کی وضاحت کی ہے۔ ساتھ ہی اس نقطہ کو واضح کیا ہے کہ قومی یکجہتی کے فروغ اور استحکام کے لیے انفرادی، سماجی، انتظامی یعنی ہر سطح پر عملی کوشش کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

اگلا مضمون بعنوان 'قومی یکجہتی کے عظیم علمبردار' ہے۔ اس مضمون میں قومی یکجہتی کی مثالی شخصیات مغل بادشاہ جلال الدین اکبر، بابائے قوم مہاتما گاندھی اور عظیم دانشور اور ملک کے رہنما مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمات کو پیش کیا گیا ہے۔ اگلے مضمون میں تاریخ کی اسناد اور ہمعصر ذرائع کی بنیاد پر ملک میں قومی یکجہتی کی روایات اور نظیر کو قلم بند کیا ہے۔ آخری باب میں ملک کے استحکام اور ہمہ گیر ترقی کے لیے قومی یکجہتی کی ضرورت اور افادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد مصنف نے خلاصہ، ضمیمہ جس میں ہندوستان میں مسلم حکمرانوں کی رواداری، قومی یکجہتی کے متعلق مغل بادشاہ اکبر اعظم کے اقوال، مہاتما گاندھی کا قول، مولانا ابوالکلام آزاد کے اقوال، مسلم حکمرانوں کے عہد حکومت میں مختلف علوم وفنون کے ہندو فضلا، قومی یکجہتی کے متعلق مونگیر کے تاریخی اور ہندوؤں کے مذہبی مقام سیتا کنڈ کے متعلق دستاویزی ثبوت اور اسناد پیش کیا ہے۔

مختصر یہ کہ قومی یکجہتی کے حوالے سے یہ مذکورہ کتاب بہت اہم اور کارآمد کاوش ہے۔ مصنف نے بلا کسی تفریق کے اعتدال کے ساتھ سبھی معلومات کو فراہم کر کے اپنے غائر مطالعہ، منصفانہ و ناقدانہ تجزیہ کا ثبوت دیا ہے۔ مستند حوالوں کی روشنی میں بحث کر کے غیر جانبداری سے کام لیا ہے جو قابل ستائش ہے۔ کتاب کی زبان و اسلوب سادہ اور سلیس ہے۔ پڑھتے وقت قاری کا تسلسل قائم رہتا ہے۔ مشکل و پیچیدہ الفاظ سے گریز کر کے جامع مختصر کتاب قلم بند کی ہے۔ امید ہے کہ اس کتاب سے قومی یکجہتی کے شعور اور جذبے کو فوقیت ملے گی، ساتھ ہی اس تصنیف کے ذریعے قومی یکجہتی کی کتنی ضرورت ہے۔ اس کا احساس بھی قارئین کو ہوگا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنون لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

تحقیق و تنقید

اردو طنز و مزاح کے ارتقا میں 'اودھ پنچ' اور 'شگوفہ' کا حصہ

مصنف: ڈاکٹر فیاض احمد فیضی
صفحات: 368، قیمت 350 روپے
ناشر: تخلیق کار پبلشرز، لکشمی نگر، دہلی-92
مبصر: ڈاکٹر اسد رضا
37/21-3ای سی روڈ، دہرہ دون 248001 اتراکھنڈ

اگرچہ اردو ادب میں طنز و مزاح ہر دور میں موجود رہا تاہم اس اسلوب پر محققین و ناقدین نے کم توجہ دی لہٰذا ڈاکٹر فیاض احمد فیضی کی زیر نظر کتاب کو پڑھ کر یہ اطمینان ہوا کہ ہماری دانش گاہیں اور اسکالرس اس اسلوب پر توجہ دینے لگے ہیں۔ مصنف نے اپنی اس تحقیقی و تنقیدی کتاب کو سات ابواب میں منقسم کیا ہے۔ پہلے باب میں اردو میں طنز و مزاح کے ابتدائی نقوش کا تاریخی پس منظر میں جائزہ لیا گیا ہے جبکہ دوسرے باب میں اردو صحافت میں 'اودھ پنچ' طنز و مزاح کی پہلی آواز کا سماجی، سیاسی اور تاریخی منظر نامہ محققانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس باب میں 'اودھ پنچ' کے موضوعات مشمولات، اس جریدہ کے قلم کاروں اور ادوار کا بھی تجزیہ و تذکرہ کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں ادب و صحافت پر 'اودھ پنچ' کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے جبکہ چوتھے باب میں اودھ پنچ کے بعد شگوفہ سے پہلے کے عبوری دور کا مختلف عنوانات کے تحت تذکرہ کیا گیا۔ مثلاً آزادی سے پہلے مزاح کی صورت حال، اردو کے اہم طنز و مزاح نگار آزادی کے بعد اور دور یوسفی نیز زندہ دلان حیدرآباد وغیرہ، جبکہ پانچویں باب میں 'شگوفہ' کی انفرادیت کا محققانہ جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ چھٹے باب میں شگوفہ کی تحریک برائے فروغ طنز و مزاح کا مدلل تذکرہ ہے جس میں نئے افکار، فروغ کے لیے نئی کاوشیں، مختلف ممالک میں مزاحیہ محفلوں اور سمیناروں کا انعقاد وغیرہ شامل ہیں۔ ساتویں باب میں مصنف نے اردو طنز و مزاح کے ارتقا میں معاون 'اودھ پنچ' اور شگوفہ کا تجزیہ پیش کیا۔

مصنف نے اپنی ہر بات کو ٹھوس تاریخی ثبوت اور منطقی دلائل سے پیش کیا ہے۔ مثلاً وہ 'اودھ پنچ' کی اہم خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

'اودھ پنچ' نہ صرف اپنی مشمولات کے اعتبار سے بلکہ ظاہری لحاظ سے بھی طنز و مزاح کا پرچہ معلوم ہوتا تھا۔ اس میں اس طرح ترتیب کا اہتمام رکھا جاتا تھا کہ یہ زندگی کے ہر گوشے کی جھلک دکھادے۔ اس میں 'لوکل' کے عنوان سے اداریہ ہوتا تھا۔ اداریے کا موضوع اکثر و بیشتر ملکی احوال کو ائف ہوتے تھے اور 'تار برقی' کے عنوان سے جو کالم اس پرچے کے صفحات پر ہوتے تھے ان میں غیر ممالک کی خبروں، واقعات و حادثات پر تبصرے ہوتے تھے۔ اودھ پنچ کے صفحات میں اکثر و بیشتر کارٹون بھی شائع ہوتے تھے۔

ڈاکٹر فیاض احمد فیضی نے شگوفہ کو صحت مند اقدار اور روایات کا امین قرار دیتے ہوئے بجا طور پر لکھا ہے کہ ''ماہنامہ شگوفہ پچھلے 50 برسوں سے مسلسل بلا ناغہ شائع ہو رہا ہے اور اب اسے اردو میں مزاحیہ صحافت کا واحد علم بردار ہونے کا شرف حاصل ہے۔''

'شگوفہ' نے ادبی تحریکات سے ماورا نزاعی موضوعات اور شخصی معرکوں سے ہمیشہ احتراز کیا اور اس پالیسی پر مدیر ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال اب بھی عمل پیرا ہیں۔ اسی لیے مصنف نے اپنی بات کے ثبوت میں ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید کی رائے پیش کی ہے۔ ڈاکٹر سلیمان رقمطراز ہیں:

''ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال کی ابتدا سے سعی رہی۔ انہوں نے کسی سیاسی گجا ادبی گروہ یا ازم سے خود کو وابستہ نہیں رکھا۔ طنز و مزاح کی ممکنہ حد تک شستہ و شائستہ نگارشات کی پیش کش ان کی حکمت عملی رہی اور بس۔''

مصنف نے 'اودھ پنچ' کے اہم تخلیق کاروں مثلاً اکبرالہ آبادی، برج نرائن چکبست، ظریف لکھنوی، رتن ناتھ سرشار، تربھون ناتھ ہجر، حاجی لق لق، منشی جوالا پرشاد برق، احمد علی شوق، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف کا تذکرہ ان کی تخلیقات کی مختصر نمونوں کے ساتھ کیا ہے۔ اسی طرح شگوفہ میں شائع ہونے والے تخلیق کاروں مثلاً کرشن چندر، مشتاق احمد یوسفی، یوسف ناظم، فکر تونسوی، دلاور فگار، مجتبیٰ حسین، کنھیالال کپور، ڈاکٹر جاوید وششٹ، احمد ندیم قاسمی، علی سردار جعفری، ابراہیم جلیس، پروفیسر گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، گیان چند جین، قرۃ العین حیدر، عمیق حنفی، راجندر سنگھ بیدی، پرویز یداللہ مہدی، مختار یوسفی، نصرت ظہیر، اسد رضا، رشید قریشی، سرفراز شاہد اور شفیقہ فرحت وغیرہ کا تذکرہ بھی ان کے تخلیقی نمونوں کے ساتھ کیا ہے۔

'اودھ پنچ' اور 'شگوفہ' کو اپنے تحقیقی مقالے کا موضوع بنانے کا مقصد بیان کرتے ہوئے فیضی صاحب رقمطراز ہیں کہ ''اردو طنز و مزاح کے فروغ میں ان دونوں پرچوں نے جو انتہائی اہم رول ادا کیا ہے اس کا اعتراف کیا جاسکے اور دونوں پرچوں نے اپنے اپنے عہد میں جس طرح صحافت اور ادب پر خوشگوار اثرات مرتب کیے اور اپنے پرچے کو طنز و مزاح کی تحریک میں بدل دیا کہ آنے والے ادوار میں اس کے دور رس اثرات محسوس کیے گئے۔''

بہر حال اس دیدہ زیب اور پر مغز کتاب کو نہ صرف طنز و مزاح کے شیدائی ہاتھوں ہاتھ لیں گے بلکہ مستقبل کے اردو اسکالرس بھی اس سے استفادہ کر کے اردو طنز و مزاح کی تنقید و تحقیق کے کارواں کو آگے بڑھائیں گے۔ لہٰذا 'اردو طنز و مزاح کے ارتقا میں' 'اودھ پنچ' اور 'شگوفہ' کا حصہ کو یونیورسٹیوں اور کالجوں کے شعبہ ہائے اردو کی لائبریریوں میں ضرور ہونا چاہیے۔

شاعری

صبح کی دہلیز پر

شاعر: حنیف کیفی
صفحات: 208، قیمت: 250، سنہ اشاعت: اکتوبر 2020
ناشر: حنیف کیفی
مبصر: محمد اکرام، 89/6A، گلی نمبر 1، غفار منزل، جامعہ نگر، نئی دہلی-25

حنیف کیفی استاد، شاعر، ناقد، محقق اور مترجم کی حیثیت سے اردو دنیا میں جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ ایک استاد کے طور پر ان کا نام جہاں عزت و احترام سے لیا جاتا ہے وہیں شاعر، ناقد، محقق اور مترجم کی حیثیت سے بھی ان کی مستحکم شناخت ہے۔ آپ کی تا دم حیات 13 کتابیں منظر عام پر آچکی تھیں جن میں اردو شاعری میں سانٹ (تحقیق و تنقید) 1975، اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم [ابتدا سے 1947 تک] (تحقیق و تنقید) 1982، جے شنکر پرساد (سوانح و تنقید: انگریزی سے ترجمہ) 1984، چراغ نیم شب (شاعری) 1986، اردو کی نئی کتاب (گیارہویں جماعت کے لیے)، 1986، اردو کی نئی کتاب (بارہویں جماعت کے لیے) 1988، اردو سانٹ: تعارف و انتخاب (تحقیق و تدوین) 1987، تنقید و توجیہ (مضامین) 1997، انتخاب کلام شمیم کرہانی (ترتیب) 1999، سحر سے پہلے (شاعری)، 2004، بائیں ہاتھ کا کھیل (شاعری) 2011،

بچپن زندہ ہے مجھ میں (بچوں کے لیے) 2018 شامل ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب 'صبح کی دہلیز پر' آپ کا چوتھا اور آخری شعری مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کی اہمیت، افادیت، ضرورت کیا تھی یہ تو قارئین ہی بتائیں گے۔ البتہ کتاب کی اشاعت اور جواز سے متعلق کیفی صاحب کی رائے جاننا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے:

''... خواہی نخواہی ایک مجموعہ اور! جو دعوے یا قیاس آرائیاں ہم سے اپنے گذشتہ مجموعے میں اپنی بڑھتی ہوئی عمر اور روز بہ روز گھٹتی ہوئی صحت کے پیشِ نظر سرزد ہوگئی تھیں، سب باطل اور بے بنیاد قرار پائیں۔ اب تراسی سال سے متجاوز عمر، ضعفِ اعصاب، نقصِ بینائی اور متعدد مختلف النوع امراض وعوارض کے ہوتے ہوئے آئندہ کے لیے کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا۔ کل کیا ہوگا یہ اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اور سب کچھ اسی قادرِ مطلق کے اختیار میں ہے۔ ہاں یہ تمنا ضرور ہے کہ یہ کم سواد مجموعہ میری زندگی میں شائع ہوجائے اور جو بھی پڑھنے والے اسے میسر آجائیں ان کا ردِعمل میں دیکھ سکوں...'' (ص 9)

خدا کی مرضی کو کون ٹال سکتا ہے۔ مجموعے کی اشاعت کے کچھ روز بعد ہی آپ کا انتقال ہوگیا۔

'صبح کی دہلیز پر' 208 صفحات پر مشتمل ہے، جس میں ایک مضمون 'چھٹتی نہیں ہے...' کے علاوہ حمد/مناجات/نعت، سانٹ، نظمیں، غزلیں، رباعیات/ قطعات اور آخر میں ضمیمہ شامل ہے۔ ضمیمہ کو شامل کرنے کی وجہ محض اتنی سی ہے کہ کتاب فائنل شکل میں فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ میں مالی اعانت کے لیے بھیج دی گئی تھی۔ مالی اعانت اور اشاعت کے وقفے کے درمیان کچھ مزید غزلیں اور حمد ونعت آپ نے تیار کرلیں جنھیں ضمیمے کے تحت شامل کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں 'حنیف کیفی اور کلامِ کیفی: تاثراتِ دیدہ وراں کے آئینے میں' چند ان سچے اور ادب کے پارکھ دانشوران کے تاثرات بھی شامل ہیں جو کسی نہ کسی طور پر کیفی صاحب کی تخلیقات کو پسند کرتے تھے۔

کیفی صاحب کے شعری مجموعوں کی ایک خصوصیت یہ رہی ہے کہ انھوں نے حمد و نعت سے مجموعے کی شروعات کی ہے۔ چونکہ خالق حقیقی کے تصور کے بغیر انسان کا کوئی وجود نہیں ہے۔ ہم اس کی شان میں کتنے بھی قصیدے پڑھیں وہ بہت کم ہے، اسی لیے آپ نے پروردگار کا شکر، احسان اور کرم کو لازمی سمجھا ہے۔ پہلے کے مجموعوں کی بہ نسبت اس مجموعے میں حمد، نعت اور مناجات کی تعداد زیادہ ہے۔ مجموعے کے شروع میں ہی آپ نے 'حمد رب السمٰوات والارض' کے تحت قادرِ مطلق کی کیا بہترین مداحی کی ہے۔

ہوں نخل و شجر سارے سمندر یک جا　　لکھ پائیں نہ اوصافِ خدائے یکتا
تسبیح کناں ارض و سمٰوات اس کے　　کیا جن و بشر سے ہو بیاں اس کی ثنا

کسی بھی فن کے بارے میں یہ عام خیال ہے کہ عمر طویل اور تجربے کے ساتھ اس میں مزید پختگی آجاتی ہے۔ جوں جوں انسان تجربے حاصل کرتا ہے، مختلف علوم وفنون کا مطالعہ کرتا ہے، ویسے ویسے اس کے ذہن میں نت نئے خیالات وجود میں آتے ہیں اور ان خیالات کو عملی جامہ پہنانے میں اسے مزید آسانیاں فراہم ہوتی ہیں۔ یہی حال ایک تخلیق کار کا بھی ہوتا ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ اس کی تخلیقات میں پختگی آتی ہے۔ اسی لیے کیفی صاحب نے بڑی اچھی بات کہی ہے کہ:

''کہتے ہیں کہ شاعر جب بوڑھا ہوجاتا ہے تو اس کی شاعری جوان ہوتی ہے، میں نہیں کہہ سکتا کہ میری شاعری جوان ہوئی ہے یا میری ہی طرح بوڑھی ہوگئی ہے! اس کا فیصلہ تو پڑھنے اور پرکھنے والے ہی کرسکتے ہیں۔ اسی خیال کے پیشِ نظر اپنے پچھلے مجموعوں کی معکوسی ترتیب کے برعکس زیرِ نظر مجموعے کو میں نے ارتقائی ترتیب کے اعتبار سے مرتب کیا ہے تاکہ سلسلہ وار میری شاعری میں تغیر وتبدل اور اس کی ترقی یا تنزل کا اندازہ صحیح طور پر اور آسانی کے ساتھ لگایا جاسکے۔ صرف رباعیات اس ترتیب سے مستثنیٰ ہیں۔ (ص 10)

حالیہ کچھ برسوں میں جس معیار کی شاعری ہوئی ہے یا ہورہی ہے اس سے ہر خاص وعام واقف ہے، یہی وجہ ہے کہ بیشتر قارئین شاعری کے مجموعے کا مطالعہ تو دور، اسے اپنی لائبریری کی زینت کے لائق بھی نہیں سمجھتے۔ بے شک اظہار کا بہترین ذریعہ شاعری ہے، لیکن شاعری کے لیے جو پابندیاں متعین کی گئی ہیں یعنی رموزِ اوقاف، ردیف وقافیہ، عروض وآہنگ وغیرہ کا التزام، ورنہ آپ کی شاعری کس کام کی۔ حنیف کیفی صاحب کی یہ بڑی خوبی ہے کہ ان کی شاعری ان تمام صفات سے مزین ہے۔ بقول کیفی صاحب شاعری خونِ جگر صرف کرنے اور دماغ سوزی کا نام ہے، اسی لیے میں نے اس وقت تک شعر نہیں کہا جب تک شعر نے خود کو نہیں کہلوایا۔ شاید اسی لیے کیفی صاحب غزل کے ایک ایک شعر کو کئی کئی بار کاٹتے چھانٹتے رہتے ہیں کہ ان کی غزل میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ کیفی صاحب خود اس کا اظہار بھی کرچکے ہیں کہ ''لے دے کے سال میں دس پانچ غزلوں کا اوسط، بھولے بھٹکے دو ایک سانٹ، اور کچھ نظمیں! توفیق ہوئی تو کبھی کبھار کوئی حمد، مناجات اور نعت لکھنے کی سعادت حاصل کرلی۔'' کیفی صاحب شاعری میں ریاضت کی ضرورت کس قدر محسوس کرتے ہیں، ان اشعار سے ملاحظہ کریں۔

مضمونِ نو کی دھن میں نہ شب بھر سونا　　لفظوں کے در و بست میں خود کو کھونا
درکار ہے ہر شعر کو نذرانۂ خوں　　بچوں کا نہیں کھیل غزل گو ہونا

حنیف کیفی صاحب نے کچھ غزلیں غالب کی زمین میں بھی کہی ہیں۔ ویسے تو سیکڑوں شعرا ایسے گزرے ہیں جنھوں نے غالب کی غزل کے کسی مصرعے پر پوری پوری غزلیں کہی ہیں، اور بہت سوں کو اس میں مقبولیت بھی حاصل ہوئی ہے، لیکن ہر شاعر اپنا منفرد انداز بیان رکھتا ہے۔ انھی میں ایک نام حنیف کیفی کا بھی ہے جو غالب کے مداح اور پرستار نظر آتے ہیں، اسی لیے کیفی صاحب شعر گوئی کے معاملے میں اپنے کو غالب کا ہم نوا بتاتے ہوئے کہتے ہیں:

''میں شعر گوئی کے معاملے میں غالب کا ہم نوا ہوں، اور بڑی حد تک ان کے اس قول پر عمل پیرا ہوں: ''شعر خود خواہشِ آں کرد کہ گردد فنِ ما''۔ بڑی حد تک اس لیے کہ میں اپنی شاعری کے تعلق سے فن کا دعویٰ کرکے غالب کی ہم سری کے لائق نہیں ہوں۔ کہاں غالب کہاں میں! خاک کو آسماں سے کیا نسبت!'' (ص 178)

کیفی صاحب نے مصرعِ غالب 'گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے' پر کیا بہترین غزل لکھی ہے۔

زندہ مجھے رکھنے کو مرا کام بہت ہے　　میں مطمئن اتنا ہی بس انعام بہت ہے
لازم نہیں کچھ خیر خبر اس کو سنانا　　حاسد کے جلانے کو مرا نام بہت ہے
اس واسطے جیتا ہوں کہ جینا ہے مقدر　　مرنے کو تو یوں جینے کا الزام بہت ہے
اے قادرِ مطلق مجھے توفیق عطا ہو　　مہلت ہے بہت تھوڑی سی اور کام بہت ہے

کیفی صاحب نے اپنی شاعری میں جن موضوعات کو زیادہ برتا ہے ان میں امید و ناامیدی، اپنوں کی بے وفائی، حرماں نصیبی، غم واندوہ قابلِ ذکر ہیں۔ موضوعات کے تحت مثالوں کی گنجائش نہیں ہے، اس لیے یہاں ان سے اجتناب کیا جاتا ہے۔

مزید برآں اس مجموعے میں دو سانٹ 'شکر وشکایت' اور 'الجھن' اور سات نظمیں رائٹر کی موت، مذاقِ سلیم سے عاری ایک منکرِ شاعری کے نام، قیامتِ صغریٰ، مرگِ معصوم، وصالِ آخر، ضعیفہ ہو کے محبوبہ، ہلالِ عید سے کے علاوہ 36 صفحات پر محیط رباعیات وقطعات بھی شامل ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

کتاب کی طباعت دیدہ زیب ہے۔اس کا سرورق کیفی صاحب کے صاحب زادے محمد معراج وسیم نے ان کی نگرانی میں تیار کیا ہے،اس لیے کور پیج کی ستائش ضروری ہے۔امید ہے کہ کیفی صاحب کی بقیہ کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی علمی اور ادبی حلقے میں پسندیدگی کی نظروں سے دیکھی اور پڑھی جائے گی۔

دھوپ کا مسافر

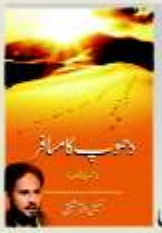

شاعر/مصنف: جمیل اختر شفیق

صفحات: 208، قیمت: 160 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی

مبصر: آفتاب احمد منیری، C-144، طیب لین، شاہین باغ، نئی دہلی

عرصۂ دراز سے یہ بات موضوعِ بحث بنی ہوئی ہے کہ آیا ادب محض دل بہلانے یا دل کے پھپھولے پھوڑنے کا ذریعہ ہے یا اس کا مقصد صالح روایات کا فروغ اور انسانی زندگی میں انقلابی تبدیلی لانا ہے؟ برصغیر میں تعمیرِ حیات کا تصور لے کر معرضِ وجود میں آئی علی گڑھ تحریک کے میر کارواں سرسید اور ان کے نامور رفقا نظریاتی طور پر افادی ادب کے علم بردار تھے۔حالی کی مسدس حالی سے لے کر اقبال کی شکوہ جواب شکوہ تک ہمارے یہاں افادی ادب کا تصور ہی غالب رہا ہے۔اقبال کے بعد کی نسل میں بھی ایسے تخلیق کاروں کی ایک طویل فہرست ہے جو اس نظریے میں یقین رکھتے تھے کہ اعلیٰ ترین ادب کا مقصد کامیاب اور بامقصد زندگی کی تعمیر اور تشکیل ہے۔معاصر ادب کے سیاق میں نوجوان شعرا کی جو نسل تیزی کے ساتھ ابھر کر سامنے آرہی ہے ان میں ایک قابلِ لحاظ تعداد اسی نظریے میں یقین رکھنے والے شاعروں کی ہے۔جمیل اختر شفیق کا تعلق شاعروں کی اسی جماعت سے ہے۔زیرِ تبصرہ کتاب ان کی نمائندہ غزلوں کا انتخاب ہے، جس میں ان کی سو سے زائد غزلیں شامل ہیں۔مشرق کی صالح روایات کے امین جمیل اختر شفیق نے آج کی مادہ پرستانہ زندگی کے مسائل، اخلاقی قدروں کے بحران اور ٹوٹتے بکھرتے رشتوں کا کرب جیسے اہم ترین موضوعات کو تخلیقی بصیرت کے ساتھ اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے۔

ایک ایسے پرآشوب دور میں جہاں ہر چہار جانب انسانیت پامال ہو رہی ہے۔جمیل اختر شفیق جیسے شاعر کی آمد چلچلاتی دھوپ میں شجرِ سایہ دار کی موجودگی کا احساس کراتی ہے۔ان کے یہ اشعار اس دعویٰ کو سندِ اعتبار عطا کرتے ہیں۔

نہ گم کرے گی اسے وقت کی یہ تاریکی — وہ پھر امید کی مشعل جلانے والا ہے
ذرا سی چوک پہ ساری روایت چھین لیتی ہے — نئی تہذیب بچوں سے شرافت چھین لیتی ہے
ملے خیرات میں عہدہ تو فوراً دوڑ مت جانا — یہی ایک بھول قائد سے قیادت چھین لیتی ہے
سنائی جتنی ماں نے تھپکیاں دے کر سلاتے وقت — مجھے بچپن کی وہ ساری کہانی یاد آتی ہے
بغیر رب کی مشیت کے کچھ نہیں ہوتا — وہ میرے قتل کی سازش فضول کرتا ہے

مذکورہ اشعار یہ بتانے کے لیے کافی ہیں کہ جمیل اختر شفیق محض آج کی مشینی زندگی اور دم توڑتی انسانیت کا ماتم نہیں کرتے بلکہ ایک نبض شناس کی طرح وہ نسخۂ کیمیا بھی عطا کرتے ہیں جو ایک جسدِ مردہ میں زندگی کی حرارت پیدا کر دیتا ہے۔مشرق کی دیرینہ علمی روایات کا احترام اور اس کی پاسداری جمیل اختر شفیق کی شاعری کا بنیادی وصف ہے۔ان کی غزلوں میں بھی یہ امتیازی وصف بدرجہ اتم موجود نظر آتا ہے۔

شدتِ جذبات میں رونے لگا میں بھی شفیق — قافلہ بڑھنے لگا جب ارضِ کعبہ کی طرف
اب کوئی موسیٰ نہیں کہ ہو تجلی کا ظہور — بے سبب ہم دیکھتے ہیں کوہِ سینا کی طرف
بھائی کا مردہ گوشت بھلا کون کھائے گا — بچتے ہیں جان بوجھ کر وہم و گماں سے ہم

معروف ناقد سید عبداللہ نے مشرقی تنقید کے سیاق میں راست گوئی کو مشرقی شعریات کا جوہر قرار دیا تھا۔فکری اور نظریاتی طور پر جن معاصر شعرا نے کذب اور مبالغہ سے ہٹ کر سچائی اور اظہار کی سادگی کو اختیار کیا ہے۔ان میں جمیل اختر شفیق کا نام نمایاں ہے۔اس ذیل میں ان کی غزل کے یہ اشعار دلیلِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ہمیں کچھ لوگ اپنے عہد کا باغی سمجھتے ہیں — سبب یہ ہے امیرِ شہر کو سجدہ نہیں کرتے
سکون چھوڑ کر الجھن قبول کرتا ہے — عجیب شخص ہے کانٹوں کو پھول کرتا ہے

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جمیل اختر شفیق کی شاعری زندگی کے جلوۂ صد رنگ کی ترجمان ہونے کے ساتھ ساتھ مشرق کی صالح روایات کی امین بھی ہے جو اندھی مادیت کے اس دور میں محبت کا، وفا کا، پیار کا نغمہ سناتی ہے اور گم شدہ انسانیت کی تلاش میں مصروف سفر رہتی ہے۔

امید ہے کہ 'دھوپ کے مسافر' کی یہ کاوش اپنے قاری کو شجر ہائے سایہ دار سے قریب کرے گی۔

■

جن کتابوں نے متاثر کیا

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا نیا سلسلہ

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت و معنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبانِ علم و ہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔

صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی و معروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے

عصر حاضر میں ادب اطفال

تلنگانہ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، وزارت تعلیم، حکومت ہند، نئی دہلی کے مالی تعاون سے شعبۂ اردو گورنمنٹ ڈگری کالج سِدّی پیٹ ریاست تلنگانہ میں مؤرخہ

6 مارچ کو 'عصرِ حاضر میں ادبِ اطفال' کے موضوع پر یک روزہ قومی سمینار کا کامیاب انعقاد عمل میں آیا، جس کی صدارت کالج کے پرنسپل ڈاکٹر سی ایچ۔ پرساد نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطاب میں شعبۂ اردو اور صدر شعبہ کی ادبِ اطفال کے حوالہ سے کارکردگی کی تعریف وتوصیف کی، اور تمام مہمانوں خصوصاً دور دراز سے آئے ہوئے مہمانانِ خصوصی اور مقالہ نگاران کا شکریہ ادا کیا۔ پروفیسر سیّد فضل اللہ مکرّم صدر شعبۂ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد نے اپنے کلیدی خطاب میں بچوں کے ادب کی اہمیت، ضرورت، افادیت اور عصری تقاضے پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ انھوں نے کلیدی خطاب میں فرمایا کہ بچوں کا ادب تحریر کرنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے، اس کے لیے بچوں کی عمر اور ان کی نفسیات سے آگاہ ہونا بے حد ضروری ہے، جس طرح ہم بچوں سے باتیں کرنے کے لیے گھٹنوں کے بل کھڑے ہوتے ہیں، تاکہ ان سے آنکھیں ملا سکیں اور اپنی بات کو سمجھا سکیں، اسی طرح زبان وبیان کو ان کی سطح پر لانا ہوتا ہے، ورنہ ترسیل کا عمل مکمل نہیں ہو پاتا۔

سمینار کے کنوینر ڈاکٹر سیّد اسرار الحق صدر شعبۂ اردو کلیہ ہذا نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں معزز مہمانوں کا استقبال وخیر مقدم کرنے کے بعد کہا کہ یہ شعبۂ اردو اور اہلِ سدی پیٹ کے لیے مسرت اور سعادت کی بات ہے کہ یہاں دوسری مرتبہ بچوں کے ادب پر قومی کونسل کے تعاون سے سمینار منعقد ہو رہا ہے، ہمارا اور ہمارے فکرمند احباب کا ارادہ ہے کہ سدی پیٹ کو نونہال طلبہ وطالبات کی علمی، ادبی، تہذیبی وثقافتی سرگرمیوں کا مرکز بنایا جائے، یہاں نوخیز نسل کی ایسی تربیت کی جائے کہ وہ مستقبل میں اچھے قلم کار، ادیب، شاعر، صحافی، مصنف، سائنس داں، ماہرِ تعلیم، ماہرِ قانون، ماہرِ طب، فرض شناس سیاسی وسماجی قائد، اچھے انسان اور اچھے شہری بن کر نہ صرف سدی پیٹ بلکہ پورے ملک وقوم کا نام روشن کریں۔

بچوں کے شاعر و ادیب پروفیسر مجید بیدار سابق صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد نے اپنے تفصیلی خطاب میں فرمایا کہ اپنے جذبات واحساسات کو ریاضی کی زبان میں ادا نہیں کیا جاسکتا، اس کو ادب کی زبان میں بیان کرنا ہوگا، اردو زبان اور اس کے ادب کی یہی خصوصیت رہی ہے کہ اس میں علوم وفنون کے ذخیرے ہی نہیں، بلکہ سائنس وٹکنالوجی اور تاریخ وسیرت کے بے شمار اثاثے موجود ہیں۔

معروف افسانہ نگار وناول نگار محترمہ قمر جمالی صاحبہ نے اپنے خصوصی خطاب میں بچوں کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشوونما اور تربیت سازی پر زور دیا، انھوں نے طلبہ وطالبات کو کہانیاں لکھنے کی ترغیب دی، اور خود ان کی تصحیح کرنے کا وعدہ فرمایا۔ بچوں کے سینئر ادیب وصحافی جناب محمد سراج عظیم نئی دہلی نے بہ حیثیت مہمانِ اعزازی افتتاحی نشست میں شرکت کی۔ انھوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ کہانیوں اور ناولوں میں سائنسی فکر ور جحان، سائنسی ربط وتعلق اور عصری تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے انہیں مؤثر، مفید اور لائقِ توجہ بنانا چاہیے۔ سنبھل یوپی سے تشریف لائے ہوئے بچوں کے مقبول ومعروف ادیب وشاعر ڈاکٹر رضاء الرحمٰن عاکف سنبھلی اسسٹنٹ پروفیسر ایم جی ایم کالج سنبھل نے افتتاحی نشست میں مہمانِ اعزازی کی حیثیت سے شرکت کی، انھوں نے براہِ راست بچوں کو مخاطب کرتے ہوئے ان کو نصابی کتب کے علاوہ غیر نصابی کتب اور ادبِ اطفال کے مطالعہ کی ترغیب دی۔

بانی لکچرر محترمہ معراج فاطمہ کی نظامت میں افتتاحی نشست کا آغاز قاضی ظہیر الدین

بابر کی تلاوت کلام پاک وترجمہ اور محمد فخرالدین صدر میواو نائب کنوینر کی حمد باری سے ہوا۔ ڈاکٹر عبدالقدوس اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ ڈگری کالج حسینی علم حیدرآباد نے معزز مہمانوں کا مختصر و جامع تعارف کرایا۔ افتتاحی نشست کا اختتام سیمینار کے معاون کنوینز محمد شاہدالرشید لکچرار اردو پرتیبھا ڈگری کالج سدی پیٹ کے شکریے سے ہوا۔

دوپہر میں ظہرانہ کے وقفہ کے بعد پروفیسر مجید بیدار کی صدارت میں مقالات کی نشست کا آغاز ہوا، جس میں ڈاکٹر رضاء الرحمٰن عاکف سنبھلی (سنبھل، یوپی) جناب محمد سراج عظیم (نئی دہلی) ڈاکٹر سید حامد ماہتاب (جگتیال، تلنگانہ) رفیع الدین ناصر (اورنگ آباد، مہاراشٹر) فوزیہ حبیب (وانمباڑی، تمل ناڈو) نادرہ بیگم (وانمباڑی) انیسہ بیگم (وانمباڑی) ڈاکٹر شاہ جہاں بیگم (کرنول، آندھرا پردیش) جویریہ قاضی (بھیونڈی، مہاراشٹرا) شیخ محمد سراج الدین ریسرچ اسکالر (حیدرآباد) تبسم آرا ریسرچ اسکالر (حیدرآباد) اور دہلی یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالرز صلاح الدین اور اعجاز احمد لون اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالرز بلال احمد گنائی اور شیخ بدرالدین نے اپنے مقالات پیش کیے۔ نشست کے صدر پروفیسر مجید بیدار نے مقالات پر مفصل تبصرہ کیا، اور تمام مقالہ نگاران کو ان کی محنت، جستجو اور عمدہ پیش کشی پر ان کی تحسین کی اور انھیں مبارکباد دی۔ شعبۂ اردو کی طرف سے تمام معزز مہمانوں، مقالہ نگاران اور ریسرچ اسکالرز کو تہنیت پیش کی گئی، ان کی شال پوشی کی گئی اور ان کو مومنٹو اور سند پیش کی گئی۔ سیمینار کے کنوینز ڈاکٹر سید اسرارالحق کے فرداً فرداً شکریے پر اختتامی نشست انجام پذیر ہوئی۔

ڈاکٹر سید اسرارالحق سبیلی، اسسٹنٹ پروفیسر وصدر شعبۂ اردو گورنمنٹ ڈگری کالج، 24 اپریل 2021

جدید انفارمیشن ٹیکنالوجی کا اردو میں استعمال مسائل اور حل

مظفر نگر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے تعاون سے موجودہ دور میں 'جدید انفارمیشن ٹکنالوجی کا اردو میں استعمال مسائل اور حل' کے عنوان پر گولڈن ہارٹ پبلک اسکول کے زیراہتمام بہسمہ جامعہ معارف العلوم کے میٹنگ ہال میں ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر ڈاکٹر اسلم نے کہا کہ یہ خوشی کی بات ہے کہ اردو زبان بھی اس درجہ پر پہنچ گئی ہے کہ اس نے خود کو کمپیوٹر کی زبان بنالیا ہے اور اب اس کو انٹرنیٹ اور کمپیوٹر تک رسائی حاصل ہے جس کی وجہ سے اب آپ کو کمپیوٹر میں استعمال کے لیے کسی اور زبان کی ضرورت نہیں ہے۔ اردو اسپیکر جناب ضمیر احمد نے پروگرام میں ڈیجیٹل اردو پر روشنی ڈالی اور کہا کہ آج کے دور میں انٹرنیٹ پر اردو میں ایک ڈیجیٹل لائبریری موجود ہے اور بہت ساری اہم ادبی ثقافتی اور تعلیمی ویب سائٹیں دستیاب ہیں۔ اس کے علاوہ انٹرنیٹ کے استعمال نے اردو صحافت کو کافی بلندیوں پر پہنچا دیا ہے۔ اس موقعے پر اردو اسپیکر مولانا آصف ندوی نے اردو ٹکنالوجی کے بارے میں کہا کہ جہاں تک اردو زبان کے فروغ کے لیے سائبر اسپیس کے استعمال کا تعلق ہے تو یہاں وسائل بے شمار ہیں۔ آڈیو ویڈیو اور ڈیجیٹل ٹکنالوجی کی مدد سے ہم تمام مسائل پر قابو پا سکتے ہیں۔ سیمینار میں پروفیسر فرحین نے اردو انٹرنیٹ کے بارے میں کہا کہ تحقیق اور مواد کی فراہمی میں انٹرنیٹ ایک بہتر طریقہ ہے اور اردو کو روزمرہ کی ضروریات سے بھی جوڑنے کی ضرورت ہے۔ سیمینار میں محمد محسن، ادریس احمد، محمد شاداب، صبا صدیقی، محبوب الٰہی وغیرہ مقررین نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ سیمینار کی نظامت عادل محسن اور صدارت ضمیر احمد نے کی۔ ٹرسٹ کے سکریٹری ماسٹر شہزاد نے سیمینار میں شریک تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 12 اپریل 2021

اردو کی نظریاتی تنقید ایک جائزہ

کھتولی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے اشتراک سے 'اردو کی نظریاتی تنقید ایک جائزہ' کے عنوان پر مظفرنگر، تعلیمی و اسلامی سوشل ریفارمر سوسائٹی کے زیراہتمام ایم ٹی آر جونیئر ہائی اسکول کھلاپار میں ایک سیمینار کا انعقاد عمل میں آیا جس میں خطاب کرتے ہوئے اردو مصنف اور اسپیکر صداقت دیوبندی نے کہا کہ عالمی سطح پر یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ اردو جیسی شیریں زبان کوئی دوسری نہیں ہے، جس طرح سے لوگ اردو بولتے اور لکھتے ہیں اور اس کے ذریعے اپنے خیالات کا اظہار جس خوش اسلوبی سے کرتے ہیں ایسی کوئی دوسری زبان نظر نہیں آرہی ہے۔ اردو صحافی شاہد حسینی نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا کہ کونسل کا سب سے بڑا عمل کمپیوٹر کو اردو زبان سے مربوط کرنا اور اس کی تربیت دینے کے لیے سیکڑوں سینٹر قائم کرنا ہے۔ پروفیسر آصف ندوی نے کہا کہ موجودہ حکومت کی جانب سے ملک کے ہر شعبے میں اردو اکیڈمی کے لیے اہم اقدامات کیے گئے ہیں جس میں اردو کو روزی روٹی سے جوڑنے کی کوشش بھی شامل ہے جو کہ بہت قابل تعریف ہے۔ پروفیسر محمد اسلم نے کہا کہ اردو کی اہمیت کو نئی نسل کے مابین زیادہ سے زیادہ متعارف کیا جانا چاہیے تاکہ نئی نسل اردو زبان سے وابستہ ہو۔ اردو اسپیکر الطاف مشعل محمد عارف خان وغیرہ نے بھی اظہار خیال کیا۔ ادارہ کے سکریٹری محبوب نے سیمینار میں شریک تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 8 اپریل 2021

پہلی تخلیق پہلا تاثر

کسی بھی رسالے میں جب آپ کی تخلیق شائع ہوتی ہے تو آپ کو بے انتہا مسرت کے ساتھ ایک نئی تحریک بھی ملتی ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' میں جب آپ کی تخلیق پہلی بار شائع ہوئی تو آپ کو کیسا محسوس ہوا؟ آپ اپنے خیالات لکھ کر ہمیں بھیجیں اور یہ بھی ضرور لکھیں کہ آپ کی ذہنی اور تحریری تربیت میں ادبی رسائل کتنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ذرا سوچیے! اگر یہ رسالے نہ ہوتے تو...؟

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

قومی

معاصر مہجری ادب: سمت و رفتار

نئی دھلی: ورلڈ اردو ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام اپنی نوعیت کا یہ منفرد پروگرام 'معاصر مہجری ادب: سمت و رفتار' کے عنوان پر 3 اپریل سے 5 اپریل تک منعقد ہوا جس میں دنیا بھر کے مشاہیر اردو نے شرکت کی۔ مہجری ادب کو دنیا بھر میں آج تسلیم کرلیا گیا ہے اور اس کی اپنی حیثیت مسلم ہوچکی ہے۔ تاہم اردو میں ابھی مہجری ادب کو وہ مقام نہیں مل سکا ہے جس کا وہ مستحق ہے۔ حالانکہ مہجری ادب اردو ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہے لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کی اہمیت وافادیت کو تسلیم کیا جائے اور اس کو مناسب مقام دیا جائے۔ تین دن کے اس پروگرام میں دنیا بھر سے کثیر تعداد میں سامعین اور ناظرین موجود تھے۔ پہلے دن کے افتتاحی پروگرام میں پروفیسر یوسف خشک چیئرمین اکادمی ادبیات پاکستان، پروفیسر یوسف عامر سابق وائس چانسلر الازہر یونیورسٹی قاہرہ مصر، پروفیسر خلیل طوقار صدر شعبہ اردو استنبول یونیوسٹی ترکی، پروفیسر رانیہ فوزی صدر شعبۂ اردو عین شمس یونیورسٹی مصر، ڈاکٹر جاوید شیخ صدر اردو مرکز لندن، نصر ملک ڈنمارک، اقبال حیدر جرمنی، امین حیدر صدر اردو انسٹی ٹیوٹ شکاگو امریکہ، جیم فے غوری اٹلی، ڈاکٹر اطہر فاروقی، سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند، خلیل الرحمٰن ایڈوکیٹ نے بطور مہمان شرکت کی۔ پروگرام کے آغاز میں ورلڈ اردو ایسوسی ایشن کے چیئرمین پروفیسر خواجہ اکرام الدین نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ پروفیسر خلیل طوقار نے لفظ 'ہجرت' اور 'مہجری ادب' پر مختصر روشنی ڈالی اور اس کے نکات پر گفتگو کی۔ خلیل الرحمٰن ایڈوکیٹ نے مہجری ادب کے حوالے سے بہت ہی معلوماتی گفتگو کی۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے بہت جامع کلیدی خطبہ پیش کیا۔ نظامت ڈاکٹر شفیع ایوب نے کی اور اخیر میں ڈاکٹر رکن الدین نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

پروگرام کے دوسرے دن کے پہلے سیشن میں ڈاکٹر فاطمہ حسن، پروفیسر خواجہ اکرام الدین اور پروفیسر عبدالرب نے صدارت کی جبکہ پروفیسر شفیق احمد اشرفی نے مہمان اعزازی کی حیثیت سے شرکت کی۔ پروفیسر جلال السعید الحفناوی، قاہرہ یونیورسٹی مصر، ڈاکٹر محیا عبدالرحمٰن، تاشقند اسٹیٹ یونیورسٹی ازبکستان، عنایت حسین عیدن ماریشس، ڈاکٹر علی بیات تہران یونیورسٹی، ڈاکٹر تغرید محمد العیومی، الازہر یونیورسٹی قاہرہ، پروفیسر غلام ربانی، ڈھاکہ یونیورسٹی، ڈاکٹر عثمان غنی رعد اور ڈاکٹر نعیم مظہر، نمل یونیورسٹی اسلام آباد، ڈاکٹر یاسمین کوثر، یونیورسٹی آف سیالکوٹ، ڈاکٹر مصطفیٰ سر پر آلاپ ترکی، عارف نقوی برلن، نصر ملک ڈنمارک، جیم فے غوری اٹلی، عارف نقوی، سرور غزالی، عشرت معین سیما جرمنی، ہمن شاہ فرانس اور افروز عالم کویت نے اپنے مقالات وخطابات پیش کیے۔

تیسرے دن کے پہلے سیشن میں پروفیسر محمد کامران پنجاب یونیورسٹی لاہور، ڈاکٹر جاوید شیخ، صدر اردو مرکز لندن اور رضا علی عابدی نے صدارت کے فرائض انجام دیے جب کہ ایکدوست ابراہیموف، آذربائیجان، نجمہ عثمان لندن اور ڈاکٹر محمد افضال بٹ سیالکوٹ نے بہ حیثیت مہمان اعزازی شرکت کی۔ مقالہ نگاروں میں قیصرہ ناہید، لاہور، ڈاکٹر شگفتہ فردوس سیالکوٹ، ڈاکٹر صنم شاکر بہاولپور، سیدہ ہما شہزادی سرگودھا، علی عمران اور ڈاکٹر محمد رکن الدین نے مختلف موضوعات پر اپنے مقالات پیش کیے۔ تیسرے اور آخری سیشن میں پروفیسر انور پاشا نے صدارت کی جب کہ مقالہ نگاروں میں روبینہ فیصل کنیڈا، انور ظہیر رہبر برلن، پروفیسر مہر الیاس، سیالکوٹ، ڈاکٹر ارم صبام بہاول نگر، ڈاکٹر رفعت جمال بھوپال، امتیاز رومی، ریشا قمر، محمد معراج اور شاہینہ یوسف شامل تھے۔ پروگرام کا اختتام ایڈوکیٹ خلیل الرحمٰن کی اختتامی تقریر پر ہوا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 7 اپریل 2021

تلنگانہ

دکن کے مسلم دور حکومت میں اسلامی علوم

حیدرآباد: دکن کی مسلم حکومتوں کی تاریخ 600 سال کے عرصے پر مبنی ہے جس میں علوم وفنون کے مختلف میدانوں میں بہت قیمتی کام ہوئے ہیں۔ دہلی سلطنت کے زمانے میں محمد تغلق کے دور ہی میں دکن اور خصوصاً دیوگیر یا دولت آباد میں Muslim Urban Centre کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے بعد محمد تغلق ہی کے دور میں علاء الدین حسن گنگو بہمنی کے ذریعے بہمنی حکومت کا قیام عمل میں آیا، تب بڑی تعداد میں بیرون دکن و بیرون ہند سے علماء ومشائخ دکن تشریف لائے۔ اس طرح علوم وفنون کو فروغ ملا۔ بہمنی دور سے ہی دکن علوم وفنون کا گہوارہ تھا۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر سلیمان صدیقی (سابق وائس چانسلر، عثمانیہ یونیورسٹی) نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شعبہ اسلامک اسٹڈیز میں انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز نئی دہلی کے اشتراک سے 'دکن کے مسلم دور حکومت میں اسلامی علوم' کے موضوع پر خطاب کرتے ہوئے کیا۔ پروفیسر ایس ایم رحمت اللہ، وائس چانسلر انچارج نے صدارت کی۔ پروفیسر سلیمان صدیقی جو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے اولین رجسٹرار بھی رہ چکے ہیں، نے کہا کہ بیرون سے آنے والے ان علماء میں کثیر تعداد شیعہ علما کی تھی جس کے سبب دکن میں شیعیت کو فروغ حاصل ہوا۔ بہمنی حکومت کے دو ادوار میں سے دور گلبرگہ میں سنی علماء کی سرپرستی وعلم پروری ہوئی، اور بیدر کے دور حکومت میں شیعہ علماء کی آمد کثرت سے ہوئی اور پورے دور پر ان کا اثر رہا۔ انھوں نے شیخ عین الدین، شیخ رکن الدین، شیخ برہان الدین غریب اور خواجہ گیسو دراز کا خصوصی تذکرہ کیا اور ان کی تصانیف وعلمی خدمات پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر ایس۔ ایم۔ رحمت اللہ نے صدارتی خطاب کیا۔ انھوں نے تمام مہمانان اعزازی کا استقبال کیا اور اہم موضوع پر ویبینار کے انعقاد پر شعبہ اسلامک اسٹڈیز کو مبارکباد پیش کی۔ پروفیسر سعود عالم قاسمی (ڈین فیکلٹی آف تھیولوجی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) نے دکن میں صوفیا کی خدمات پر گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ 'بین مذہبی مطالعات' کا آغاز چودہویں صدی میں خواجہ گیسو دراز نے کردیا تھا۔ آپ نے سنسکرت زبان سیکھ کر بدھ مت اور ہندومت کی کتابوں کا تفصیلی

مطالعہ کیا اور دعوتی نقطہ نظر سے ان اقوام کو سمجھنے کی کوشش کی۔ پروفیسر اقتدار محمد خان (ڈائرکٹر، ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی) نے آصف جاہوں کی علوم اسلامیہ کی خدمت پر خاص روشنی ڈالی۔ پروفیسر محمد اسحاق (سابق صدر، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی) نے بہمنی سلاطین کی علم دوستی پر روشنی ڈالی اور ان کی خدمات کا خصوصی تذکرہ کیا۔ پروفیسر نسیم الدین فریس (ڈین لسانیات، مانو) نے ریاست کا آرکاٹ مدراس کی مسلم حکومت اور میسور میں ٹیپو سلطان کی سلطنت خداداد میں ہونے والے کاموں پر روشنی ڈالی اور اس اہم گوشہ کی طرف رہنمائی کی۔ پروفیسر ضیاء الدین نیر (نائب صدر کل ہند مجلس تعمیر ملت، حیدرآباد)، مفتی سید ضیاء الدین نقشبندی (شیخ الفقہ، جامعہ نظامیہ، حیدرآباد) اور پروفیسر جمال الدین (ڈائرکٹر ہسٹاریکل ریسرچ پروجیکٹس، انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز نئی دہلی) نے اپنے قیمتی خطابات پیش کیے۔ پروفیسر محمد فہیم اختر ندوی (صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، مانو) نے استقبالیہ کلمات پیش کیے۔ محترمہ ذیشان سارہ (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز مانو) نے ویبینار کے موضوع کا تعارف پیش کیا۔ صدارتی گفتگو سے پہلے پروفیسر ایس۔ ایم رحمت اللہ (وائس چانسلر انچارج، مانو) کے ہاتھوں ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی کی نئی مطبوعہ کتاب 'ہندوستانی مسلمان اور اسلامی تشخص: مسائل اور حل' کی رسم اجرا عمل میں آئی۔ مجتبیٰ فاروق (ریسرچ اسکالر) نے اظہار تشکر پیش کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 9 اپریل 2021

رسم اجرا

اے ایم یو کی وراثت وثقافت پر مبنی کتاب کا اجرا

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کی سرسید اکیڈمی میں منعقدہ ایک تقریب میں اے ایم یو کے سابق طالب علم عاطف حنیف (ایم بی اے، 1999) کی مرتب کردہ کتاب 'ڈسکورنگ اے ایم یو سینٹینری چیپٹرس، رویلنگ ہنڈرڈ ایئرس آف لیگیسی' Discovering AMU Centenary Chapters revealing 100+years of legacy کا اجرا عمل میں آیا۔ قابل ذکر ہے کہ اے ایم یو کے صدی سال کی مناسبت سے یہ کتاب مرتب کی گئی ہے۔ عاطف حنیف برانڈ مارکیٹنگ کے پیشہ سے وابستہ ہیں اور وہ اے ایم یو اولڈ بوائز ایسوسی ایشن لکھنؤ چیپٹر کے جوائنٹ سکریٹری ہیں۔ انھوں نے دو جلدوں میں مذکورہ کتاب ترتیب دی ہے جس میں تصاویر کی مدد سے اے ایم یو کی سو سالہ تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ تصاویر دنیا بھر میں موجود اے ایم یو کے سابق طلبہ نے فراہم کرائی ہیں۔ سرسید اکیڈمی کے ڈائرکٹر پروفیسر علی محمد نقوی نے اپنی صدارتی تقریر میں عاطف حنیف کی کاوش کو سراہتے ہوئے کہا کہ سرسید اکیڈمی، یونیورسٹی کی صدی تقریبات کے انعقاد میں اہم رول ادا کررہی ہے۔ پروفیسر سعود عالم قاسمی (ڈین، فیکلٹی آف تھیولوجی) نے معلومات کے حصول اور انھیں ترتیب دینے میں مسٹر حنیف کی محنت کو سراہا۔ اس موقعے پر پروفیسر ایم ایم سفیان بیگ، پی آر وعمر پیرزادہ، ڈاکٹر فرحان فاضلی، ڈاکٹر ریحان اختر، انوشا خان، عادل کریم، ڈاکٹر ایس حسین حیدر، ڈاکٹر ندیم اشرف، ڈاکٹر آفتاب عالم نجمی اور نجم الحسن رضوی نے بھی اظہار خیال کیا۔ سرسید اکیڈمی کے ڈپٹی ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد شاہد نے کلمات تشکر ادا کیے۔ اس موقعے پر متعدد اساتذہ اور غیر تدریسی عملے کے اراکین موجود تھے۔ نظامت کے فرائض عاطف حنیف نے انجام دیے۔

روزنامہ 'میراوطن' دہلی، 11 اپریل 2021

مجموعہ نثر سرسید

علی گڑھ: سرسید کے حوالے سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی صدی کے موقعے پر ایک تاریخ ساز کارنامہ انجام دیا گیا ہے۔ پدم شری حکیم سید ظل الرحمٰن نے کبھی جو ابن سینا اکیڈمی، علی گڑھ میں منعقد ڈاکٹر عطا خورشید کی مرتبہ 'مجموعہ نثر سرسید' کی تقریب اجرا کے موقع پر اظہار خیال کررہے تھے۔ ڈاکٹر عطا خورشید کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے انھوں نے اس کام کو تاریخی قرار دیا۔ ڈاکٹر عطا خورشید نے، جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری میں شعبۂ مشرقیات کے انچارج ہیں، اپنی کتاب کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ سرسید احمد خاں نے اپنی 80 سالہ طویل زندگی میں تقریباً 40 سے زائد تصنیفات وتالیفات اور ہزار سے زائد چھوٹے بڑے مقالات یادگار چھوڑے ہیں۔ انھوں نے اپنی گفتگو میں فرمایا کہ سرسید کی تقریباً تمام تصنیفات وتالیفات، سوائے ایک دو کے، سرسید کی حیات ہی میں شائع ہوچکی تھیں۔ ان کے بیشتر مقالات ان کے اپنے جاری کردہ 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' اور 'تہذیب الاخلاق' میں پابندی سے شائع ہوا کرتے تھے۔ سرسید کی حیات ہی میں مختلف لوگوں نے ان کے مقالات جمع کرکے مجموعہ کی صورت میں شائع کردیے تھے جن میں سرفہرست لاہور کے فضل الدین کے زئی اور محمد امام الدین گجراتی تھے، جنھوں نے بالترتیب 1895 اور 1898 میں لاہور سے ہی اپنے مجموعے شائع کیے۔ 1895 سے شروع ہونے والا یہ اشاعتی سلسلہ آج تک جاری ہے اور اب تک مقالات سرسید کے تقریباً 30 مجموعے شائع ہوچکے ہیں، جن میں شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی کا مرتب کردہ مجموعہ 'مقالات رسید' بھی شامل ہے جسے مجلس ترقی ادب، لاہور نے 1962 سے 1965 کے دوران 16 جلدوں میں شائع کیا۔ ان 16 جلدوں میں تقریباً 404 مقالات شامل ہیں۔ ڈاکٹر عطا خورشید نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ 2019 میں سرسید پر ان کی تیار کردہ ایک بلیو گرافی 'سرسید احمد خاں: وضاحتی موضوعاتی کتابیات' عنوان سے منظر عام پر آئی۔ لوگ اب تک اسمٰعیل پانی پتی کے مرتبہ 16 جلدیں 'مقالات سرسید' کو ہی حرف آخر سمجھتے آئے تھے اور لوگوں کو یہ یقین تھا کہ سرسید نے صرف اسی قدر ہی لکھا ہے۔ ڈاکٹر عطا خورشید نے اپنی مرتبہ کتابیات میں سرسید کی چھوٹی بڑی تقریباً ایک ہزار سے زائد تحریروں کی نشاندہ کی ہے۔

روزنامہ 'میراوطن' دہلی، 14 اپریل 2021

تین معروف شعرا کے شعری مجموعوں کا اجرا

وارانسی: بنارس کے مشہور ومعروف شاعر محمد ہارون کا شعری مجموعہ 'کلیات بسمل'، ڈاکٹر عبیدالرحمٰن مرحوم دہلی کا 'سخن دریا' اور ظفر محمود ظفر کا مجموعہ کلام 'خموش لب' کا اجرا عمل میں آیا۔ دبستان ادب کی جانب سے منعقد اس پروگرام میں شہر کے مشہور ومعروف دانشوروں نے شرکت کی۔ یہ پروگرام مدنپورہ واقع ڈاکٹر اختر مسعود کی رہائش گاہ پر منعقد ہوا۔

پروگرام کی صدارت بی ایچ یو کے سابق صدر پروفیسر نسیم احمد نے کی۔ مہمان خصوصی بابے کالج کے سابق صدر شعبۂ اردو اور بسمل بنارسی کے بیٹے پروفیسر الیاس شوقی جب کہ مہمان اعزازی شعبہ اردو بی ایچ یو کے صدر ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی وقطر میں مقیم عتیق انظر تھے۔ اس موقعے پر بزرگ شاعر شاد عباسی، مولانا ابوالقاسم فاروقی، ڈاکٹر عبدالسمیع، خالد جمال، محمد سعید، حاجی عالم بنارسی، ڈاکٹر بختیار نواز، زم زم رامنگری شیر علی، عامر شوقی، اویس چندولوی سمیت کافی لوگ موجود تھے۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر اختر مسعود نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 اپریل 2021

روئیے کس کے لیے، کس کس کا ماتم کیجیے

(ایک صفحہ رفتگان کے نام)

کرونا جیسی انسانیت کش وبا کی لپیٹ میں معاشرے کے ہر طبقے کے لوگ آ رہے ہیں اور اب تک اپنے ملک میں لاکھوں افراد لقمۂ اجل بن چکے ہیں، مگر افسوس کی بات ہے کہ اس نے ملک و معاشرے کے نہایت چیدہ و چنیدہ اشخاص کو خاص طور پر اپنا شکار بنایا ہے اور گزشتہ سال سے اب تک ہم درجنوں ایسی نمایاں ہستیوں کو کھو چکے ہیں، جن سے علم و فکر کی دنیا آباد تھی اور جنھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے جوہر دکھاتے ہوئے ادب و فن کے شعبے کو خوب صورت فن پاروں سے مالا مال کیا۔ کئی بڑے مذہبی رہنما اور اہلِ دانش ہمارے درمیان سے اٹھ گئے، بہت سے مفکرینِ قوم اور سیاست و سماج کے نمایندہ چہرے ہمارے بیچ نہیں رہے۔ اردو زبان و ادب کو پچھلے سال بھر کے عرصے میں سب سے زیادہ خساروں سے دوچار ہونا پڑا ہے، جہاں پچھلے سال اردو کے درجنوں ادیب، شاعر، صحافی اور تخلیق کار اس وبا کی زد میں آ کر جاں بحق ہوئے، وہیں اس سال صرف اپریل کے وسط سے لے کر اب تک اردو دنیا کے بیسیوں بڑے اور نامور لوگ اس دنیا کو خیر باد کہہ چکے ہیں۔ کس کا نام لیں اور کس کا نہ لیں:

اٹھ گئی ہیں سامنے سے کیسی کیسی صورتیں روئیے کس کے لیے، کس کس کا ماتم کیجیے (حیدر علی آتش)

یہ گھڑی عمومی دکھ کی ہے، اس گھڑی میں ہم سب سوگوار ہیں، ساری اردو برادری سوگوار ہے، جو لوگ رخصت ہوئے ان میں کئی تو ایسے تھے جو ابھی نہایت توانا تھے اور ان کی علمی، ادبی و تخلیقی سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں، ان سے اردو دنیا کو بڑی توقعات وابستہ تھیں اور وہ بہ تدریج ہماری توقعات پر کھرے بھی اتر رہے تھے، کئی ایسے اہلِ قلم تھے جن کی تخلیقات تسلسل سے قارئین کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھیں اور ان کے فن پاروں پر مسلسل گفتگو ہو رہی تھی، کچھ بالکل نوجوان اور میدانِ ادب کے نووارد تھے، مگر ان کے اندر تخلیقی کامرانیوں کے بے پناہ امکانات موجود تھے؛ الغرض ہمارے بیچ سے اردو ادب و دانش سے وابستہ ہر عمر اور مرتبے کے بہت سے قابلِ قدر افراد رخصت پذیر ہو گئے، ان کے جانے کا غم کسی خاص فرد یا مخصوص اہلِ خانہ کا غم نہیں ہے، پوری اردو برادری کا غم ہے، ایسا غم کہ جس کی چادر روز بروز دبیز ہوتی جا رہی ہے اور اس وحشت ناک وبا کی لپیٹ میں آنے والوں کی فہرست دراز سے دراز تر ہوتی جا رہی ہے۔

ایسے اندوہ ناک حالات میں سب سے زیادہ ضروری کام تو مرحومین کے ورثا اور ان کے پسماندگان کی اشک سوئی اور انھیں دلاسہ دینا ہے کہ ان کی زندگی کسی طرح معمول پر لوٹے اور وہ اپنے آپ کو سنبھال سکیں۔ اردو کے وہ تمام ادبا اور تخلیق کار جو وفات پا گئے، ہم سب کی ذمے داری ہے کہ ان کی اولادوں اور پسماندگان کی خبر گیری کریں اور حتی الوسع ان کی اخلاقی و مادی اعانت کریں؛ کیونکہ کئی مرحومین ایسے بھی تھے کہ ان کے پیچھے ان کے اہلِ خانہ و پسماندگان کے لیے مختلف النوع مشکلات کھڑی ہو سکتی ہیں۔ ایک دوسرا کام کرنے کا یہ ہے اور نہایت ضروری ہے کہ ہم اپنے مرحوم ادیبوں اور تخلیق کاروں کی خدمات کو یاد رکھیں اور ان سے نئی نسل کو آشنا کروانے کی اپنی اپنی سطح پر تدبیریں کریں، عام دنوں میں چوں کہ شرحِ اموات بہت کم ہوتی ہے اور اگر کسی فنکار کا انتقال ہوتا ہے، تو لوگ فوری طور پر اس کی طرف متوجہ ہوتے اور تحریر و تقریر میں اس کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہیں، اس پر کتابیں بھی لکھی جاتی ہیں اور سیمینار و مذاکرے بھی منعقد ہوتے ہیں، مگر چوں کہ ابھی صورتِ حال 'مرگِ انبوہ' کی ہے اور روزانہ ہی ہمیں پورے ملک سے درجنوں فنکاروں اور تخلیق کاروں کی اموات کی خبریں مل رہی ہیں، تو ایسے میں عین ممکن ہے کہ ہم وبائی دہشت ناکی اور کثرتِ اموات کی وجہ سے بہت سے اہم ادیبوں اور دانشوروں کے نام اور کام سے غیر متعارف رہ جائیں اور جو لوگ انھیں جانتے ہیں، وہ بھی ان کی خدمات کو اجاگر نہ کر سکیں۔ موجودہ دور میں سوشل میڈیا ابلاغ و ترسیل کا ایک اہم پلیٹ فارم ہے اور اس پر ہندوستان ہی نہیں، بیرونِ ہند وفات پانے والی شخصیات کی خبریں بھی بہت جلدی عام ہو جاتی ہیں، تو جو لوگ یہ خبریں دیتے ہیں، ان کی ذمے داری ہے کہ انتقال کی خبریں شائع کرنے کے ساتھ متعلقہ شخصیت کی علمی و ادبی قد و قامت، ان کی سرگرمیوں کے دائرے اور ان کی تخلیقات و خدمات کا بھی مختصر تعارف کروا دیا کریں، اس طرح ایک ضروری کام آسانی سے ہو جائے گا۔

مجموعی طور پر تمام اہلِ اردو کے کرنے کا کام یہ ہے کہ اپنے پیشروؤں کا ذکرِ خیر کریں، ان کی روحوں کے لیے سکون و طمانیت کی دعاؤں کے ساتھ ان کے ادبی و تخلیقی کارناموں کو خراجِ تحسین پیش کرنے کی تدبیریں کریں اور اس بحرانی دور میں جی ہارنے اور گھبراہٹ و دہشت زدگی سے دوچار ہونے کی بجائے دل کی مضبوطی اور ہمت و حوصلے کے ساتھ اس وبا کا مقابلہ کریں۔ ان شاء اللہ یہ مشکل دن بھی گزر جائیں گے اور موت کی ہولناکیوں کے بعد زندگی خوش رنگیاں پھر لوٹ آئیں گی۔

مولانا وحیدالدین خاں

نئی دھلی: مشہور اسلامی اسکالر اور عالم اسلام کی معروف شخصیت اور 'الرسالہ' کے مدیر مولانا وحیدالدین

خاں کا 21 اپریل کو دہلی کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 96 سال تھی۔ پسماندگان میں دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ مولانا وحیدالدین خاں کافی عرصے سے بیمار چل رہے تھے۔ کچھ دنوں قبل انھیں دہلی کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا۔ ان کی پیدائش یکم جنوری 1925 کو اعظم گڑھ کے دور افتادہ گاؤں بڈھیریا میں ہوئی تھی۔ عربی، انگریزی، اردو اور دیگر زبانوں پر انھیں عبور حاصل تھا۔ انھوں نے اسلام پر کتابیں لکھنے کے علاوہ تفسیر بھی لکھی اور درجنوں اصلاحی کتابیں تصنیف کیں۔ مولانا کے انتقال سے عالم اسلام اور دنیا ایک بہترین اسکالر سے محروم ہوگئی ہے۔ مولانا نے 'الرسالہ' نکال کر منفی سوچ سے مثبت سوچ کی طرف لے جانے کی کوشش کی۔ ان کی حیثیت ایک مصلح کی تھی۔ وہ ہمیشہ مثبت کی طرف چلنے کا مشورہ دیتے تھے۔ وہ کچھ عرصے تک جمعیۃ علمائے ہند کے اخبار الجمعیت سے بھی بہ حیثیت ایڈیٹر وابستہ رہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 22 اپریل 2021

پروفیسر شمیم حنفی

نئی دھلی: معروف ناقد، ادیب، ڈراما نگار اور شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق پروفیسر شمیم حنفی کا 6 مئی کو 83 برس کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ شمیم حنفی شاعر، نقاد، ڈراما نگار اور مترجم ہونے کے ساتھ ساتھ کئی دیگر فنون سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ شمیم حنفی اردو ادب میں جدیدیت پسند تحریک

کے حامی تھے۔ ان کی کتابوں میں 'جدیدیت کی فلسفیانہ اساس' اور 'نئی شعری روایت' اہم ہیں۔ انھوں نے غالب اکیڈمی، انجمن ترقی اردو ہند، غالب انسٹی ٹیوٹ اور ریختہ جیسی بہت سی ادبی تنظیموں کے سرپرست کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ شمیم حنفی سلطانپور میں ایک وکیل محمد لئیمن صدیقی اور بیگم زیب النسا کے گھر پیدا ہوئے۔ وہ 6 بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ پروفیسر حنفی نے ابتدائی زندگی سلطانپور ہی میں گزاری۔ تاہم وہ کالج کی تعلیم کے لیے الہ آباد چلے گئے۔ یہاں وہ فراق گورکھپوری کے تعلق میں آئے جنھوں نے ان کی فکر و خیال پر ایک گہرا اثر چھوڑا۔ ان کے انتقال پر متعدد علمی اور ادبی شخصیات نے رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔ اردو ادب کے لیے انھوں نے اپنے پیچھے جو بیش قیمت ذخیرہ چھوڑا ہے، وہ ان کی یاد دلاتا رہے گا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 7 مئی 2021

رتن سنگھ

نئی دھلی: گنگا جمنی تہذیب کی علامت، رتن سنگھ بھی جہان فانی سے رخصت ہوکر مالک حقیقی سے جا ملے۔ گذشتہ کئی دنوں سے علیل رہتے ہوئے 3 مئی کو انتقال

کرگئے۔ رتن سنگھ 15 نومبر 1927 کو داؤد خیل نارووال پنجاب (پاکستان) میں سردار پرتاپ سنگھ کے یہاں پیدا ہوئے تھے۔ وہیں مڈل اسکول تک تعلیم ہوئی۔ ڈیرہ بابا نانک سے 1945 میں انھوں نے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔ تقسیم کے بعد ہجرت کرکے ہندوستان آئے۔ پنجاب یونیورسٹی سے انٹر اور 1960 میں لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے امتحان پاس کیا۔ لکھنؤ کے ریلوے ہیڈ آفس میں 1962 تک کلرک رہے۔ پھر ریڈیو کی ملازمت میں آئے۔ ملک کے مختلف ریڈیو اسٹیشنوں پر اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائریکٹر کی خدمات انجام دیں۔ 1985 میں شری نگر کشمیر میں بہ حیثیت ڈائرکٹر سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوگئے۔ رتن سنگھ دو سال تک روزنامہ 'آفتاب اردو' کے ایڈیٹر بھی رہے اور جبل پور یونیورسٹی میں ریڈیو ٹی وی جرنلزم کورس کے شعبے میں مہمان لیکچرر کی حیثیت سے کام کیا۔ ان کے پسماندگان میں دو بیٹے اور بیٹیاں ہیں جب کہ اہلیہ کا انتقال ہو چکا ہے۔ اب تک پہلی آواز، پنجرے کا آدمی، کاٹھ کا گھوڑا اور پناہ گاہ جیسے افسانوی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ان کا ناول 'دربدری' بھی شائع ہوا تھا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 مئی 2021

سلطان اختر

پٹنہ: جدید لب ولہجہ کے نمائندہ شاعر و غزل کی آبرو کہے جانے والے اور بہار اردو اکادمی کے سابق نائب صدر سلطان اختر کا 20 اپریل کو حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 81 سال تھی۔ پسماندگان میں دو بیٹے ہیں۔ اہلیہ کا کچھ برس قبل انتقال ہوگیا تھا جب کہ ایک

بیٹے کا کچھ ماہ پہلے ہی انتقال ہوا تھا۔ ان کی تدفین بعد نماز ظہر حاجی حرمین قبرستان میں عمل میں آئی۔ انھوں نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی لیکن ان کی پہچان اور شناخت غزل کے حوالے سے تھی۔ بہار اردو اکادمی کے نائب صدر رہتے ہوئے انھوں نے اردو زبان و ادب کی مثالی خدمت کی۔ سلطان اشرف (قلمی نام سلطان اختر) ولد الحاج محمد اشرف الدین اور رابعہ خاتون 16 ستمبر 1940 کو (تعلیمی سند کے مطابق 1942) اپنے آبائی وطن سہسرام میں پیدا ہوئے۔ ابتداء میں مذہبی تعلیم حاصل کی اور مدرسہ حیریہ نظامیہ سے مولوی کی سند حاصل کی۔ سہسرام ہائی اسکول سے میٹرک پاس کرنے کے بعد ایس پی جین کالج سے بی اے کر رہے تھے کہ جمشید پور کے لیبر ڈپارٹمنٹ میں نوکری مل گئی تو تعلیم کو خیر باد کہنا پڑا۔ ستمبر 1968 سے حکومت بہار کے شعبہ حوالات (جیل محکمہ) میں ملازمت حاصل ہوئی تو مستقل طور پر پٹنہ میں قیام رہا۔ 3 ستمبر 2000 کو ملازمت سے سبکدوش ہوئے اور پھلواری شریف میں تعمیر شدہ ذاتی مکان میں رہنے لگے۔ سلطان اختر نے 1975 سے شعر کہنے شروع کیے۔ ابتدا میں مانوس سہسرامی اور جعفر خاں اثر لکھنوی سے اصلاح لی مگر کچھ ہی دنوں بعد یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔ 1967 میں رسالہ 'فنون' لاہور کے جدید غزل نمبر میں بیک وقت ان کی دس غزلیں شائع ہوئیں جس کے سبب ان کی ادبی

شناخت کو استحکام حاصل ہوا۔ اس کے بعد ہندو پاک کے معیاری رسالوں، ریڈیو اور ٹی وی کے پروگراموں اور مشاعروں کے توسط سے رفتہ رفتہ وہ ملک گیر شہرت کے حامل بن گئے۔ انھیں مختلف اداروں کی جانب سے انعامات واعزازات بھی ملے مگر وہ اپنے کسی مجموعہ کلام کی اشاعت سے ایک عرصہ تک بے نیاز رہے۔ 1994 میں ان کی 90 غزلوں کا مجموعہ 'انتساب' شائع ہوا۔ ان کی بعض غزلیں بے حد مقبول ہوئیں جو مشہور گلوکاروں کے کیسٹ میں شامل ہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 21 اپریل 2021

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

بھاگلپور: عالمی شہرت یافتہ ادیب وشاعر اور معروف تنقید نگار، سینکڑوں کتابوں کے مصنف ومؤلف، ماہنامہ

کوہسار بھاگلپور کے مدیر پروفیسر ڈاکٹر مناظر عاشق کا انتقال بھاگلپور کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں 17 اپریل کو ہوا۔ ان کے انتقال کی خبر سنتے ہی شہر کے ادبی اور سماجی حلقوں میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ وہ گزشتہ ایک ہفتہ سے علیل چل رہے تھے۔ خبر کے مطابق ان کا شوگر لیول بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ مناظر عاشق ہرگانوی پر درجنوں لوگوں نے پی ایچ ڈی کی ہے۔ مرحوم انتہائی خلیق، ملنسار، مشفق، باصلاحیت ادیب اور تنقید نگار تھے۔ مرحوم پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی نے ڈھائی سو سے زائد کتابیں تصنیف کیں۔ وہ بھاگل پور سے ایک ادبی رسالہ کوہسار کے نام سے نکالا کرتے تھے۔

پروفیسر ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی ابتدائی تعلیم بربیگھہ کے ایس کے آر کالج سے ہوئی تھی۔ بھاگل پور کے ماروازی کالج میں تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد بھاگلپور کے بھیکن پور میں ہی آباد ہوگئے۔ آپ تلکا مانجھی بھاگلپور یونیورسٹی کے پی جی اردو شعبے سے بھی کافی دنوں تک منسلک رہے۔ مرحوم کے پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ دو بیٹے دانش، فیصل اور ایک بیٹی ہیں۔

ای ٹی وی بھارت

عنبر بہرائچی

محمد ادریس عنبر بہرائچی کا 7 مئی کو انتقال ہوگیا۔ وہ اردو کے مشہور شاعر تھے اور انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ بھی مل چکا تھا۔

عنبر صاحب کی ولادت 5 جولائی 1949 کو ضلع بہرائچ کے ترقیاتی حلقہ مہسی کے سکندر پور علاقے میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انھوں نے جغرافیہ میں ایم۔ اے کیا اور صحافت کا ڈپلوما بھی حاصل کیا۔ انھوں نے یوپی کے سول سروس کے مقابلہ جاتی امتحان میں بھی شرکت کی اور کامیابی حاصل کرکے مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ وہ سنسکرت بھی اچھی جانتے تھے اور شاعری کے ساتھ تنقید بھی لکھتے تھے۔ انھوں نے سنسکرت شعریات کے حوالے سے کئی اہم کتابیں تصنیف کیں۔ ان کا ایک نعتوں کا مجموعہ 'روپ انوپ' بھی منظر عام پر آیا اور بہت مقبول ہوا۔ ان کے انتقال پر اردو کے معروف ادیبوں نے اظہار تعزیت کیا ہے اور ان کے سانحۂ ارتحال کو ایک ناقابل تلافی نقصان قرار دیا ہے۔ ساہتیہ اکیڈمی نے ان کے شعری مجموعے 'سوکھی ٹہنی پر ہریل' کو ایوارڈ سے نوازا۔

نور عالم خلیل الامینی

نئی دھلی: مایہ ناز عربک اسکالر، جید عالم دین، صدارتی ایوارڈ یافتہ، دارالعلوم دیوبند کے شعبہ عربی کے استاذ اور معروف عربی جریدہ 'الداعی' کے مدیر اعلیٰ مولانا نور عالم خلیل الامینی کا 3 مئی کو رات ایک بجے میرٹھ کے ایک اسپتال میں مختصر علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 69 سال تھی۔ پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ 4 صاحب زادیاں اور تین صاحب زادے ہیں۔ مولانا امینی گذشتہ چند دنوں سے بیمار تھے، چند روز قبل ہی انھیں بہتر علاج کے لیے دیوبند سے میرٹھ کے ایک اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا۔

وہ شوگر کے مریض تھے اور اس کے علاوہ انھیں سانس کی بیماری بھی لاحق تھی۔ وہ دارالعلوم دیوبند کے مقبول ترین اساتذہ میں تھے، خاص طور پر عربی زبان سے تعلق رکھنے والے طلبہ ان سے خاص تعلق رکھتے تھے۔ مزاج میں ہمہ گیریت تھی۔ طلبہ سے نہایت شفقت سے پیش آتے تھے۔ مولانا نور عالم کی ابتدائی تعلیم مدرسہ امدادیہ دربھنگہ، دارالعلوم مئو اور دارالعلوم دیوبند میں ہوئی۔ مولانا کی فراغت دہلی کے معروف مدرسہ امینہ سے ہوئی تھی۔ دارالعلوم دیوبند میں دوران تعلیم مولانا وحیدالزماں کیرانوی کے خاص شاگرد تھے اور عربی زبان وادب سے دلچسپی پیدا کرنے میں مولانا وحیدالزماں کیرانوی کا خاص کردار تھا۔ ان کے علاوہ دیوبند میں مولانا محمد میاں دیوبندی، مولانا معراج الحق صاحب، مولانا محمد حسین بہاری، مولانا نصیر احمد خان صاحب بھی ان کے خاص اساتذہ میں تھے۔ فراغت کے بعد مولانا نور عالم ندوۃ العلما لکھنؤ سے وابستہ ہوئے اور مولانا ابوالحسن علی ندوی سے خاص تربیت حاصل کی اور ان کے چہیتوں میں شامل تھے اور تقریباً دس سال تک مولانا نے ندوہ میں خدمت کی۔ 1982 میں وہ دارالعلوم دیوبند بلائے گئے۔

مولانا نور عالم خلیل الامینی دارالعلوم دیوبند میں شعبہ عربی سے وابستہ ہوگئے اور طلبہ کو جدید عربی سے آشنا کرانے اور ان میں عربی تحریر وتقریر کا جذبہ پیدا کرنے میں ان کا اہم کردار رہا ہے۔ مولانا وحیدالزماں کیرانوی کے بعد مولانا امینی دارالعلوم دیوبند میں عربی کے بہترین استاد تھے۔ ان کے فیض یافتہ طلبہ کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ مولانا نور عالم کی پیدائش بہار کے ضلع مظفر پور کے ہرپور بیشی میں 18 دسمبر 1952 کو ہوئی تھی۔ ان کی کتاب فلسطین فی انتظار صلاح الدین پر آسام یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا گیا۔ ان کی کتاب مفتاح العربیہ مختلف مدارس کے نصاب میں شامل ہے۔ 2017 میں آپ کو صدارتی سرٹیفکیٹ آف آنر کے اعزاز سے نوازا گیا۔ مولانا کی عربی اردو کتابوں میں وہ کوہ کن کی بات (وحیدالزماں کیرانوی کی سوانح حیات)، فلسطین کسی صلاح الدین ایوبی کے انتظار میں، پس مرگ زندہ، حرف شیریں، موجودہ صلیبی صہیونی جنگ، کیا اسلام پسپا ہورہا ہے؟، خط رقعہ کیوں اور کیسے سیکھیں؟، مفتاح العربیہ (مکمل دو حصے)، فلسطین فی الہند، مجتمعاتنا المعاصرۃ والطریق الی الاسلام، الدعوۃ الاسلامیۃ بین الأمس والیوم، متی تکون الکتابات مؤثرۃ، تعلموا العربیۃ فانہا من دینکم، العالم الہندی الفرید الشیخ المقرء محمد طیب وغیرہ شامل ہیں۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 4 مئی 2021

انجم عثمانی

دیوبند: دوردرشن کے سابق اسسٹنٹ ڈائرکٹر اور ٹی وی کے مشہور و معروف ادبی پروگرام 'بزم' کے پروڈیوسر اور مشہور افسانہ نگار انجم عثمانی کا 20 اپریل کو کووڈ 19 کے باعث انتقال ہوگیا۔ انجم عثمانی ایک بہترین انسان ہونے کے ساتھ ساتھ اردو ادب کی دنیا کی نامور شخصیت تھے۔ انجم عثمانی نے 1968 میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی۔ تعلیمی فراغت کے بعد وہ مختلف علمی و ادبی جریدوں کی ادارت سے وابستہ ہوگئے۔ دیوبند کے مشہور پندرہ روزہ جریدہ 'دیوبند ٹائمز' کی ادارت سے بھی وابستہ رہے۔ دارالعلوم دیوبند کے ہونہار فرزند ہونے کے ساتھ ساتھ انھیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی طالب علمی کا اعزاز بھی حاصل رہا۔ جہاں سے انھوں نے پی یو سی کا امتحان پاس کیا۔ بعد ازاں دہلی یونیورسٹی سے اردو مضمون سے ایم اے امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ انجم عثمانی نے 1971 میں دہلی کو اپنا مسکن بنالیا اور زندگی کی آخری سانس تک دہلی میں رہے۔ 1978 میں ان کا سب سے پہلا افسانوی مجموعہ 'شب آشنا' منظر عام پر آیا۔ اس کے علاوہ 1984 میں 'سفر در سفر'، 1998 میں 'ٹھہرے ہوئے لوگ' اور 2011 میں 'کہیں کچھ کھو گیا' تین افسانوی مجموعے منظر عام پر آئے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 21 اپریل 2021

شوکت حیات

پٹنہ: مشہور و معروف افسانہ نگار شوکت حیات کا 21 اپریل کو ان کی رہائش گاہ پاٹلی پتر اپر صبح ساڑھے دس بجے انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 70 سال تھی۔ ان کے پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے۔ یکم دسمبر 1950 میں پیدا ہونے والے مسٹر شوکت حیات ستر کی دہائی میں افسانہ نگاری کے میدان میں نمایاں ہوئے اور بہت جلد ہی اہم افسانہ نگاروں میں شامل ہوگئے۔ ان کے افسانوں میں سماج کی تلخ حقیقت اور سچائیاں ہوتی تھیں، انھوں نے اپنے افسانے کے ذریعے سماج کو آئینہ دکھانے کی کوشش کی۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ 'گنبد کے کبوتر' ہے۔ شوکت حیات بہار کے افسانہ نگاروں میں ایک بڑا نام تھا۔ شوکت حیات نے اپنے واحد افسانوی مجموعہ 'گنبد کے کبوتر' کے ذریعے اردو ادب میں اپنی خاص پہچان بنائی۔ وہ بسکومان میں اچھے عہدے پر فائز تھے۔ بہار اردو اکادمی نے ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے بھی نوازا تھا اور ساتھ ہی ان کو قومی کتھا ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔

روزنامہ 'میرا وطن'، دہلی، 22 اپریل 2021

مشرف عالم ذوقی

نئی دہلی: معروف فکشن نگار مشرف عالم ذوقی کا 19 اپریل کو ایک پرائیویٹ اسپتال میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا۔ وہ گذشتہ کئی دنوں سے اسپتال میں داخل تھے۔ پسماندگان میں ایک بیٹا ہے۔ ان کی عمر تقریباً 58 سال تھی۔ ان کی تدفین بعد نماز مغرب خورجی کے قبرستان میں عمل میں آئی۔ وہ عصر حاضر کے معتبر ناول نگار تھے۔ اپنی منفرد تخلیقات کے سبب وہ نمایاں شناخت رکھتے تھے۔ ان کی پیدائش 24 نومبر 1963 کو بہار کے ضلع آرہ میں ہوئی تھی۔ انھوں نے مگدھ یونیورسٹی سے ایم اے کی سند حاصل کی تھی۔ انھوں نے ہمیشہ قلم سے رشتہ نبھایا۔ انھوں نے دہلی میں سچ بالکل سچ میں بھی کام کیا اور اخیر میں روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' کے گروپ ایڈیٹر رہے۔ ویسے وہ ہمیشہ فری لانس صحافی رہے۔ وہ بنیادی طور پر دوردرشن کے لیے ٹی وی سیریل بناتے تھے اور قلم ہی ان کا ذریعۂ معاش تھا۔ ان کی مطبوعات کی تعداد 50 سے زائد ہے۔ ان کے 14 ناول اور افسانوں کے 8 مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان پر متعدد پی ایچ ڈی ہو چکی ہیں۔ ان کے ناولوں میں: شہر چپ ہے، بیان، مسلمان، لے سانس بھی آہستہ، آتش رفتہ کا سراغ، پروفیسر ایس کی عجیب داستان، نالہ شب گیر، ذبح، مرگ انبوہ اور مردہ خانے میں عورت شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے ہم عصر ادیبوں کے خاکے بھی لکھے۔ دیگر اصناف میں بھی انھوں نے کتابیں لکھیں۔ 1992 میں ان کا پہلا 'ناول' نیلام گھر' شائع ہوا تھا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 20 اپریل 2021

شاہد علی خاں

نئی دہلی: مکتبہ جامعہ پرائیویٹ لمیٹڈ کے سابق جنرل منیجر شاہد علی خان کا 21 اپریل کی صبح 5 بجے اپنی رہائش گاہ زیدی اپارٹمنٹس، جامعہ نگر، نئی دہلی میں انتقال ہوگیا۔ وہ تقریباً 85 برس کے تھے۔ مکتبہ جامعہ سے ان کی طویل وابستگی رہی۔ ان کی تقرری 1951 میں ہوئی اور کم و بیش 50 برس تک بے لوث خدمات انجام دیتے رہے، بعد ازاں 2006 میں اسی عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ وہ اور مکتبہ جامعہ ایک دوسرے میں اس طرح مدغم ہوگئے تھے کہ ایک کو دوسرے سے الگ کرنا مشکل تھا۔ مکتبہ جامعہ سے علاحدگی کے بعد بھی انھوں نے انجمن سازی کے لیے 'نئی کتاب' کے نام سے جو ادارہ قائم کیا وہ لکھنے والوں کے لیے ملاقات کا موقع فراہم کرانے والا ایک بیش بہا سرمایہ تھا۔ واضح رہے کہ وہ گزشتہ سال اگست 2020 میں بھی اچانک بیمار ہوگئے تھے۔ انھیں فوراً اسکارٹ ہارٹ انسٹی ٹیوٹ کے انتہائی نگہداشت سیل (آئی سی یو) میں داخل کرایا گیا تھا جہاں پر وہ تقریباً 10 دن زیر علاج رہے تھے۔ بعد ازاں حالت ٹھیک ہونے کے بعد انھیں چھٹی دے دی گئی تھی۔ فی الحال وہ اپنے ادارے پر نہیں آرہے تھے اور آخری ایام انھوں نے گھر پر ہی گزارے۔ مرحوم کی جنازے کی نماز اوکھلا گاؤں کی جامع مسجد میں ہوئی اور تدفین بٹلہ ہاؤس قبرستان میں عمل میں آئی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 22 اپریل 2021

پروفیسر مولا بخش

نئی دہلی: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے شعبہ اردو کے پروفیسر اور مشہور نقاد پروفیسر مولا بخش کا

21 اپریل کو علی گڑھ کے ایک اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ وہ گذشتہ پانچ روز سے سخت علیل تھے۔ مسٹر مولا بخش مشہور نقاد تھے، اردو ادب پر ان کی گہری نظر تھی۔ وہ دہلی یونیورسٹی کے دیال سنگھ کالج کے شعبہ اردو کے استاد بھی رہے لیکن 2014 میں انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستگی اختیار کرلی تھی اور وہ وہاں پروفیسر ہوگئے تھے تاحال شعبہ اردو سے ہی وابستہ تھے۔ وہ اچھے استاد تھے اور طلبا میں کافی مقبول تھے۔ وہ شاعر بھی تھے اور مشاعروں میں شرکت کرتے تھے اور ترنم سے مشاعرہ پڑھتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ ایک اچھے مقرر بھی تھے۔ ان کی تعلیم جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں ہوئی تھی۔ وہ چمپارن کے رہنے والے تھے۔ ان کی شناخت مابعد جدید نقاد کے طور پر ہے۔ ان کی کتاب جدید ادبی تھیوری اور گوپی چند نارنگ، خواجہ حسن نظامی کی نثر: ثقافتی لائحہ عمل اور خواجہ میر اثر ہے۔ وہ اپنی کتاب 'اسلوبیات: نظریہ و عمل' پر گذشتہ ایک برس سے کام کر رہے تھے۔ یہ کتاب جب بھی شائع ہوگی اردو ادب میں قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائے۔

روزنامہ 'میراوطن' دہلی، 22 اپریل 2021

ڈاکٹر عابداللہ غازی

شکاگو: شہرہ آفاق مصنف، محقق، ماہر تعلیم اور اقرا فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے بانی و سربراہ ڈاکٹر عابداللہ غازی کا 11 اپریل کو انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 85 سال تھی۔ مرحوم 150 کتابوں کے مصنف و مولف تھے اور اقرا فاؤنڈیشن کے ذریعے مغربی

دنیا کے مسلم بچوں کی دینی تعلیم وتربیت کے لیے ماہرین تعلیم بالخصوص ڈاکٹر تسنیمہ غازی کے تعاون سے ایک بڑا ہی جامع نصاب مرتب کیا تھا جو بلاتفریق مشرق ومغرب دنیا بھر کے مسلم معاشروں میں مقبول ہوا اور ہندو پاک کے ناشرین کتب نے بھی ان کتابوں کے متعدد ایڈیشن شائع کیے اور مسلم بچوں کی کئی نسلوں کی تعلیم وتربیت میں ان کی کتابیں کام آئیں۔ اردن کی رائل اکیڈمی نے ان کو دنیا کے 500 سب سے زیادہ بااثر مسلمانوں میں شمار کیا تھا۔ عابداللہ غازی کا تعلق ہندوستان کے ایک مشہور دینی وعلمی خانوادے سے تھا۔ ان کے والد مولانا حامد الانصاری غازی اردو کے مشہور شاعر، صحافی، مجاہد آزادی اور دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن تھے۔ ان کے دادا مولانا محمد میاں منصور انصاری ریشمی رومال تحریک کے رہنماؤں میں تھے۔ ڈاکٹر غازی نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے سیاسیات میں ایم اے کیا۔ بعد میں لندن اسکول آف اکونومکس سے اقتصادیات میں ایم اے اور ہاورڈ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی۔ ڈاکٹر غازی اور ڈاکٹر تسنیمہ کے پانچ بچے ہیں، بشریٰ یاسمین سیمیں غازی، راشد منصور غازی، صبا غازی، صہیب غازی ایڈوکیٹ اور ڈاکٹر اسامہ غازی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 اپریل 2021

پروفیسر اشتیاق دانش

نئی دہلی: معروف دانشور پروفیسر اشتیاق دانش کا 61 سال کی عمر میں دہلی میں انتقال ہوگیا۔ پروفیسر اشتیاق

دانش اسلامیات کے ماہر اور درجنوں کتابوں کے مصنف تھے۔ وہ معروف تھنک ٹینک ادارہ انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز میں فائنس سکریٹری تھے اور اس کے علاوہ متعدد اہم ذمہ داریاں نبھا رہے تھے۔ جامعہ ہمدرد نئی دہلی میں شعبہ اسلامیات کے پروفیسر تھے۔ پروفیسر اشتیاق دانش کے انتقال پر آئی او ایس کے چیئرمین ڈاکٹر محمد منظور عالم نے اپنے شدید رنج وغم کا اظہار کیا اور کہا کہ ان کی رحلت آئی او ایس کے لیے بہت بڑا خسارہ اور حادثہ ہے، جس کی تلافی ممکن نہیں ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 17 اپریل 2021

سیدہ شان معراج

شاہجہانپور: اردو کی مشہور ومعروف شاعرہ سیدہ شان معراج کا 29 اپریل کی رات میں بریلی کے اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ 74 سالہ شاعرہ کو علالت کے بعد دو روز

قبل مشن اسپتال میں داخل کیا گیا تھا جہاں انھوں نے رات کے 12 بجے آخری سانس لی۔ انھیں اترپردیش اردو اکادمی نے سنہ 2016 میں ان کے مضامین کے مجموعہ 'زنجیر در' پر ایوارڈ سے نوازا تھا۔ شہر کے محلّہ تارین ٹکلی میں رہنے والی مشہور شاعرہ سیدہ شان معراج کا شمار ہندوستان و پاکستان کی بڑی شاعرہ کے طور پر ہوتا تھا۔ سیدہ شان معراج کا اصل نام سیدہ شفق آرا تھا۔ وہ 22 جولائی 1947 کو سید اشفاق حسن میاں کے گھر میں پیدا ہوئی تھیں۔ انھوں نے شاعری کا آغاز 1972 میں کیا تھا۔ شاعری میں ان کے استاد رباب رشیدی تھے۔ شان معراج نے ملک کے بیشتر آل انڈیا مشاعروں میں شرکت کی۔ اس کے علاوہ انھیں پاکستان میں ہونے والے مشاعروں میں بھی کئی بار مدعو کیا گیا تھا جن میں ان کی پذیرائی کی گئی۔ انھوں نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پروگراموں میں بھی حصہ لیا۔ ان کا شمار ملک کی مشہور شاعرات میں ہوتا تھا۔ ان کا ایک شعری مجموعہ 'ساحل سیپ سمندر' اور مضامین کا مجموعہ 'زنجیر در' شائع ہوا۔ 'ساحل سیپ سمندر' شعری مجموعہ کے اجرا اور مشاعرہ میں ملک کے مشہور شعرا نے شرکت کی تھی۔ شان معراج کے شوہر سید رونق رضا زیدی بھی شاعر تھے۔ ان کا تعلق بریلی کے قصبے ٹسوہ کے رئیس خاندان سے تھا۔ رونق رضا کا شعری مجموعہ 'آئینے اکیلے ہیں' شائع ہوا تھا۔ سڑک حادثہ میں ان کی موت ہوگئی تھی۔ ان کی تین بیٹیاں اور ایک بیٹا حسن عباس ہیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 30 اپریل 2021

ریاض پنجابی

سرینگر / نئی دہلی: کشمیر یونیورسٹی کے سابق

وائس چانسلر اور علمی و ادبی شخصیت پروفیسر ریاض پنجابی مختصر علالت کے بعد 8 اپریل کی صبح نئی دہلی میں واقع اپنی رہائش

گاؤ پر انتقال کر گئے۔ پدم شری ایوارڈ یافتہ پروفیسر ریاض پنجابی جنوری 2008 سے جون 2011 تک کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدے پر فائز رہے۔ تاہم انھیں اصل شہرت ان کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کی وجہ سے حاصل تھی۔ وہ متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ بعض عالمی شہرت یافتہ یونیورسٹیوں میں پروفیسر پنجابی کو تحقیقی تقاریر کے لیے مدعو کیا جاتا تھا۔ جب کہ کئی بین الاقوامی جرائد کے لیے مسلسل لکھتے تھے۔ انھیں سال 2011 میں بھارت کے سب سے بڑے شہری اعزاز پدم شری سے نوازا گیا تھا۔ اس کے علاوہ انھیں سال 2009 میں میٹی انٹرنیشنل بزنس اسکول کی جانب سے ایمی ایکیڈمک ایکسی لینسی ایوارڈ اور سال 2010 میں ادبی مرکز کمراز ایوارڈ سے بھی نوازا گیا تھا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 9 اپریل 2021

مرغوب بانہالی

سری نگر: جموں و کشمیر کے نامور ادیب، سخن ور اور دانشور پروفیسر مرغوب بانہالی 27 اپریل منگل کی صبح سری نگر میں واقع اپنی رہائش گاہ پر مختصر علالت کے بعد انتقال کر گئے۔ وہ 84 برس کے تھے۔ مرحوم پروفیسر معروف ماہر نفسیات ڈاکٹر مشتاق مرغوب کے والد تھے۔ جموں و کشمیر کے ضلع رام بن کے بانہال کے بنکوٹ علاقے سے تعلق رکھنے والے مرحوم پروفیسر پچاس سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔ کشمیر یونیورسٹی میں شعبۂ فارسی میں بطور استاد تعینات ہونے سے قبل آپ تحصیل ایجوکیشن افسر کے عہدے پر فائز رہ چکے تھے۔ مرحوم کشمیر یونیورسٹی میں مختلف شعبوں میں اپنی خدمات انجام دینے کے بعد شعبہ کشمیری سے بہ حیثیت صدر شعبہ سبکدوش ہوئے۔ انھوں نے سبکدوشی کے بعد بھی اپنی زندگی علم و ادب اور تحقیق کے لیے وقف کر رکھی تھی جس پر انھیں قومی و بین الاقوامی سطح پر کافی پذیرائی حاصل ہوئی۔ پروفیسر مرغوب بانہالی کے انتقال پر کئی ادبی، علمی و سماجی شخصیات و تنظیموں نے اظہار تعزیت کیا ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 28 اپریل 2021

کمال جعفری

نئی دہلی: آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ مشہور شاعر ادیب اور معروف براڈ کاسٹر کمال جعفری کا 27 اپریل کو یہاں مختصر علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 68 برس تھی۔ پسماندگان میں 2 بیٹے ہیں۔ ان کی اہلیہ کا انتقال کچھ برس قبل ہو چکا تھا۔ ان کی تدفین بعد نماز عشا

عمل میں آئی۔ مرحوم کلکتہ یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے تھے اور انھوں نے اس میں گولڈ میڈل حاصل کیا تھا۔ وہ کمال کے شاعر تھے۔ حمد و نعت کے مجموعے بھی شائع کر چکے تھے۔ اس کے علاوہ ان کا شعری مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ وہ آل انڈیا ریڈیو اردو سروس دہلی سے سبکدوش ہوئے تھے۔ اس سے پہلے نیشنل چینل میں پروگرام ایگزیکٹیو کی حیثیت سے خدمت انجام دے چکے تھے۔ وہ پٹنہ میں آل انڈیا ریڈیو میں بھی کام کر چکے تھے۔ وہ بیک وقت کئی آواز نکالنے میں ماہر تھے۔ جعفری انتہائی ملنسار، زندہ دل انسان تھے۔ چھوٹوں سے شفقت سے پیش آتے تھے۔ انھوں نے اپنی ملازمت کے دوران اپنے چھوٹوں کی کافی حوصلہ افزائی کی تھی۔ وہ رشتہ نبھانا بخوبی جانتے تھے اور رشتوں کی قدر بھی کرتے تھے۔ ان کی ایک خوبی بے باکی بھی تھی۔ ان کے انتقال سے ایک بہترین حمد و نعت کا شاعر ہمارے درمیان سے اٹھ گیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 28 اپریل 2021

ضیاء الحق

نئی دہلی: سینئر صحافی ضیاء الحق کا بھی 23 اپریل دہلی کے ہولی فیملی اسپتال میں انتقال ہوگیا، مرحوم پچھلے کئی دنوں سے بیمار تھے اور کورونا پازیٹیو تھے۔ مرحوم چمپارن ضلع کے تھے، تاہم طویل عرصہ سے دہلی کے جامعہ نگر میں مقیم تھے۔ مرحوم اصحاب علم و فکر لوگوں میں سے تھے۔ ان کا اصل میدان صحافت تھا، لیکن انھوں نے صحافت کو صرف ایک پیشے کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک عظیم ذمے داری کی حیثیت سے اختیار کیا۔ انھیں انگریزی، اردو اور ہندی تینوں زبانوں پر پورا عبور حاصل تھا۔ اس کے علاوہ ایک بڑے عالم دین کے بیٹے ہونے کی وجہ سے انھیں عربی اور فارسی سے بھی خاصی مناسبت تھی، ان دونوں زبانوں کے اشعار، تعبیرات اور محاورات بھی ان کے حافظے میں موجود تھے۔ ضیاء الحق کی وفات پر اپنے شدید رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز کے چیئرمین ڈاکٹر محمد منظور عالم نے کہا کہ ان کی وفات سے مجھے شدید صدمہ پہنچا ہے جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا اور اسے میں اپنا ذاتی نقصان تصور کرتا ہوں۔ آئی او ایس کے سبھی اسٹاف اور کارکنان اس وفات پر غمزدہ ہیں اور اہل خانہ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 اپریل 2021

ریاض عظیم آبادی

پٹنہ: نصف صدی تک ہندی اور اردو صحافت میں ایک منفرد حیثیت سے جانے اور پہچانے جانے والے مشہور صحافی ریاض عظیم آبادی کا 17 اپریل جمعہ کی رات ساڑھے نو بجے اپنی رہائش گاہ نوارانی باغ کالونی عالم گنج میں حرکت قلب بند ہو جانے کے سبب انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 70 برس تھی۔ ان کے پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ 3 بیٹے اور 3 بیٹیاں ہیں۔ ریاض عظیم آبادی نے پٹنہ یونیورسٹی سے گریجویشن کیا، وہ قانون میں بھی گریجویٹ تھے اور جرنلزم میں ڈپلوما کی ڈگری لی تھی۔ انھوں نے ہفتہ وار 'مسائل' سے اپنے صحافتی کیریئر کی شروعات کی تھی۔ وہ اس سے بطور رپورٹر اور مینیجنگ ایڈیٹر 1968 سے 1974 تک منسلک رہے۔ بعد میں یہ ہفتہ وار کمیونسٹ پارٹی کا اخبار بن گیا۔ 1974 سے 1977 تک سیکولر ڈیموکریسی، نئی دہلی کے علاقائی نمائندہ رہے۔ 1977 سے 1986 تک ہفتہ وار 'بلٹز' کے بہار کے نمائندہ کی حیثیت سے اپنی خاص پہچان بنائی۔ 1991 سے 2000 تک دینک جاگرن کے بیورو چیف کی حیثیت سے کام کیا۔ 1994 میں ان کو ٹائمس فیلوشپ سے نوازا گیا تھا۔ انھوں نے 2001 میں انڈین نیشن اور آریہ ورت کے جنرل منیجر کا عہدہ سنبھالا اور 2002 سے 2005 تک 'سرس کرائم رپورٹر' کے ایڈیٹر رہے۔ 2007 میں انھوں نے اپنا پندرہ روزہ 'سیکولر محاذ' نکالا۔ وہ کئی سماجی و ملی اداروں سے بھی وابستہ تھے۔ کئی سالوں تک وہ آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت بہار کے جنرل سکریٹری بھی رہے۔ 2016 میں بہار اردو اکادمی نے انھیں غلام سرور صحافتی ایوارڈ سے نوازا تھا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 اپریل 2021

رضا حیدر

نئی دھلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر اور کئی کتابوں کے مصنف ڈاکٹر سید رضا حیدر 24 اپریل کو انتقال ہوگیا۔ ڈاکٹر رضا حیدر یکم جولائی 1972 کو پیدا ہوئے۔ وہ علی نگر پالی گاؤں بہار کے رہنے والے تھے اور ان دنوں غالب انسٹی ٹیوٹ میں بطور ڈائرکٹر اپنی خدمات انجام دے رہے تھے نیز یہیں ان کی رہائش تھی جب کہ پسماندگان میں اہلیہ اور بچے ہیں جو علی گڑھ میں رہتے ہیں۔ اطلاع کے مطابق کچھ روز قبل صحت خراب ہونے کے سبب وہ علی گڑھ چلے گئے تھے، وہیں ان کا علاج چل رہا تھا۔ ڈاکٹر رضا حیدر نے دہلی یونیورسٹی سے ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ ان کی کئی کتابیں بھی اب تک منظر عام پر آچکی ہیں جن میں مرزا سلامت علی دبیر، غالب اینڈ ہز ٹائمس، عہد حاضر میں شاعری کی معنویت کا مسئلہ اور غالب، مجاز حیات و خدمات، انیسویں صدی میں ادب، تاریخ اور تہذیب، شاہد ماہلی: عکس اور جہتیں، شاد عظیم آبادی حیات و خدمات، خواجہ میر درد حیات و خدمات، ہمارا تہذیبی اور ادبی ورثہ، غالب اور عہد غالب شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ان کے متعدد تحقیقی وتنقیدی مضامین ملک اور بیرون ملک کے رسائل میں شائع ہوکر منظر عام پر آچکے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 اپریل 2021

پروفیسر رضوان قیصر

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبۂ تاریخ کے استاذ، سابق صدر شعبہ اور ملک کے معروف وممتاز اکیڈمیشین پروفیسر رضوان قیصر کا 1 مئی کو انتقال ہوگیا ہے۔ رضوان قیصر ہندوستانی تاریخ وسماجیات کے عمیق النظر اور وسیع المطالعہ عالم تھے، خصوصاً تحریک آزادی اور اس ضمن میں ہندی معاشرے میں رونما ہونے والے انقلابات وتحریکات پر ان کی گرفت قابلِ رشک تھی۔ انھوں نے لگ بھگ تیس سال جامعہ کے شعبۂ تاریخ میں تدریسی خدمت انجام دی، ملک و بیرون ملک کے تحقیقی مجلّات میں ان کے درجنوں قیمتی مقالے شائع ہوئے، دسیوں قومی و بین الاقوامی سمیناروں اور مذاکروں میں شرکت کی۔ 2011 میں رضوان قیصر صاحب کی انگریزی زبان میں ایک بہت ہی اہم کتاب Maulana Azad and the Making of the Indian Nation برطانوی استعمار کے خلاف ہندوستانیوں کی جدوجہد، فرقہ وارانہ سیاست کے پس منظر اور ہندوستانی قوم کی تشکیلِ نو میں مولانا ابوالکلام آزاد کے کردار کے حوالے سے شائع ہوئی، جس کے مزید دو ایڈیشن 2013 اور 2018 میں شائع ہوئے۔ کتاب کی موضوعی اہمیت ووقعت کے پیشِ نظر اس کا عربی ترجمہ جامعہ ملیہ میں شعبۂ عربی کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر صہیب عالم نے کیا۔ فی الوقت وہ متعدد تاریخی وتحقیقی پروجیکٹس پر کام کررہے تھے اور علم ودانش کے حلقے کو ان سے بڑی امیدیں تھیں۔

سیّن شیّن عالم

رامپور: صولت پبلک لائبریری کے صدر اور احباب رامپور انٹرنیشنل کے جنرل سکریٹری اور معروف ادیب و شاعر اور محقق سیّن شیّن عالم کا حرکت قلب بند ہونے کے سبب دہلی کے میٹرو اسپتال میں 26 اپریل کو انتقال ہوگیا۔ مرحوم گذشتہ ایک ہفتہ سے پھیپھڑوں کی شکایت ہونے پر دہلی کے اسپتال میں زیرعلاج تھے۔ مرحوم کافی ملنسار اردو دوست نواز ہونے کے ساتھ ساتھ بہت سی ادبی تنظیموں سے وابستہ تھے۔ گذشتہ 50 برسوں سے اردو کی خدمت میں لگے ہوئے تھے۔ فی الوقت صولت پبلک لائبریری کے صدر باوقار عہدے پر فائز تھے۔ ان کے انتقال سے اردو دنیا بالخصوص دبستان رامپور میں ایک خلا پیدا ہوگیا ہے۔ وہ 67 برس کے تھے۔ مرحوم کے پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 27 اپریل 2021

عبرت بہرائچی

بہرائچ: مشہور بزرگ شاعر عبدالعزیز خاں عرف عبرت بہرائچی نے 25 اپریل کی شام اپنے مکان واقع محلّہ ناظر پورہ میں داعی اجل کو لبیک کہہ دیا۔ ان کے انتقال کی خبر ملتے ہی شعرا، علما، ادبا سمیت دیگر عزیز واقارب میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ مرحوم کی عمر 95 سال کی تھی۔ انھوں نے حمد ونعت ومنقبت، غزل پر مشتمل تقریباً 75 کتابیں لکھیں اور وہ نہ صرف اردو ادب کا چلتا پھرتا مدرسہ تھے بلکہ اردو ادب کے مجاہد وسپاہی بھی تھے اور اپنے حسن اخلاق سے لوگوں کو متاثر بھی کرتے تھے۔ مرحوم کے کئی شاگردوں نے مشاعروں کی دنیا میں بہرائچ کا نام روشن کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 اپریل 2021

رونق مصور عارفی

شاھجھاں پور: کہنہ مشق شاعر و ادیب رونق مصور عارفی کا حرکت قلب بند ہوجانے سے 26 اپریل کو انتقال ہوگیا۔ وہ 79 برس کے تھے۔ محلّہ ملاخیل میں رہنے والے شاعر وادیب رونق مصور عارفی گذشتہ ایک ہفتہ سے علیل چل رہے تھے۔ شام 5:40 بجے انھوں نے گھر میں ہی آخری سانس لی۔ پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ دو فرزند شاہکار مصور، ریحان مصور اور تین بیٹیاں ہیں جن میں دو بیٹیوں کی شادی ہوچکی ہے۔ ان کا ایک شعری مجموعہ 'بازیافت' شائع ہوا ہے۔ ان کے مضامین مسلسل ملک کے رسائل وجرائد اور اخبارات میں شائع ہوتے تھے۔ وہ عارف باللہ حضرت سید سلطان محمد عارف سے مرید و بیعت تھے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 27 اپریل 2021

عبدالغفار خاں

رامپور: بیباک اور متحرک صحافی ہفت روزہ 'گستاخیاں' کے مدیر اعلیٰ عبدالغفار خاں کا 82 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم بیباک اور متحرک صحافی تھے۔ انھوں نے ہمیشہ اپنے اخبار کے ذریعے دبے کچلے اور ستم رسیدہ

عوام کی آواز بلند کی۔ ان کی ادارت میں شائع ہونے والے ہفت روزہ اخبار کا عالم یہ تھا کہ لوگ ہفتہ بھر شدت سے اس کا انتظار کرتے تھے۔ مرحوم عبدالغفار خاں دبستان رامپور کی صحافت کی تاریخ میں ہمیشہ اپنی بے باکی اور عوامی مفاد کے لیے جدوجہد کرنے کے تئیں یاد رکھے جائیں گے۔ مرحوم کے پسماندگان میں 3 بیٹے اور 6 بیٹیاں ہیں۔

روزنامہ ہندوستان ایکسپریس، دہلی، 26 اپریل 2021

دانش عامری

دیوبند: معروف شاعر دانش عامری کا طویل علالت کے بعد 20 اپریل کو دہلی سے دیوبند لاتے ہوئے راستہ

ہی میں انتقال ہوگیا۔ دانش عامری نامور اور ممتاز نثر نگار مولانا عامر عثمانی کے بڑے صاحبزادے تھے۔ دانش عامری گذشتہ ایک ڈیڑھ سال سے پھیپھڑوں کے شدید عارضہ میں مبتلا تھے۔ ڈاکٹر نواز دیوبندی نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ دانش عامری شاعر بھی تھے اور بہترین آرٹسٹ بھی، ان کا انتقال دیوبند کے ادبی حلقہ کا نقصان ہے۔ دانش عامری مرحوم کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ ان کا مکمل ایک شعر زبان زد خاص و عام ہے اور اردو دنیا میں کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی عنوان سے گشت کرتا رہتا ہے۔ وہ اردو کا مسافر ہے، اس شعر نے بڑی مقبولیت اور شہرت حاصل کی۔ دانش عامری کا یہ شعر کئی مجموعوں پر بھاری ہے۔ اس کے علاوہ دیوبند کے مقامی شعرا شمیم کرتپوری، دلشاد خوشتر، رضی عثمانی، تنویر اجمل، اعظم صابری، عدنان انور، فیصل عثمانی، سہیل اکمل کے علاوہ کالم نگار سید وجاہت شاہ اور معروف ادیب عبداللہ عثمانی نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا ہے کہ دانش عامری ایک بہترین وخلیق انسان ہونے کے ساتھ شگفتہ مزاج شخصیت کے مالک تھے اور محفل کو زعفران زار بنا دیتے تھے۔ انھیں اپنے والد کی ذہانت اور کمال کا ایک حصہ ورثہ میں ملا تھا۔

روزنامہ سچ کی آواز، دہلی، 21 اپریل 2021

پروفیسر ہمایوں مراد

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ حیوانات سے سبکدوش سینئر استاذ اور معروف شخصیت پروفیسر ہمایوں مراد کا مختصر علالت کے بعد 21 اپریل کو انتقال ہوگیا۔

ہمایوں مراد کے انتقال پر گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر طارق منصور نے کہا کہ پروفیسر مراد کی رحلت ان کے لیے ذاتی نقصان ہے اور یونیورسٹی برادری کے لیے بھی یہ ایک بڑا خسارہ ہے۔ وہ نہ صرف ایک اچھے استاد تھے بلکہ نہایت نفیس اور مرنجاں مرنج شخصیت کے مالک تھے اور طلبہ کے ساتھ ہی اساتذہ کے درمیان ان کو عمومی مقبولیت حاصل تھی۔ پروفیسر مراد نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی کئی حیثیتوں سے خدمت کی اور پراکٹر، کنٹرولر امتحانات، آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی (وی سی سکریٹریٹ) اور اموٹا کے صدر کی حیثیت سے انھوں نے امتیازی نقوش چھوڑے۔ پروفیسر مراد اے ایم یو پنشنرویلفیئر ایسوسی ایشن کے موجودہ صدر بھی تھے۔

روزنامہ ہندوستان ایکسپریس، دہلی، 22 اپریل 2021

نسیم حسن پتن

امروہہ: امروہہ سے تعلق رکھنے والی عالمگیر شہرت کی حامل معروف ادبی شخصیت، صاحب ذوق اور ہزارہا اشعار کے حافظ، نسیم حسن پتن ابن نجم الحسن نقوی کا 20

اپریل پاکستان میں انتقال ہوگیا، ان کی عمر 85 سال بتائی جاتی ہے۔ مرحوم کا تعلق شہر امروہہ کے محلہ شفاعت پورہ سے تھا۔ وہ نہایت ہی خوش اخلاق انسان تھے اور شہر امروہہ سے بہت محبت رکھتے تھے۔ انتقال پرملال کی خبر امروہہ پہنچتے ہی امروہہ کی فضا سوگوار ہوگئی۔ امروہہ میں مرحوم کے عزیز ہلال مہدی، اقبال نقوی کو لوگوں نے تعزیت پیش کی۔ معروف شاعر اور ناظم محفل کمال امروہوی نے مرحوم نسیم حسن عرف بھائی پتن کے انتقال پر اظہار رنج وغم کرتے ہوئے بتایا کہ مرحوم نے امروہہ سے بے انتہا عشق کیا، جب بھی کوئی امروہہ یا ہندوستان سے پاکستان جاتا تو وہ صرف امروہہ کے قصے سناتے یا سننا پسند کرتے۔ ان کا تعلق محکمہ انکم ٹیکس سے تھا۔ تاریخ امروہہ پر ان کی گہری نظر تھی۔ ان کی داستان گوئی کا انداز بھی منفرد تھا۔ کاروان خلوص کے سرپرست نواب سید انتظام علم خان نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ مرحوم کا ادبی مطالعہ بہت وسیع تھا، وہ امروہہ کی انسائیکلوپیڈیا تھے۔ نہ جانے کتنے اشعار، ادبی واقعات ان کو زبانی یاد تھے، جب بھی امروہہ آتے تھے کاروان خلوص کے دفتر میں ضرور حاضری دیتے تھے اور اپنے منفرد انداز میں داستان گوئی کرتے۔ اپنے شہر امروہہ سے ان کو بہت پیار تھا۔

روزنامہ صحافت، دہلی، 21 اپریل 2021

فاروق سلیم

نئی دھلی: ہفت روزہ نئی دنیا میں عرصہ دراز سے صحافتی خدمات انجام دینے والے فاروق سلیم کا 20 اپریل کو الشفا اسپتال میں شام ساڑھے پانچ بجے انتقال ہوگیا۔ وہ چند

روز سے بیمار تھے اور صبح میں سانس لینے میں دشواری ہونے کی وجہ سے انھیں الشفا اسپتال میں داخل کیا گیا اور انھیں آکسیجن لگا دیا گیا لیکن وہ جانبر نہیں ہو سکے۔ بزم احباب کے بانی سالک دھامپوری، حامد علی اختر، راشد اعظمی، مرتضیٰ آزاد، اشرف علی بستوی، نسیم مجیدی، ڈاکٹر حفظ الرحمٰن خاں، ظفر انور اور محمد الفوز وغیرہ نے مرحوم کے درجات کی بلندی اور پسماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کی ہے۔

روزنامہ ہندوستان ایکسپریس، دہلی، 21 اپریل 2021

مختار احمد شاد

نجیب آباد: نجیب آباد کے قصبہ جلال آباد کے استاد شاعر مختار احمد شاد کا 21 اپریل کو صبح ساڑھے پانچ بجے انتقال ہو گیا۔ وہ کافی وقت سے علیل چل رہے تھے۔ سانس کے مرض میں مبتلا تھے، ان کے انتقال سے ادیبوں وشعرا میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ بعد نماز ظہر ان کو سپرد خاک کیا گیا۔ ان کے جنازے میں معزز شخصیات سمیت کثیر تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ مختار احمد شاد ایک نہایت ہی سادہ مزاج، خوددار مزاج کے مالک تھے، وہ بہت سوچ سمجھ کر شعر کہتے تھے، ان کی شاعری میں سماج کا کرب ہوتا تھا۔ وہ سماج کو ایک پیغام دینے والی شاعری کرتے تھے۔ ان کا شمار استاد شعرا میں ہوا کرتا تھا۔

روزنامہ اخبار مشرق، دہلی، 22 اپریل 2021

تبسم فاطمہ

نئی دھلی: معروف کالم نگار وافسانہ نگار اور مشرف عالم ذوقی کی اہلیہ تبسم فاطمہ کا 20 اپریل کو انتقال ہوگیا۔ 3 جولائی 1972 کو تبسم فاطمہ کی ولادت آرا بہار میں ہوئی

تھی۔ اس وقت مرحومہ کی عمر محض 48 سال کی تھی۔ وہ روزنامہ 'انقلاب' میں مستقل کالم نگار تھیں۔ وہ ایک اچھی افسانہ نگار بھی تھیں۔ تبسم فاطمہ کے اندر بھی ذوقی کی طرح ہی بے باکی تھی۔ دونوں ایک طرح سے ہی سوچتے اور لکھتے تھے۔ واضح رہے کہ مشرف عالم ذوقی سے پہلے سے ان کی صحت خراب تھی۔ شوگر زیادہ ہونے کے سبب کئی مرتبہ ان کی حالت نازک ہوچکی تھی جس کی اطلاع خود مشرف عالم ذوقی نے دی تھی۔ مشرف عالم ذوقی کی رحلت کے ایک دن بعد ہی ان کی اہلیہ کی رحلت نے ایک مرتبہ پھر پوری ادبی دنیا کو سوگوار کردیا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 اپریل 2021

عشرت لکھنوی

لکھنؤ: عالمی شہرت یافتہ شاعر اہل بیت کاظم حسین رضوی عشرت لکھنوی کا 19 اپریل کو حرکت قلب بند ہوجانے کے سبب انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 71 سال تھی۔ سوگواروں کی کثیر تعداد میں نم آنکھوں کے ساتھ انھیں کربلا تال کٹورہ میں سپرد خاک کردیا گیا۔ پسماندگان میں دو بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔ رثائی ادب میں اپنی منفرد شناخت رکھنے والے عشرت لکھنوی تہذیب کے ورثہ دار، غریب پرور، علم دوست، حق گو، بیباک، مبلغ پیغامات قرآن کریم تھے۔ نوحہ گوئی کے فن میں ماہر تھے۔ ان کے کہے گئے مراثی کے کئی مجموعے منظر عام پر آئے جن میں فرات غم اشکوں کی زباں قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ اسلام کا مجموعہ نقطۂ ادب اور نوحوں کا مجموعہ تسبیح عزا کے عنوان سے منظر عام پر آئے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 اپریل 2021

ڈاکٹر نسرین رئیس خان

نئی دھلی: پرانی دہلی کے ادبی گھرانہ سے تعلق رکھنے والی استانی ڈاکٹر تسلیمہ نسرین رئیس خان کی 16 اپریل 2021 کی شام اچانک موت کی خبر نے دہلی کے اردو حلقے میں غم کی لہر دوڑا دی۔ مرحومہ شعبہ اردو ستیہ وتی کالج دہلی یونیورسٹی میں درس وتدریس سے وابستہ رہیں۔ وہ ایس او ایل وغیرہ کی کلاسیں بھی لیتی رہیں۔ انھوں نے ایس او ایل کے اردو نصاب کے نوٹس بھی تیار کیے۔ وہ کالج کے اساتذہ اور طلبا کے درمیان حد درجہ محترم اور ہر دل عزیز تھیں۔ ان کی دائمی مفارقت پر کالج کے تمام اساتذہ کے پیغام تعزیت اس بات کے شاہد ہیں کہ وہ اساتذہ اور طلبا و طالبات کے مابین کتنی مقبول تھیں۔ ستیہ وتی کالج کی سابق پرنسپل ڈاکٹر منجولا داس نے ذاتی طور پر فون کر کے اپنے شدید قلبی درد وغم کا اظہار کیا ہے۔ موجودہ پرنسپل ڈاکٹر نرمل جندل صاحبہ جی نے بھی اور اسٹاف ایسوسی ایشن کے تمام عہدیداران نے تعزیت پیش کی ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 اپریل 2021

مملکت بدر

کولکاتا: نواب واجد علی شاہ کے خاندان کی بہو اور خاندان اجتہاد کی بزرگ خاتون مملکت بدر کا کولکاتا میں طویل علالت کے بعد 26 اپریل کو انتقال ہوگیا۔ وہ 83 برس کی تھیں۔ ان کے پسماندگان میں دو بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں۔ مرحومہ بدر مملکت لکھنؤ کے استاد شاعر فضل نقوی کی صاحب زادی تھیں اور خود بھی کہنہ مشق شاعرہ اور افسانہ نگار تھیں، ان کی کئی کتابیں اور ایک مجموعہ کلام بھی شائع ہوچکا ہے۔ وہ ہفت روزہ 'نظارہ' کی معاون مدیر بھی کئی برس تک رہیں۔ مرحومہ کے شوہر نواب واجد علی شاہ کے پرپوتے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق پروفیسر ڈاکٹر کوکب قدر تھے جن کا گذشتہ سال کورونا کے باعث انتقال ہوگیا تھا۔ وہ 'انقلاب' کے ایڈیٹر شکیل شمسی کی خوش دامن بھی تھیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 اپریل 2021

ڈاکٹر سجاد مہدی حسینی

دھلی: شعبۂ اردو ستیہ وتی کالج کے ہر دلعزیز استاد ڈاکٹر سجاد مہدی حسینی بھی رب حقیقی سے جاملے۔ 24 اپریل کی دوپہر کو ان کی اچانک موت کی خبر نے کالج کی پرنسپل، تمام اسٹاف اور طلبہ وطالبات کو سوگوار کردیا۔ تمام اساتذہ اور طلبہ وطالبات کے پیغامات اس بدیہی حقیقت کے شاہد ہیں۔ کالج کی پرنسپل ڈاکٹر نرمل جندل اور اسٹاف ایسوسی ایشن کے تمام عہدے داروں نے ذاتی طور پر اپنے تعزیتی کلمات کا بڑے دلخراش لہجے میں اظہار کیا ہے اور مرحوم کی

روح پرور رحمت ذات پروردگار کے نزول کے لیے دعا کی۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد ڈائرکٹر قومی اردو کونسل نے ان کی رحلت پر انتہائی غم وافسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے عزیز دوست اور طالب علموں کے ہر دل عزیز استاد کو کھو دیا ہے۔ شعبۂ اردو ستیہ وتی کالج کے ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر قمر الحسن نے اپنے محترم رفیق کار کی حادثاتی موت پر گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہم نہ صرف ایک رفیق بلکہ ایک صالح اور مثبت فکر کے مالک استاد سے محروم ہوگئے۔ ان کے اچانک انتقال سے اردو دنیا میں ایک اچھے استاد کی کمی کا مدت تک احساس رہے گا۔ ڈاکٹر سرفراز جاوید نے ان کے انتقال پر گہرے دکھ اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم نہایت مخلص، صوفی منش، با اخلاق، یقین کامل اور توکل علی اللہ کے ساتھ بہت سادہ طبیعت، متواضع اور منکسر المزاج شخصیت کے مالک تھے۔ وہ صلح فکر کے ساتھ بڑی علمی استعداد رکھتے تھے۔ وہ اپنے جونیئر رفقاء کار اور طالب علموں کی رہنمائی بڑے عاجزانہ انداز میں کرتے تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 اپریل 2021

فرقان سنبھلی

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ویمنس کالج میں شعبۂ اردو کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر محمد فرقان (سنبھلی) کا

مختصر علالت کے بعد 27 اپریل کو 48 برس کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ ڈاکٹر محمد فرقان کا تعلق ضلع سنبھل سے تھا اور آپ کی پیدائش 20 جون 1973 کو ہوئی تھی۔ ڈاکٹر فرقان نے اپنی پی ایچ ڈی کی ڈگری 2015 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے حاصل کی جس کے بعد ان کا 2015 میں ہی اے ایم یو ویمنس کالج میں اردو کے لیے گیسٹ

ٹیچر کی حیثیت سے تقرر عمل میں آیا۔ ڈاکٹر محمد فرقان کو 2019 میں ترقی دے کر اسسٹنٹ پروفیسر (کنٹر کچول) کی حیثیت سے مقرر کیا گیا۔ ڈاکٹر محمد فرقان نے حال ہی میں اے ایم یو ویمنس کالج کے بانی شیخ عبداللہ (پاپا میاں) پر ایک مونوگراف تیار کیا تھا جس کا اجرا شاندار طریقے سے اے ایم یو کی صد سالہ تقریبات کے موقعے پر سرسید اکیڈمی میں وائس چانسلر پروفیسر طارق نے خود کیا تھا۔ ڈاکٹر محمد فرقان اپنی اہلیہ اور دو صاحبزادوں کے ساتھ علی گڑھ کے سول لائن علاقے میں مقیم تھے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 28 اپریل 2021

تحسین عثمانی

نئی دھلی: معروف صحافی تحسین عثمانی کا پی ایڈیٹر اسپین میگزین کا 23 اپریل کو فرید آباد کے اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ وہ کچھ دنوں سے بیمار تھے اور وینٹی لیٹر پر تھے۔ وہ 15 سال سے زیادہ عرصہ سے دہلی کی اخباری دنیا میں بہت سرگرم تھے۔

وہ انتہائی نیک اور شریف آدمی تھے۔ ان کا تعلق بہار کے گیا ضلع سے تھا۔ وہ انتہائی ذہین، محنتی اور مرنجاں مرنج صحافی تھے اور اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے بہت جلد ساتھیوں کے دلوں میں جگہ بنا لیتے تھے۔ انھوں نے نئی دنیا، راشٹریہ سہارا، ہندوستان ایکسپریس اور کئی مشہور اخباروں میں صحافتی خدمات انجام دیں پھر وہ امریکی رسالہ اسپین میں شامل ہوگئے۔ ان کی رحلت سے دہلی کی صحافتی برادری میں جو خلا پیدا ہوگیا ہے وہ تادیر محسوس کیا جائے گا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 24 اپریل 2021

مولانا خالد حنیف صدیقی

دھلی: معروف صاحب قلم، قرآن کریم و کئی کتب احادیث کے ہندی مترجم، متعدد دستاویزی کتابوں کے مرتب مولانا خالد حنیف صدیقی وفات پاگئے۔ مولانا خالد حنیف صدیقی کا تعلق بیتنار، ضلع سدھارتھ نگر، صوبہ اتر پردیش سے تھا۔ وہ جامعۃ الفلاح اور جامعہ فیض عام مئو کے فارغ التحصیل ایک باصلاحیت صاحب قلم تھے۔ انھوں نے ایک مدت تک مرکزی جمعیت کے آرگن جریدہ ترجمان میں اپنی خدمات انجام دیں۔ پھر ملک کے کئی اداروں اور شخصیتوں سے وابستہ ہوکر تصنیفی و تحقیقی کام انجام دیا۔ جب کہ ترجمہ و ترتیب کے کئی اہم منصوبے بطور فری لانسر تکمیل تک پہنچائے، جن میں مرکزی جمعیت کے زیر اہتمام اور مرکزی جمعیت کے موجودہ امیر اور اس وقت کے ناظم اعلیٰ مولانا اصغر علی امام مہدی سلفی کے زیر نگرانی و رہنمائی میں شائع ہونے والی دستاویزی پیش کش یادگار مجلّہ بہ مناسبت پاکوڑ کانفرنس، ڈائرکٹری مدارس اہل حدیث نقش اوّل، تراجم علماء اہل حدیث جلد اول، مدارس اہل حدیث دہلی قابل ذکر ہیں۔ مرکزی جمعیت نے ایک نیا سلسلہ مساجد و مکاتب اہل حدیث کی ترتیب کا کام ان کو سونپا تھا جو افسوس کہ نہیں ہوسکا۔ وہ سادگی پسند، بڑے محنتی اور دھن کے پکے تھے۔ افسوس کہ 20 اپریل 2021 کو بوقت ظہر تقریباً 65 سال کی عمر میں مختصر علالت کے بعد دہلی میں ان کا انتقال ہوگیا۔ پسماندگان میں اہلیہ، تین صاحب زادے تنزیل الرحمٰن، ضیاء الرحمٰن اور عزیز الرحمٰن، چار صاحبزادیاں اور متعدد پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 22 اپریل 2021

الف احمد برق

بنگلورو: ریاست کے معروف شاعر، ادیب اور افسانہ نگار محمد عبیدالرحمن عرف آفتاب احمد المعروف الف احمد برق (76) ابن محمد دستگیر صاحب مرحوم، مختصر سی علالت کے بعد بروز منگل 27 اپریل 2021 کی دوپہر انتقال کرگئے۔ موصوف نے اردو زبان و ادب کی بہت خدمت انجام دی ہے۔ وہ مشہور ادبی تنظیم بزم عروج ادب کے بانیوں میں سے تھے۔ ان کی دو کتابیں 'قدم بہ قدم' (شعری مجموعہ) اور 'اعمال نامے' (شخصی خاکوں کا مجموعہ) منظر عام پر آکر مقبولیت حاصل کرچکی ہیں۔ وہ مزید شعری، افسانوں اور خاکوں کے ایک اور مجموعوں پر کام کررہے تھے۔ پسماندگان میں زوجہ، فرزند اور دو دختران شامل ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی 28 اپریل 2003

انجینئر خالد فریدی

علی گڑھ: معروف شاعر انجینئر خالد فریدی کا یہاں مختصر علالت کے بعد علی گڑھ میں 18 اپریل کو انتقال ہوگیا۔ پسماندگان میں بیوی دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ تدفین شوکت منزل سول لائن علی گڑھ کے قبرستان میں عمل میں آئی۔ مرحوم کے قریبی دوست مرزا اطہر بیگ علیگ نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ خالد فریدی ایک نیک دل انسان تھے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ دینیات کے استاد ڈاکٹر مولانا اصغر اعجاز قاسمی نے کہا کہ خالد فریدی معروف شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں اہل بیت سے سچی محبت کے جذبات کوٹ کوٹ کر بھرے تھے۔ تاریخی حقائق پر ان کی گہری نظر تھی۔ ان کے کلام میں علم حلم و حسن اخلاق اور ایمان و عرفان کی روشنی نیز محبت و مودت کی مکمل کارفرمائی ہوتی تھی۔ وہ امامیہ سوسائٹی علی گڑھ کی جانب سے منعقد کی جانے والی طرحی و غیر طرحی محافل میں اپنا کلام پیش کرتے تھے۔ ان سب خصوصیات کے ساتھ ساتھ وہ ایک اچھے انسان بھی تھے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 19 اپریل 2021

شرافت حسین

بسکھاری، امبیڈکرنگر: صنعتی علاقہ ٹانڈہ کے مشہور افسانہ نگار، مشہور شاعر، طنز نگار اور ایک درجن کتابوں کے مصنف شرافت حسین کے کورونا وائرس سے انتقال سے محبان اردو نے رنج و غم کی چادر اوڑھ لی ہے جو اپنے قیمتی اور نایاب دوہوں سے عوام کو بیدار کرتے ہوئے زندگی میں خوشی کے رنگ بھرتے رہتے تھے۔ وہ ہمیشہ اپنی تخلیقات سے عوام کا حوصلہ بڑھانے کی ترغیب دیتے تھے۔ انھوں نے سوتی ہوئی قوم کو بیدار کرنے کے لیے کام کیا۔ جب کہ معاشرے میں پھیلی ہوئی بدامنی اور برائیوں کو اپنے خوبصورت دوہوں سے دور کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ قومی اردو تحریک فاؤنڈیشن کے صدر انس مسرور انصاری، محمد شفیع نیشنل انٹر کالج بنسور کے استاد محمد اسلم خان، ڈاکٹر امین احسن انصاری، شمشاد منظری، غفران کمالی، کوثر حیات، شاداب احمد، اشہر حمیدی، مزاحیہ شاعر ہلچل ٹانڈوی، شاعر خالد اعظم، دبیر احمد ایڈووکیٹ، مقدر کچھوچھوی، فیروز احمد کچھوچھوی، فضل اللہ خان خادم کچھوچھوی، مولانا محمد قاسم خان کچھوچھوتی، جمال الدین سفر، کوی آریہ ہریش کوشل پوری، ڈاکٹر کاظم رضا، شیرز فاضل وغیرہ محبان اردو نے خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 8 مئی 2021

مفتی اعجاز ارشد قاسمی

نئی دھلی: معروف عالم دین، مسلم پرسنل لا بورڈ کے رکن مفتی اعجاز ارشد قاسمی کا 17 اپریل کو ایک پرائیویٹ اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 46 سال تھی۔ ان کے پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ دو بیٹیاں، ایک بیٹا اور والدین ہیں۔ مفتی اعجاز ارشد کئی شعبوں میں سرگرم تھے۔

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد کئی اخبارات سے وابستہ رہے اور دارالعلوم دیوبند میں بھی ملازمت کی۔ انھوں نے دہلی یونیورسٹی سے ایم اے (اردو) اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی (جے این یو) سے پی ایچ ڈی بھی کی تھی۔ انھوں نے کم عرصے میں اپنی شناخت بنائی تھی۔ ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آکر مقبول ہوئیں۔ 'من شاہ جہانم' ان کی ایسی تصنیف تھی جسے صحافتی حلقے میں بہت پسند کیا گیا۔ دارالعلوم دیوبند اور مدارس کی صحافت اور ادب پر بھی ان کی متعدد کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہوئیں۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 اپریل 2021

فقیر چند ناشاد دہلوی

نئی دھلی: معروف استاذ شاعر سیف سحری کے شاگرد فقیر چند ناشاد دہلوی کا 65 سال کی عمر میں 9 اپریل کو انتقال ہوگیا، تدفین آر کے پورم میں کی گئی۔ ان کے پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو لڑکے اور چار لڑکیاں ہیں۔ ناشاد دہلوی چار سال قبل ایمس کی سروس سے سبکدوش ہوئے تھے جس کے بعد سے انھوں نے تمام تر توجہ اردو ادب پر کر رکھی تھی اور مشق سخن کو تیز کر دیا تھا، یہی وجہ ہے کہ ان کا مجموعہ بھی زیر ترتیب تھا مگر افسوس کہ ان کی زندگی میں منظر عام پر نہ آسکا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 10 اپریل 2021

شمشاد جلیل شاد

پونے: معروف شاعرہ اور ادیبہ شمشاد جلیل تاکید ارشاد 9 اپریل کو انتقال کر گئیں۔ وہ گذشتہ چند روز سے سخت علیل تھیں۔ پونے کے اسپتال میں انھیں مصنوعی تنفس پر رکھا گیا تھا لیکن وہ جانبر نہ ہوسکیں۔ جمعرات کی رات ساڑھے بارہ بجے ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ چونکہ ان کا

تعلق احمد نگر سے تھا اسی لیے ان کا جسد خاکی احمد نگر لے جایا گیا اور وہیں ان کے خاندانی قبرستان میں 10 اپریل کو ان کی تدفین عمل میں آئی۔ پسماندگان میں شوہر، بیٹا اور بیٹی ہیں۔ شمشاد جلیل شاد نہ صرف شاعرہ تھیں بلکہ انھوں نے افسانوں، سفرناموں اور نعتیہ شاعری میں بھی طبع آزمائی کی تھی۔ پونے سے شائع ہونے والے معروف ادبی مجلّہ 'اسباق' کی معاون مدیر بھی تھیں۔ پونے اور دکن کی ادبی محفلوں میں پیش پیش رہنے والی شمشاد جلیل کے بارے میں مدیر اسباق اور ملک کے سینئر ادیب نظیر فتح پوری نے بتایا کہ ''شمشاد جلیل گذشتہ 20 برس سے شاعری کر رہی تھیں لیکن ان میں خودنمائی کا عنصر بالکل نہیں تھا بلکہ وہ ادب کی خدمت کو اپنا نصب العین بنا کر مسلسل سرگرم تھیں۔ بنیادی طور پر وہ شاعر تھیں اور ان کی شاعری نسوانی لہجے کی عام فہم شاعری تھی۔ انھوں نے غزلوں میں زیادہ طبع آزمائی کی لیکن نعتیہ کلام اور ماہیوں پر بھی توجہ دی۔ ساتھ ہی افسانے بھی لکھے لیکن ان کی شاعری اپنی جانب مبذول کرواتی ہے۔ واضح رہے کہ شمشاد جلیل شاد کی 4 کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں پہلی دھوپ کا سایہ (شاعری)، کیسر کی مہک (افسانے)، نعتیہ ماہیے، شہر سخن کا مسافر نظیر فتح پوری، نظیر فتح پوری روبرو اور امریکہ میں اردو شکاگو کے حوالے سے شامل ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 10 اپریل 2021

ڈاکٹر توصیف حسن نقوی

امروھہ: شہر کے تعلیمی ادارے آر بی ایم ڈگری کالج، میسکو پبلک اسکول اور میسکو کالج آف نرسنگ کے شریک بانی، مشہور ماہر تعلیم، ڈاکٹر توصیف حسن نقوی کا 10 اپریل ہفتے کے روز مرادآباد کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ ڈاکٹر توصیف حسن کا تعلق امروہہ کے علمی گھرانہ سے تھا۔ آپ کے والد غیور حسن نقوی میونسپل بورڈ کے تحت پرائمری اسکولوں میں تعلیم کے معیار کو برقرار رکھنے کے ذمہ دار تھے۔ ان کی کتاب 'حلیے اور خاکے' اردو ادب کا سنگ میل ہے۔ مرحوم کے تینوں بھائی صرف تعلیم کے شعبے سے وابستہ رہے ہیں۔ یاد رہے کہ توصیف حسن

تین دہائی تک امروہہ کے عبدالکریم خان انٹر کالج سے وابستہ رہے۔ روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 11 اپریل 2021

محمد آصف

نئی دھلی: یونائیٹڈ نیوز آف انڈیا (یو این آئی) اور روزنامہ راشٹریہ سہارا کے سابق کارکن محمد آصف علی کا 10 اپریل کو صبح دل کا دورہ پڑنے سے دہلی کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 52 برس تھی۔ پسماندگان میں اہلیہ دو بچے اور والدین ہیں۔ نماز جنازہ اور تدفین بعد نماز ظہر بٹلہ ہاؤس قبرستان میں ہوئی۔ مرحوم آصف علی نہایت ملنسار، بااخلاق، فعال اور سماجی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والے انسان تھے۔ ان کی اہلیہ رخسانہ بیگم یو این آئی اردو سروس سے حال ہی میں سبکدوش ہوئی ہیں۔ ان کے والدین بہار کے ارریہ میں ہیں جب کہ ان کے دو چھوٹے بھائی مصعب انیس اور رضا دہلی میں مقیم ہیں۔ ان کی ایک چھوٹی بہن بھی دہلی میں ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 11 اپریل 2011

کلیم عرفی

پریاگ راج: اردو ادب کے مشہور قلمکار کلیم عرفی کا 93 سال کی عمر میں 11 اپریل کو ان کی الہ آباد واقع رہائش گاہ پر انتقال ہوگیا۔ وہ طویل عرصے سے کڈنی کے عارضہ میں مبتلا تھے۔ 2 اکتوبر 1928 کو پیدا ہونے والے عرفی طویل عرصے تک ممبئی میں مقیم رہے۔ علالت کی وجہ سے 10 برس قبل وہ پریاگ راج آگئے تھے۔ کلیم عرفی کے بیٹے جاوید عرفی نے بتایا کہ ان کے والد نے ہندی، انگریزی اور اردو ادب کی مختلف صنفوں میں 100 سے زیادہ کتابیں لکھیں۔ ان میں بنیادی طور پر کہانیاں، ناول، ڈرامے،

بچوں کا ادب، پردے اور مختصر کہانیاں غیرہ شامل تھیں۔ عرفی کو ان کے ناول 'ساتویں یاترا' کے لیے اردو اکادمی ایوارڈ بھی مل چکا ہے، علاوہ ازیں وزارت صحت اور بہار کی حکومت نے بھی ان کی ادبی خدمات کو سراہا ہے۔ انھوں نے متعدد فلموں کا اسکرپٹ بھی لکھا۔ ان کی مقبول ترین کتابوں میں بال ویر کتھا ساگر، بال کتھا ساگر، ناول رضیہ سلطان، زیب النساء، ایک مٹھی آسمان، سائیکی اور ناٹیہ ساگر قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 اپریل 2021

رضا سرسوی

سرسی سادات: عالمی شہرت یافتہ شاعر رضا سرسوی کی پیدائش سرسی میں ہوئی۔ ان کا پورا نام سید نوشہ رضا تھا۔ والد کا نام قاضی رئیس الحسن تھا۔ وہ کئی ماہ سے بیمار چل رہے تھے۔ اچانک مغرب کے وقت ان کو گھبراہٹ محسوس ہوئی تو فوراً سنبھل کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں داخل کرایا گیا، وہاں سے حالت تشویشناک ہونے پر ڈاکٹروں نے مرادآباد ایشین اسپتال ریفر کردیا۔ مرادآباد پہنچنے پر وہاں کے ڈاکٹر نے ان کو مردہ قرار دے دیا۔ اگلے روز ان کو ان کے آبائی قبرستان دادے شاہ علی میں سپرد خاک کیا گیا۔ رضا سرسوی کی کئی کتابیں ہندی، اردو، انگریزی میں شائع ہوچکی ہیں۔

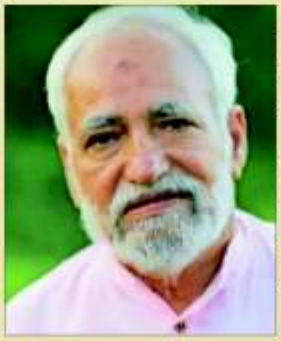

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 اپریل 2021

نسیم عباسی

نئی دہلی: دہلی یونیورسٹی کے سابق اسسٹنٹ لائبریرین مشہور شاعر، ادیب جناب نسیم عباسی کا ان کی رہائش گاہ واقع بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی میں بروز منگل 13 اپریل 2021 کو شام ساڑھے پانچ بجے انتقال ہوگیا۔

نسیم عباسی یکم نومبر 1938 کو امروہہ میں پیدا ہوئے تھے۔ اسسٹنٹ لائبریرین کے عہدے سے سبکدوش ہوگئے تھے، ان کا مستقل قیام بستی حضرت نظام الدین میں تھا۔ افسوس کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا کہ غالب اکیڈمی سے ان کا دیرینہ تعلق تھا۔ غالب اکیڈمی کی لائبریری کی فہرست سازی انھوں نے ہی کی تھی۔ وہ اردو سرٹیفکیٹ، اردو ڈپلومہ کورس کے طلبا کو پڑھاتے تھے۔ وہ کئی زبانیں جانتے تھے۔ اردو فارسی، ہندی، سنسکرت، پنجابی، گجراتی اور انگریزی سے انھیں واقفیت تھی۔ فارسی اور اردو میں شعر کہتے تھے۔ یونیورسٹی کی لائبریری میں انھیں مطالعہ کا خوب موقع ملا۔ 1978 میں ان کی پہلی کتاب 'نقد فیض' شائع ہوئی۔ ہندی میں دیوان غالب کی آسان شرح غالب اکادمی سے شائع ہوئی۔ یادگار غالب کے فارسی متن کا انھوں نے اردو ترجمہ کیا۔ ان کی یادداشت بہت اچھی تھی۔ ان کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 15 اپریل 2021

عبدالحفیظ صدیقی

نئی دہلی: فراش خانہ دہلی کے قدیم ادارے مظہرالاسلام سیکنڈری اسکول کے سابق استاد عبدالحفیظ صدیقی کی میت دہلی گیٹ قبرستان میں سپرد خاک کردی گئی۔ انھوں نے 8 اپریل کو 96 سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا اور ہزاروں شاگردوں اور عزیز واقربا کو سوگوار چھوڑ کر دار فانی سے رخصت ہوگئے۔ مرحوم بے حد مشفق استاد اور پختہ شاعر تھے۔ آپ کے دو مجموعہ کلام طباعت کے مراحل میں ہیں جن میں ایک غزلیات پر مشتمل ہے جب کہ ایک نعتوں کا مجموعہ ہے۔ مرحوم عبدالحفیظ صدیقی یوپی کے امروہہ سے آکر دلی میں مقیم ہوگئے تھے۔ اپنے درس و تدریس سے وابستگی کے زمانے میں طلبا کو فن تقریر سے آراستہ کرنے میں انھیں خاص مہارت حاصل تھی۔ معروف شاعر جون ایلیا عبدالحفیظ صدیقی کے ہم عصر اور خاص دوست تھے۔ مرحوم کے پسماندگان میں دو بیٹے، چار بیٹیاں اور ہزاروں شاگرد شامل ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 9 اپریل 2021

سیف سہسرامی

سہسرام: اردو کے مشہور شاعر سیف سہسرامی 15 اپریل کو دارفانی سے رخصت ہوگئے۔ وہ 81 سال کے تھے اور کافی دنوں سے علیل تھے۔ انھوں نے آخری سانسیں اپنی رہائش گاہ محلہ نور گنج میں لیں۔ پسماندگان میں ایک بیوہ بیٹی سیدہ ماہ نور اور کئی بھتیجے شامل ہیں۔ مرحوم نے ہندو پاک میں شاگردوں کی کثیر تعداد اور معتد بہ کلام یادگار چھوڑا ہے۔ سیف سہسرامی کی پیدائش 1940 میں حکیم سید واجد حسین کے گھر ہوئی تھی۔ ابھی دو ماہ کی عمر تھی کہ سایۂ پدری سے محروم ہوگئے۔ ان کی نشو ونما بڑے بھائیوں سید وہاب الدین مخمور سہسرامی اور سید قمرالدین کیف سہسرامی کے زیر سایہ ہوئی۔ وہ نوخیزی میں ہی درس و تدریس سے جڑ گئے تھے اور آخری سانس تک اسی مشغلہ کو اپنائے رہے۔ شعر و شاعری انھیں وراثت میں ملی تھی۔ مرحوم کا شمار ماہرین عروض میں تھا۔ ان کے شاگردوں کی خاصی تعداد بیرون ملک بھی ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 اپریل 2021

ڈاکٹر انتخاب عالم ساحل

ہاپوڑ: شاعری کی دنیا میں نام کمانے والے ڈاکٹر انتخاب عالم ساحل اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ وہ 15 اپریل کو اپنے احباب کو داغ مفارقت دے گئے۔ گزشتہ شب وہ مقامی اسپتال میں داخل کیے گئے لیکن جانبر نہیں ہوسکے۔ ڈاکٹر انتخاب عالم ساحل طب کے پیشے سے وابستہ تھے اور شاعری بھی کرتے تھے۔ ان کے کئی شاگرد بھی ہیں۔ وہ ایک اچھے انسان ہونے کے ساتھ ساتھ اہل علم اور علم دوست بھی تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 اپریل 2021

پروفیسر غفران احمد فلاحی

نئی دہلی: پروفیسر غفران احمد فلاحی، چیئرمین علم الادویہ، طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا 30 اپریل کو انتقال ہوگیا۔ مرحوم ڈاکٹر غفران احمد طبی دنیا کے حقیقی معنی میں ایک گوہر نایاب تھے، ان کی وفات پوری طبی دنیا کا عظیم خسارہ اور ناقابل تلافی نقصان ہے۔ مرحوم گوناگوں خوبیوں کے مالک تھے۔ پروفیسر غفران صاحب مرحوم ایک کامیاب، کہنہ مشق اور مشفق استاذ تھے، حقیقی معنی میں طب یونانی کے محقق اور تحقیق و ریسرچ کی دنیا میں طلبہ کے لیے سچے گائڈ اور رہنما تھے۔ انھیں اپنے مضمون پر کمال دسترس کے علاوہ اردو، عربی اور انگریزی زبان پر عبور حاصل تھا، وہ عظیم دینی درس گاہ جامعۃ الفلاح سے بھی فارغ التحصیل تھے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 1 مئی 2021

اشرف مولانگری

سیتامڑھی: سیتامڑھی ضلع کے بزرگ اور سینئر شاعر اشرف مولانگری بھی 2 مئی کو رحلت فرما گئے۔ نوجوان شاعر جمیل اختر شفیق سے ملی جانکاری کے مطابق چند روز قبل ہلکا بخار اور کھانسی کی انھیں شکایت ہوئی، علاج کا سلسلہ جاری تھا لیکن افاقہ نہیں ہوا طبیعت بگڑتی چلی گئی، آکسیجن لیبل بہت کم ہوگیا تھا جس کے باعث آناً فاناً انھیں مظفر پور کے پارس ہاسپٹل میں ایڈمٹ کرایا گیا، جہاں ماہر ڈاکٹروں کی سخت نگہداشت میں ان کا علاج چل رہا تھا، یعنی شاہدین کا کہنا ہے کہ وہ جب تک زیر علاج رہے کسی بھی طور ایسا نہیں لگا کہ اتنی جلدی وہ ہم سے جدا ہوجائیں گے لیکن لاکھ کوششوں کے باوجود رضائے الٰہی کے سامنے ساری کوششیں بے سود ثابت ہوئیں اور بالآخر وہ اس دارفانی سے رخصت ہوگئے، ایک سال قبل ہی وہ پوپری سے متصل رامپور بستی میں واقع مدرسہ بورڈ کے ایک ادارے سے طویل مدت تک صدر مدرس کے عہدے پر رہ کر سبکدوش ہوئے تھے، ان کی عمر کم وبیش 62 سال تھی۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 3 مئی 2021

ندیم انصاری

شاہجہانپور: معروف اردو افسانہ نگار ندیم انصاری کا مختصر علالت کے بعد 2 مئی کو انتقال ہوگیا۔ وہ 81 برس کے تھے۔ ان کے انتقال پر تمام علمی، ادبی دینی، ملی شخصیات نے اظہار تعزیت کیا ہے۔ شہر کے محلہ بابومئی میں رہنے والے ندیم انصاری (حقیقی نام نبی اللہ انصاری) کے فرزند محمد ارشد انصاری نے بتایا کہ ان کے والد کی دو روز قبل طبیعت خراب ہوئی تھی۔ ڈاکٹر کو دکھایا تھا۔ ان کا آکسیجن لیبل کافی کم ہوگیا تھا۔ گھر پر ہی ڈاکٹر نے علاج کیا مگر ہفتہ کی شام 7:15 بجے انھوں نے اس دارفانی کو الوداع کہہ دیا۔ ان کی اہلیہ کا پہلے ہی انتقال ہوچکا ہے۔ وہ اپنے پیچھے بہو بیٹوں کا پورا کنبہ چھوڑ گئے ہیں۔ 2 مئی اتوار کو دن میں گیارہ بجے محلہ بجلی پورہ واقع آبائی قبرستان میں سوگوار ماحول میں ان کو سپرد خاک کردیا گیا۔ اس دوران تمام عزیز واقارب، دوست واحباب موجود رہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 3 مئی 2021

ساگر دیوبندی

دیوبند: دیوبند کے مشہور قلمکار اور صحافی و بی ایس پی لیڈر ساگر دیوبندی کا 3 مئی کو انتقال ہوگیا ہے۔ ان کے انتقال کی خبر سے ادبی، سماجی، سیاسی و صحافتی حلقوں میں غم کی لہر دوڑ گئی ہے، مرحوم کے نوجوان صاحب زادے آصف ساگر بھی

اس وقت الیکٹرانک صحافت میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ تقریباً 66 سال کے ارشاد علی عرف ساگر دیوبندی کی اچانک طبیعت خراب ہوئی اور ان کا انتقال ہوگیا۔ ساگر دیوبندی نے دیوبند کے صحافتی میدان میں طویل وقت تک نمایاں خدمات انجام دی ہیں، انھوں نے 80 اور 90 کی دہائی میں دلی سے شائع ہونے والے نامور اردو اخبارات کے لیے نہ صرف رپورٹنگ کی بلکہ شاندار مضامین بھی تحریر کیے، اس کے علاوہ ہندی صحافت میں بھی ساگر دیوبندی نے خوب نام کمایا۔

روزنامہ 'سچ کی آواز' دہلی، 3 مئی 2021

اسداللہ خان

حیدرآباد: حیدرآباد سے تعلق رکھنے والے سینئر صحافی جناب محمد اسداللہ خان صاحب المعروف (اسد شمیم) کا 1 مئی کو انتقال ہوگیا، اسی روز بعد نماز فجر احاطہ قبرستان عیدگاہ مادنا پیٹ میں ان کے رشتہ داروں اور صحافیوں کی موجودگی میں بادیدہ نم سپرد لحد کردیا گیا۔ انھوں نے اسد شمیم کے نام سے کافی شہرت پائی تھی۔ وہ روزنامہ منصف، روزنامہ اعتماد سے برسوں وابستہ رہے۔ بہ حیثیت سب ایڈیٹر اور اسپورٹس ایڈیٹر انھوں نے اپنی منفرد پہچان بنائی تھی۔ وہ بنیادی طور پر ماہر خوشنویس اور خطاط تھے۔ اپنے سے سینئر صحافیوں کا وہ حددرجہ احترام کرتے تھے اور اپنے جونیئر صحافیوں کو اپنے فن میں مزید مہارت پیدا کرنے، جستجو اور عزم سے کام کرنے اور آگے بڑھنے کے لیے تادم زیست مشورے دیا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی صحافتی زندگی کی ابتدا روزنامہ منصف سے کی تھی جہاں وہ شعبہ کتابت میں صدر کاتب تھے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 2 مئی 2021

حسرت دیوبندی

دیوبند: شہر کے ممتاز شاعر ومشہور افسانہ نگار اردو ٹیچر ہارون انصاری (حسرت دیوبندی) کا 1 مئی کو اچانک

انتقال ہوگیا، وہ تقریباً 59 سال کے تھے۔ ہارون حسرت کا شمار دیوبند کے بہترین شعرا اور شاندار افسانہ نگاروں میں ہوتا تھا، وہ گذشتہ تقریباً پچیس تیس سال سے مختلف سرکاری اسکولوں میں تعلیمی خدمات انجام دے رہے تھے، اردو ٹیچر ہونے کی حیثیت سے انھوں نے اردو کی ترویج وفروغ میں بھی اہم رول ادا کیا۔ وہ گذشتہ تیس سال سے زائد عرصہ سے اردو ادب کی نمایاں خدمات انجام دے رہے تھے۔ وہ بہترین انسان ہونے کے ساتھ ساتھ شاندار فن کار بھی تھے۔ ان کے کئی مجموعہ کلام اور افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں مقامی تنظیموں کے علاوہ ملک کی متعدد ادبی وسماجی تنظیموں نے انھیں خصوصی اعزازات سے بھی نوازا ہے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 2 مئی 2021

سردار آصف

شاہجہانپور: شہر کے محلہ بجلی پورہ میں رہنے والے شاعر وریٹائرڈ پی سی ایس افسر سردار آصف خاں (67) کا مختصر علالت کے بعد 4 مئی بروز منگل کی شام کو انتقال ہوگیا۔ پسماندگان میں اہلیہ نگہت کے علاوہ ایک بیٹی کاکل اور تین فرزند تبریز خان، شہریار خان، مکی وغیرہ ہیں۔ 5 مئی بدھ کے روز صبح نو بجے ان کی نماز جنازہ ادا کرنے کے بعد محلہ قلعہ (منگھئی ٹولہ) واقع قبرستان میں ان کو سوگواروں کی موجودگی میں سپرد خاک کردیا گیا۔ سردار آصف کو شعر وشاعری سے گہرا شغف تھا۔ وہ پی سی ایس افسر تھے اور کئی اضلاع میں ضلع پنچایت راج افسر کے عہدے پر بھی رہے۔ وہ مرادآباد ڈویژن میں ڈپٹی ڈائرکٹر پنچایت راج کے عہدے سے سبکدوش ہوئے تھے۔ ان کے تین شعری مجموعے 'دریا دریا ریت' (دیوناگری)، 'ڈوبتے جزیرے' اور 'چاند کاکل اور میں' منظر عام پر آکر ارباب علم وفن سے داد وتحسین وصول کرچکے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا ایک اور شعری مجموعہ 'چٹکی بھر چاندنی' کے نام سے اشاعت کی منزلوں میں تھا۔ انھوں نے کئی آل انڈیا مشاعروں میں بھی شرکت کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 6 مئی 2021

عظمت علی عظمت

شاھجھانپور: طنز و مزاح کے ممتاز بزرگ شاعر عظمت علی عظمت شاہ آبادی کا حرکت قلب بند ہوجانے سے 8 مئی کو انتقال ہوگیا۔ پسماندگان میں چار بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ ان کی اہلیہ کا انتقال کئی برس پہلے ہو چکا ہے۔ عظمت شاہ آبادی طنز و مزاح میں اپنے منفرد لب و لہجے کے لیے مشہور تھے۔ انھوں نے کانپور، اناؤ، لکھیم پور، شاہجہانپور، فرخ آباد، بریلی میں ہونے والے آل انڈیا مشاعروں میں بھی شرکت کی تھی۔ ان کے مزاحیہ کلام کو سن کر سامعین خوب لطف اندوز ہوتے تھے۔ وہ شاہجہانپور کے ادبی پروگراموں میں مسلسل شرکت کیا کرتے تھے۔ ان کو کئی مرتبہ انعام واعزاز سے بھی نوازا گیا۔ عظمت شاہ آبادی کے انتقال پر معروف شاعر واصف فاروقی نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ عظمت شاہ آبادی بڑے باکمال مزاح نگار تھے۔ یہ ادبی دنیا کی بدقسمتی ہے کے وہ ان کے کمالات اور ہنر سے واقف نہ ہوسکی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 9 مئی 2021

افضل پیامی

سمستی پور: شاہ پور پٹوری کے شاہ پور انڈی باشندہ ومشہور شاعر افضل پیامی (76) عرف افضل امام خان کا 19 اپریل کی دیر شام چھتیس گڑھ میں حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے انتقال ہوگیا۔ مرحوم شاعر افضل پیامی سماجی کارکن وبی آر اے بہار یونیورسٹی شعبہ اردو کے سینئر پروفیسر ڈاکٹر اشرف امام کے بڑے بھائی تھے۔ انھوں نے یتیم بچوں کے لیے کئی کام کیے ہیں۔ کئی سالوں تک انھوں نے کولکاتا واقع سی ایم او یتیم خانہ میں سکریٹری کے فرائض انجام دیے۔ مرحوم ہندی، انگریزی، اردو، عربی، فارسی سمیت نصف درجن زبانوں پر مہارت رکھتے تھے۔ سائنس سمیت دیگر موضوعات پر بھی ان کو عبور حاصل تھا۔ مرحوم نے کانپور یونیورسٹی سے فزکس میں ایم ایس سی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ چھتیس گڑھ میں تعلیمی خدمات سے منسلک تھے۔ کولکاتا کی کئی کمپنیوں کے علاوہ سعودی عرب میں بھی انھوں نے اپنی قابلیت کا لوہا منوایا۔ ایک کہنہ مشق شاعر کی حیثیت سے انھوں نے ضلع سمیت ملکی سطح پر اپنی منفرد شناخت قائم کی۔ ان کی موت سے ادب نوازوں میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 اپریل 2021

امین عالم رابن

امروھہ: کاروان خلوص امروہہ کے صدر سید محبوب حسین زیدی نے شاعر اقبال امین عالم رابن کے سانحہ ارتحال پر اظہار افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا ہے کہ امین عالم رابن امروہوی امروہہ کے استاد شاعر معروف ادبی شخصیت تھے۔ انھوں نے اردو زبان کی جو خدمت کی ہے وہ قابل قدر اور لائق صد احترام ہے۔ مسلسل اردو زبان کے فروغ میں لگے رہتے تھے، اردو کتابوں کی پروف ریڈنگ میں ان کو غیر معمولی مہارت حاصل تھی۔ ان کی شخصیت اردو محافل کی رونق تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ نئی نسل اردو زبان سے وابستہ ہو اس کے لیے وہ ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔ محبوب حسین زیدی نے کہا کہ مسلسل اردو زبان کی نامور شخصیات ہمارے درمیان سے رخصت ہورہی ہیں اور آج ایک اور عظیم مجاہد رخصت ہوگیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 9 مئی 2021

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر ..... بتاریخ ..... بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرتعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : .....

پتہ : .....

.....

.....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: E-mail.:sales@ncpul.in,011-26108159

دستخط

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

اردو صحافت (آغاز سے 1857 تک کا ایک مختصر جائزہ)

مصنف: معصوم مرادآبادی

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 190

قیمت 110 روپے

اردو صحافت (1901 تا 1947 ایک مختصر جائزہ)

مصنف: اسدرضا

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 155

قیمت: 95 روپے

اردو صحافت (1948 تا 2000 ایک مختصر جائزہ)

مصنف: سہیل انجم

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 116

قیمت: 80 روپے

مقابلہ جاتی امتحانات کے لیے عام قانونی معلومات

مصنف: خواجہ عبدالمنتقم

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 375

قیمت: 180 روپے

رودر پریاگ کا آدم خور تیندوا

مصنف: جم کاربیٹ

مترجم: شرافت یار خاں

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 164، قیمت: 100 روپے

تاریخ و تہذیب و ثقافت

مصنف: ڈاکٹر نریش

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 210

قیمت: 120 روپے

دستور ہند کا معمار ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر

مصنف: خواجہ عبدالمنتقم

دوسری طباعت: 2020

صفحات: 155

قیمت: 80 روپے

آؤ سائنسی خط پڑھیں!

مصنف: عبدالودود انصاری

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 101

قیمت: 75 روپے

شعبہ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, जून-२०२१,वर्ष:२३, अंक:०६
URDU DUNIYA Monthly, June-2021, Vol.23, Issue:06
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2020-22
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/05/2021
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش
اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!
ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:
شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPCDELHI,DELHIPSO,DELHIRMS,DELHI-6